224600

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224600

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—730—28-4-81—10,000.

R OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ج۳۰۵ Accession No. ۵۵۲۰۱

Author مجلہ غیاثیہ

Title مجلہ غیاثیہ مجلد سوم شمارہ ۲، ۳، ۴ ۱۳۲۹ھ G. 5208 U.

This book should be returned on or before the date last marked below

مجلۂ عثمانیہ

جلد سوم- شمارہ سوم و چہارم - بہمن و اردی بہشت سنہ ۱۳۳۹ف

مجلس نگرانی

محمد عبدالرحمن خان صدر کُلیہ جامعہ عثمانیہ

اے آر' سی' ایس- بی ایس' سی' (لندن) فیلوآف دی رائل اسٹورنامکل سوسائٹی لندن

مولوی عبدالحق بی' اے- (علیگ) پروفیسر اُردو کُلیہ جامعہ عثمانیہ

ای- ای- اسپیئر' بی' اے- (لندن) پروفیسرانگریزی کلیہ جامعہ عثمانیہ

وحیدالرحمن (بی ایس سی)

پروفیسر طبیعیات کُلیہ جامعہ عثمانیہ

مدیرین شعبۂ اردو

محمد جلال الدین ' اشک ' شیخ چاند

مدیر شعبۂ انگریزی

محمد عبدالقیوم خان 'باقی'

ملنے کا پتہ:— منتظم اعزازی مجلہ عثمانیہ' کُلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۔ دکن

اطلاع

۱- طلباء کُلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شایع ہوا کرے گا :—

امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (دسمبر) اردی بہشت (مارچ)

سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہو گا -

۲- رسالہ انگریزی اور اُردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا - حصۂ اُردو کے لئے تقریباً آٹھ جز اور حصۂ انگریزی کے لئے تقریباً چار جز مختص کئے جائیں گے - رسالے کا سالانہ حجم کم از کم آٹھ سو صفحات ہوگا -

۳- مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق رد و بدل کی مجاز ہوگی- مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی —

۴- تمام مضامین نظم و نثر مدیورین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں -

۵- خریداری اور دیگر اُمور کے لئے اعزازی منتظم رسالہ سے دفتر کے پتہ پر خط و کتابت کی جاے -

۶- چندے کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں -

چندہ

(۱) سرکار آصفیہ وبرطانیہ سے سالانہ ۱۲ روپے پیشگی- (۵) طلباء کلیہ جامعہ عثمانیہ سے ۴ روپے سالانہ پیشگی

(۲) ارباب جامعہ اصحاب اقتدار اور اداروں سے ۸ ,, (۶) ممالک بیرون ہند سے ۱۵ شلنگ ,, ,,

(۳) عام خریداروں سے ۶ ,, (۷) بلاد یورپ کے طلبۂ قدیم سے ۱۰ ,, ,,

(۴) طلبۂ قدیم فاضیہ انجمنوں اور مطالعہ خانوں سے ۵ ,, (۸) فی رسالہ دو روپے ,, ,,

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے- بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی:-

[۱] بذریعہ رجسٹری دبۂ روپیہ کلدار - ۱۲ آنے سکۂ عثمانیہ [۲] بذریعہ سرٹیفیکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات ۱ روپیہ کلدار ۹ آنے سکۂ عثمانیہ [۳] بذریعہ بک پوسٹ اور پہلے نمبر کے وی پی کے اخراجات ۹ آنے کلدار ، ۶ آنے سکۂ عثمانیہ-

مجلۂ عثمانیہ

فہرست مضامین

حصۂ اُردو جلد سوم — شمارہ سوم و چہارم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	گزارش واقعی	شیخ چاند مدیر	۱
۱	کتبات اور ان کی اہمیت	جناب مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم' اے- ناظم آثارقدیمہ ملک سرکارعالی	۱
۲	غزل	حضرت منشی میر امداد علی شاہ صاحب "علوی" مرحوم	۹
۳	مقابلہ بر اسلوب تحقیق	جناب میر حسن الدین صاحب بی- اے ایل ایل- بی (عثمانیہ)	۱۱
۴	اپنے رقیب سے	جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم- اے (عثمانیہ)	
۵	شاہ نامے کا جنم بھوم	جناب سید محی الدین صاحب متعلم ایم- اے کلیہ جامعۂ عثمانیہ	۲۲
۶	غزل	علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طبا طبائی	۲۳

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۷	تہذیب و تمدن	جناب معتضد ولی الرحمن صاحب ایم۔ اے مددگار پروفیسر فلسفہ کلیہ جامعۂ عثمانیہ	۴۴
۸	چاندنی رات	جناب غلام دستگیر صاحب رشید متعلم کلیہ جامعۂ عثمانیہ	۶۱
۹	تصوف	جناب ذوالفقار علی خاں صاحب بی اے عثمانیہ	۶۲
۱۰	تاج محل	سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی۔ اے (عثمانیہ) سابق مدیر مجلہ	۸۶
۱۱	تنقید	محمد جلال الدین ' اشک ' مدیر مجلہ	۸۷
۱۲	موسیو ریمو	جناب ابوالکلام بدرالدین صاحب " بدر " متعلم ایم - بی (عثمانیہ)	۹۹
۱۳	فرامین اشوک	جناب سید علی صاحب	۱۰۱
۱۴	خطبۂ صدارت تعلیمی کانفرنس حیدرآباد	عالیجناب محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ	۱۵۸
۱۵	سلاطانہ رضیہ میدان جنگ میں	محمد جلال الدین 'اشک' مدیر	۱۸۷
۱۶	ملوکیت کا ارتقا	جناب سید محمد مرتضیٰ صاحب متعلم ایل ایل - بی	۱۸۹
۱۷	کمال زندگی	جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے - مدیر مجلہ	۲۰۶
۱۸	The Crown of life	عالیجناب سر نظامت جنگ بہادر	۲۰۷
۱۹	سرمستی	... ...	۲۰۸

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲۰	Ecstasy	عالیجناب سر نظامت جنگ بہادر	۲۰۹
۲۱	نظریۂ صداقت عمل سے کیا مراد ہے	مترجمۂ ڈاکٹر میوولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لندن بار ایٹ لا	۲۱۰
۲۲	دل کی دنیا	جناب میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) وکیل ہائی کورٹ	۲۲۹
۲۳	نور کا شاعر	جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی	۲۴۰
۲۴	انفرادیت کی ترقی مدعائے تعلیم قرار دی جائے	جناب محمد مرغوب الدین صاحب بی اے بی ٹی مددکار لکچرار ٹریننگ کالج حیدرآباد	۲۸۵
۲۵	نیل کی ناگن	جناب سید وزیر حسن صاحب	۲۹۹
۲۶	سید عبدالولی "عزلت"	شیخ چاند مدیر مجلہ	۳۱۰
۲۷	تبصرے	شیخ چاند مدیر مجلہ	۳۲۹
۲۸	کلیہ کی خبریں	محمد جلال الدین اشک مدیر	۳۴۴
۲۹	جشن یوم کلیہ جامعہ عثمانیہ	... ...	۳۶۲
۳۰	مجلس علمیہ	... ...	۳۶۴

گزارش واقعی

اس شمارے پر مجلے کی تیسری جلد ختم ہوتی ہے تین سال کے عرصہ میں مجلے نے ادبی دنیا میں جو جگہ حاصل کی ہے اور طلبہ کایہ کی ذہنی اور دماغی سرگرمیوں کی جس طرح ترجمانی کی ہے اس کا فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑ دیا جاتا ہے ، تاہم اس قدر عرض کر دینا ضرور ہے کہ ارباب علم و فضل اور اصحاب الرائے نے مجلے کی علمی و ادبی خدمات کا اعترات بہت ہی حوصلہ افزا طریقے سے کیا ہے - ملک اور بیرون ملک کے سربرآوردہ رسایل و جراید نے مجلے کے معیار کی دل کھول کر داد دی ہے - ان گراں قدر آرا کو درج کرنا طوالت کا باعث اور خود ستائی ہے —

تیسری جلد کے اختتام پر ایک واقعی گزارش ناظور ہے - اس سال ارکان مجلہ کو انظامی حیثیت سے گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - اس سے قبل ہم طباعت کی دقتوں کا دکھڑا روچکے ہیں - بھزار کوشش انجمن ترقی اردو کے مطبع میں طباعت کا انتظام ہوا - اس میں شبہہ نہیں یہاں بھی ابتداً بڑے جھمیلے پڑ گئے جیسا کہ ہر ابتدائی کام میں ہوتا ہے لیکن اب سب دشواریاں رفع ہوگئیں - انجمن نے اردو کا نیا ٹائپ منگا لیا ہے اور انگریزی کا بہت ہی خوش‌نما ٹائپ خریدا ہے - اس طرح اب اس مطبع میں دونوں حصوں کی طباعت کا بہترین انتظام ہوگیا ہے ، اور آئندہ کسی قسم کی دشواری کے پیش

آنے کا اندیشہ باقی نہ رہا —

موجودہ شمارے کی طباعت میں بڑی تعویق ہوگئی ' اس کی وجہ انجمن کے مطبع میں نصابی کتب کے کارخانے طباعت کا ہجوم نئے ٹائپ اور انگریزی ٹائپ کی عدم موجودگی ہے - اب یہ روڑے دور ہوگئے ہیں اور آئندہ ارکان مجلہ کو رسالے کے وقت پر شائع کرنے میں آسانی ہوگی —

سال بھر انتظامی دقتوں سے دوچار ہونے کے باوجود ارکان مجلہ نے رسالے کے معیار کو ترقی دینے میں کافی کوشش کی ہے گذشتہ دو جلدوں سے زیادہ مواد اس جلد میں پیش کیا گیا ہے - یوں تو ہزارہا صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے پیش نظر جو چیز رہی ہے وہ یہ ہے کہ رسالے طلبہ کی جنبشن قلم سے مزین ہو - اس میں بڑی حدتک کامیابی ہوئی طلبہ کے معیاری مضامین بڑی تعداد میں شائع ہوے ہیں اہل ذوق نے ان کی دل کھول کر داد دی ہے ہماری گردن فخر و مباہات سے فراز ہونے کی بجائے ہمارا سرانتظامی مشکلوں کی تاخیر و تعویق کے سبب احساس شرم سے جھکا جاتا ہے - امید ہے کہ ناظرین ہماری ذیاہ کن دقتوں کو پیش نظر رکھ کر اس تعویق کو معاف فرمائیں گے —

آغاز سال ہی سے خیال تھا کہ اس جلد میں تصویریں شایع کی جائیں - مولوی سید غلام یزدانی صاحب نے قدیم فن کے معیاری نمونے دینے کا وعدہ فرمایا تھا ' لیکن موصوف کے ولایت تشریف لیجانے سے وہ نمونے نہ مل سکے - صرف ایک کتبے کا عکس دستیاب ہوسکا جو ان کے مضمون سے متعلق ہے - اس کے علاوہ چند تصویریں ہیں جو نذر ناظرین کی جاتی ہیں —

غارہائے اجنتا میں قدیم ہندوستانی مصوری کے جو لاثانی نمونے ہیں اس کا اندازہ ایک حد تک ناظرین کو اس تصویر سے ہوگا جو صفحات (۱۰۰ - ۱۰۱)

کے درمیاں ہے اس دور کے حسن کاروں کے رجحان طبع اور خیالات کے معلوم کرنے کا بہترین طریقہ ان کے فنی کارنامے ہیں - سب سے زیادہ نمایاں جو چیز ہم کو نظر آتی ہے وہ ان کے حسن کاروں کا تخیل ہے یوں تو مغار اجنتا میں عقیدت کیش مصوروں نے بدھ متی تعلیم ، عقائد ، اور دیو مالا کو اپنے موٴ قلم کی جنبش سے واضح کیا ہے لیکن ان میں بعض ایسی پتے کی اور نازک باتیں ملتی ہیں جن سے عام طور پر بڑی بڑی کتابیں بھی خالی نظر آتی ہیں - اس نمونے میں صنف نازک کی متعدد تصویریں ہیں سب میں حسن و رعنائی کی جھلکیاں نمایاں ہیں - اجنتا کے حسن کاروں کا ہمیشہ یہ شیوہ تخیل رہا ہے کہ صنف نازک سے شان حسن کبھی جدا نہ ہونے پائے چاہے وہ فلاکت زدہ اور غم کے جنجال ہی میں کیوں نہ ہو چاہے اس کی گردن سے جلاد کی تیغ بیدریغ قریب ہی کیوں نہ ہو رہی ہو اور چاہے وہ بسترے مرگ پر آخری سانس ہی کیوں نہ لے رہی ہو - ان کا خیال تھا کہ چشم انسان کے لئے حسین عورت کی موت سب سے زیادہ خوف ناک دلدوز اور نا قابل برداشت منظر ہے - یہی وجہ ہے کہ موت جیسے مفارق اور الم ناک سانحہ پر بھی صنف نازک سے شان حسن دور نہیں ہو سکتی - ان حسن کاروں کے قلم کی جنبش کا محور حسین عورت تھی ان کے لئے وہ ایک سدا بہار گلشن تھا جس کو صرصر خزاں مرجھا نہیں سکتی - موجودہ نمونے سے یہ اندازہ تخیل ایک حد تک نمایاں ہے —

دوسری تصویر (درمیاں صفحات ۱۸۶ - ۱۸۷) چاندبی‌بی کی ہے - یہ حسین نظام شاہ والی احمد نگر (۹۶۱ تا ۹۷۲ ھ) کی بیٹی اور مرتضی نظام شاہ (۹۷۲ تا ۹۹۶) کی بہن تھی - علی عادل شاہ والی بیجا پور (متوفی ۱۰۸۳) سے بیاہی گئی تھی - اس سے کسی بات پر ناراض ہو کر احمد نگر چلی آئی - یہاں اس کے بھائی کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی جو اکبر اعظم

کی افواج کے پیہم یورشوں سے سخت نرغہ میں تھا - بداندیش امرا کی غفلت اور سازشوں نے سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کردی تھیں' بھائی کے بعد خود سریر آرا ہوئی اور اکبر اعظم کی افواج قاہرہ کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہو گئی اور مغلوں کو اپنا لوہا منوا کے دکن سے مایوس کردیا اس کی جانبازی' دلیری ہمت اور تدبر کی داستانیں تاریخ میں قید ہیں سلطنت کے غدار اور نمک حرام امرا کے ہاتھوں سنہ ۱۰۰۸ ھ میں شہید ہوئی - راقم الحروف نے احمد نگر میں ایک قلمی مرہٹی دستاویز دیکھی جس میں اس کی شہادت کے متعلق عجیب و غریب روایت درج ہے - لکھا ہے کہ عین اس وقت جب کہ نمک حرام امرانے مغلوں کو اپنی فتح کا جھنڈا بلند کرنے کا موقع دیا یہ جواں ہمت تیزاب کے حوض میں کود پڑی - اس کا طایر روح پرواز کر گیا اور جسد خاکی گھل کر پانی ہو گیا —

اس یگانہ روزگار خاتوں کی تین مختلف تصویریں ہماری نظر سے گزری ہیں - ایک قلمی تصویر ہے جو بیجاپور کے میوزیم میں آویختہ ہے - فن کے اعتبار سے یہ بڑی گراں قدر ہے - اس کی نشست سے شاہانہ رعب و داب عیاں ہے - ایک ہاتھہ میں جام شراب ہے جو لبوں تک پہنچ رہا ہے اور ایک میں صراحی ہے - یہ جوانی کی تصویر ہے - دوسری چھپ چکی ہے اور عالم پیری کی ہے موجودہ تصویر دراصل شکار کی ہے - بہری کا شکار اس زمانہ میں بادشاہوں کا بڑا محبوب مشغلہ تھا - بائیں ہاتھہ میں اسپ صبا رفتار کی باگ تھامے ہوے ہے اور دائیں کے انگوٹھے پر بہری ہے —

تصویر (درمیاں صفحات ۲۹۸ - ۲۹۹) ایک قلمی تصویر کا عکس ہے - یہ دراصل مغل خواتین کی محفل ہے - افسوس ہے کہ بلاک جو کلکتہ میں تیار

ھوا بگڑ گیا اور تصویر کے اصل خط و خال مٹ گئے۔ اس میں ایک قطعہ (صفحات ۳۲۸-۳۲۹) مکتوبہ میر علی ھے جو قطب شاھی دور کا مشہور خوش نویس ھے۔ اس کے حسن و قبح کی جانچ ناظرین کے ذوق سلیم پر چھوڑ دی جاتی ھے —

شیخ چاند

مدیر

کتبات اور ان کی اہمیت

از

(جناب مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم ' اے ناظم آثار قدیمہ
ملک سرکار عالی)

بادی النظر میں کتبات کی تحقیق کا میدان نہایت محدود معلوم ہوتا ہے اور ہندوستان میں اب تک جو کوشش ہوئی ہے اس میں کتبات سے صرف تاریخی سنین کے تعین یا تصحیح میں مدد لی گئی ہے - مگر غور سے دیکھا جائے تو کتبات کے اندر بقائے دوام اور طالب شہرت کا راز مضمر ہے - اور حضرت انسان کی اس آرزو نے کتبوں کو ابتدائی کاوش لکیروں اور مبہم نقوش سے کیا کا کیا کر دیا وہ آپ اسلامی زمانے کے کتبات سے اندازہ کرسکتے ہیں - تاریخ کا بہترین مقصد قوموں کی تہذیب اور کمال کا جانچنا ہے' اس لئے دیکھنا ہے کہ کتبات کس حد تک اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں - اکثر ناظرین چونکہ بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے آثار سے واقف ہیں - اس لئے میں زیادہ تر ایسے کتبات سے بحث کروں گا جو بلدہ یا اس کے مضافات میں واقع ہیں —

اسلامی سلاطین کو خطاطی کا ہمیشہ شوق رہا ہے - بادشاہ خود اس لطیف فن کو سیکھتے تھے - اور اہل کمال کا داد و دہش اور قدر دانی سے دل بڑھاتے تھے - کتبات اس فن کے اظہار کے لئے اچھا ذریعہ تھے - چنانچہ محلوں اور باغوں' مسجدوں

اور قبروں پر جو کتبے موجود ہیں' اُن سے خطاطی کے عروج و کمال کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ بات ضرور ہے کہ قدیم اساتذہ کی مشقیں اور قلمی کتابیں بکثرت موجود ہیں ۔ لیکن جو اصحاب اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن میں سے بیشتر فوے فی صدی جعلی ہیں ۔ یاقوت کے ہاتھ کے اتنے قرآن شریف موجود ہیں کہ اگر وہ ہر روز بھی ایک قرآن لکھتا تو شاید اتنے نہ ہوتے ۔ یہی حال عماد اور رشید کی وصلیوں کا ہے ۔ جن کی آج تک نقل کی جاتی ہے ۔ اور ہر صاحب فن یہ کوشش کرتا ہے کہ ایسی نقل کی جائے کہ اصل اور نقل میں مطلق فرق نہ رہے ۔ کتبات میں اس جعل کا مطلق شائبہ نہیں ۔ اور ہر استاد کے حسن خط کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے علاوہ ازیں وصلیوں اور کتابوں کے محدود طول و عرض کے لحاظ سے صاحب فن کو زور قلم دکھانے کا وہ موقع نہیں ملتا' جو کتبوں میں میسر آتا ہے ۔ میں مثال کے طور پر آپ کے سامنے بیدر کا ایک کتبہ پیش کرتا ہوں ' جو حضرت خلیل اللہ کی چوکھنڈی میں سیاہ پتھر پر ثبت ہے ۔ کتبے کا طول چالیس فٹ سے زیادہ ہے ۔ قلم کا قط ایک انچ کے قریب ہے اور حروف کی کرسی اور دور دوفیٹ ہے ۔ اب خیال فرمائیے کہ اس استاد کی انگلیوں میں کیا طاقت ہوگی جس نے ایسے زبردست نیزے کو گردش دی ہوگی ۔ دوائر کا حسن اور کشش کی صفائی عقل کو حیران کرتی ہے ۔ یہ زور کتابت اور وصلی کے محدود طول و عرض میں کہاں دکھایا جاسکتا ہے ۔ خوشنویس کا نام مغیث کتبے کے آخر میں درج ہے ۔ شیراز کا رہنے والا تھا ۔ دکن میں ایرانی صاحبان کمال کا ہمیشہ زور رہا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ بہمنی حکومت دہلی کی سلطنت کی مرضی کے برخلاف قائم ہوتی تھی ۔ اس لئے شاہان دکن اپنی تقویت کے لئے ہمیشہ ایران سے فیض حاصل کرتے رہے ۔ خوشنویسی کی تاریخ چونکہ پورے طور سے منضبط نہیں ہوئی ہے اور تذکروں میں جو گنتی کے نام درج ہیں ان میں بھی اکثر کے خط کے نمونے نا پید ہیں ۔ اس لئے کتبوں کی تحقیق اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ

خو شنویس کے نام کے ساتھہ اس کے خط کا نمونہ بھی مل جاتا ہے —

خط کی لطافت کے لحاظ سے میں آپ کو ایک نادعلی دکھاؤنگا جو میر موسی صاحب کے دائرے میں خدیجہ بی کی قبر پر کندہ ہے - چربہ لینے میں حروف کی نوک پلک اور حسن کو دولت آبادی کاغذ اور کوئلے کی سیاہی بہت کچھہ تباہ کردیتی ہے - لیکن پھر بھی آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ خط کتنا پاکیزہ ہے اور ثلث تحریر کا ایسا نمونہ مشکل سے ملتا ہے —

اقسام خط کے لحاظ سے بھی ممالک محروسہ کے کتبات کا میدان نہایت وسیع ہے - چنانچہ کوفی سے لگا کر نستعلیق تک ہر روش کے بہترین نمونے یہاں موجود ہیں - میں آپ کو پہلے مرزا محمد امین * کے مزار کا ایک کتبہ دکھاتا ہوں - اس میں سورۂ اخلاص خط کوفی میں لکھی ہوئی ہے - اور دوسری آیت طغرا میں - سورۂ اخلاص کی ترتیب میں بھول بھلیوں کا التزام رکھا گیا ہے - اور ایک لحاظ سے یہ بھی طغرا کہلائی جاسکتی ہے - دوسری آیت میں جو سورۂ آل عمران سے ماخوذ ہے فوج کے نیزوں کی تصویر کھینچی گئی ہے - دونوں تحریریں اپنی اپنی شان کے لحاظ سے نہایت نفیس ہیں —

نستعلیق خط کے میں دو نمونے آپ کو دکھاؤنگا - ایک جامع مسجد حیدر آباد کے دروازے پر کندہ ہے - اور بابا خاں نامی خوش نویس کا لکھا ہوا ہے - بابا خاں محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں گزرا ہے - چربے میں اصل کتبے کی ملاحت نہیں پھر بھی آپ کشش اور دوائر میں استادانہ رنگ پائینگے - نستعلیق روش میں قطب شاہی زمانے کا یہ بہترین کتبہ ہے - دوسرا نمونہ اورنگ زیب کے زمانے کا ہے اور

---

* مرزا محمد امین ابراھیم قطب شاہ کا سب میں بڑا بیٹا تھا - جوان فوت ہوا - گولکنڈے میں باپ کے مقبرے کے قریب اس کا بھی گنبد ہے —

بیدر میں فرح باغ کی مسجد پر کندہ ہے - خط کی پختگی اور زور اس میں بہت بڑھا ہوا ہے —

اس کتبے کے صرف ایک شعر سے —

بناء کرد مسجد بجائے کنشت بر اہو ابش انا فتحنا نوشت

اورنگ زیب کے مذہبی عقیدے کا وہ حقیقی حال ذہن میں آجاتا ہے جو تاریخ کے ہزاروں صفحے الٹنے سے بھی حاصل نہیں ہوتا - میں نے اب تک شان خط کے لحاظ سے کتبات کی اہمیت پر بحث کی تھی - لیکن ان کے متن میں آپ ایسی بیسیوں باتیں پائینگے جو تاریخ کے صفحات میں درج نہیں - آپ کے سامنے موسیٰ برج کا کتبہ پیش کرتا ہوں ' اس میں گولکنڈے کے سنہ ۱۰۶۶ کے محاصرے کا ذکر ہے - خافی خاں نے اس واقعے کو بیان کیا ہے - لیکن صلح کی وجہ یہ بتائی ہے کہ قطب شاہی فوج محاصرے سے تنگ آگئی تھی ' کتبے میں یہ درج ہے کہ میر میراں کے گولا لگا - یہ شاہ زادہ محمد کی فوج کا بخشی تھا اور گولے کے صدمے سے مرگیا - اس واقع کے تین روز بعد صلح ہوگئی - کتبے سے صلح کی حقیقت بالکل بدل جاتی ہے - مورخ کے لئے کتبات کی تحقیق میں اس قسم کا بہت سا مسالا موجود ہے - چند سال ہوئے پروفیسر جادو فاتحہ سر کار کو یہ شبہ ہوگیا تھا کہ ما اثر عالمگیری میں چونکہ عبداللہ قطب شاہ کی وفات کا ذکر سنہ ۱۰۸۶ ھ سے قبل نہیں ہوا ' اس لئے اس کی وفات اسی سن میں ہوی - اتفاق سے عبد اللہ قطب شاہ کی قبر پر اس کا سنہ جلوس اور تاریخ وفات دونوں درج ہیں —

جب ان کی اس کتبے سے تشفی کی گئی تو شبہ رفع ہوا - اس شبہ کے متعلق ساری مراسلت انجمن آثار قدیمہ حیدر آباد کے رسالہ بابتہ سنہ ۱۹۱۷ ء میں درج ہے —

قلعہ گولکنڈہ کی جامع مسجد میں یہ ایک کتبہ موجود ہے ' جس سے قطب شاہی

بادشاهوں کے اعلان خود مختاری کی تاریخ بالکل بدل جاتی ہے - فرشتہ نے اعلان کی تاریخ سنہ ۹۱۸ ھ لکھی تھی اور اس کو بعد کے سب مورخین نے نقل کردیا - کتبے میں جو سنہ ۹۲۴ ھ یعنی تاریخ کتب کے سن اعلان کے چھ برس بعد کا ہے - بادشاہ کا نام محمود شاہ بہمنی مع القاب کے درج ہے اور سلطان قلی کا اصلی نام اور قطب الملک کا خطاب جو بہمنی بادشاہوں نے اس کو عطا کیا تھا کندہ ہے - کتبے کی عبارت یہ ہے :

(۱) بناء هذا المسجد الجامع فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی الله الغنی ابی الغازی محمود شاه بن محمد شاه البهمنی

(۲) خلدالله ملکه وسلطانه و بانیه المبتهل الی الله مالک الملک سلطان قلی الملقب بقطب الملک فی سنة اربع و عشرین و تسعمائة

اسی طرح مؤرخین نے دکن کے بعض بادشاہوں کے نام ترک کردیے ہیں - مگر سرووازلے ہیگ نے جو اس وقت انگلستان میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے سب میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں - احمد نگر کے بادشاہوں کی جو فہرست دی ہے - اس میں برہان نظام شاہ ثالث کا نام کہیں نہیں ہے - حالانکہ قلعۂ انتور کے کتبوں میں اس بادشاہ کا نام موجود ہے - اس بادشاہ کا عہد سلطنت سنہ ۱۶۱۰ تا ۱۶۳۰ ع رہا ہے *

تاریخی مسالے کے ضمن میں میاں مشک کی مسجد کا کتبہ بھی آپ کو دکھاؤنگا - اس کی شان خط بھی نرالی ہے اور رقاع سے ملتی جلتی ہے ' رقاع کو نسخ سے وہی تعلق ہے جو شکستہ کو نستعلیق سے - مصر میں جو خط رائج ہے وہ رقاع ہی کی ایک شان ہے اس کتبے میں سلطان ابوالحسن کے ایک فرمان کی نقل درج ہے - جس میں مسجد اور متعلقہ حمام اور آبدار خانے کے انتظام کے متعلق مفصل ہدایات درج ہیں - فرمان سے معلوم ہوتا ہے

---

* ملاحظہ ہو رسالۂ ایپی گرافیہ انڈیکا بابت سنہ ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ ع

ھے - کہ اوقات کا انتظام کس قدر وسیع پیمانے پر کیا جاتا تھا - تاریخ کے شائقین کے لئے کتبات کا خزانہ مالا مال ھے - تلاش کرنے والے کو وہ کامل العیار سکے ملینگے جو موجودہ تاریخ کے سکے کی قلب ماھیت کو بدل دینگے —

شعرا اور لطیف خیال اصحاب کے لئے بھی کتبات کی تحقیق کچھہ کم دلکش نہیں - تاریخ گوئی کے فن میں جیسے عمدہ نمونے کتبات میں موجوہ ھیں بیاضوں اور کتابوں میں ملنے مشکل ھیں - گولکنڈے میں پیم متی کے مقبرے پر جو تاریخ درج ھے ' وہ اس فن کی اچھی مثال ھے —

بود از ازل گل جنتی پیم متی

ابجد کے حساب سے سنہ ھجری پورا ۱۰۷۳ نکلتا ھے ' جو عبداللہ قطب شاہ کی اس محبوبہ کا سن وصال ھے - بعض تاریخوں میں تعمیہ اور تخرجہ بھی اس خوبصورتی سے کیا ھے کہ دیکھہ کر دل خوش ھو جاتا ھے نورجہاں اور جہاں آرا کی قبروں پر جو اشعار کندہ ھیں ' انھوں نے دنیا کی بے ثباتی پر آپ کو ضرور متأثر کیا ھوگا * گولکنڈے میں مرزا محمد امین کی قبر پر ایک عربی نظم ھے ' وہ بھی کچھہ کم دل کو ھلانے والی نہیں - اشعار ملاحظہ ھوں —

(۱) یا قاھرا بالمنایا کل جبار —— بنور وجھک اعتقنی من النار

(۲) الیک اسلمنی من کان یعضدنی —— من اھل ودی و اصحابی و انصار

(۳) فی قعر مظلمۃ فقراء موحشۃ —— فرداً غریباً وحیداً تحت احجار

---

* نور جہاں کی قبر پر بیان کیا جاتا ھے یہ شعر لکھا ھوا تھا —

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

جہاں آرا کی قبر پر یہ شعر کندہ ھے —

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ھمی گیاہ بس است

(۴)امسیت ضیفک یاذالجود سرتہنا ـــــ و انت اکرم منزول بہ قار

(۵)فاجعل قرای بفضل منک مغفر ـــــ انجو الیک بہا یا خیر غفار

(۶)ان الملوک اذا شاءت عبیدھم ـــــ فی رقہم عتقوھم عتق ابرار

(۷)و انت یا سیدی او لیھم کرما ـــــ قدشبت فی الرق فاعتقنی من النار

دوسرے اور تیسرے شعر کا ترجمہ ہے ـــ

میرے چاہنے والے اور دوست اور مددگار تیرے رحم و کرم پر مجھ کو ایسے تاریک گڑھے میں ڈال گئے جس میں نہ کوئی سوئس ہے نہ وحشت کا رفع کرنے والا ۔ پس میں پتھروں کے نیچے تن تنہا اور بیکس پڑا ہوں ـــ

نثر کے کتبوں سے بھی انسانی جذبوں کا خوب پتہ چلتا ہے ۔مثلاً خطابوں کی تراش اور رنگ سے بادشاہوں اور امراء کی عظمت اور وقار اور بعض اوقات تعلی بھی کھل جاتی ہے ۔ مثلاً محمد قلی قطب شاہ کے لئے جنت آشیانی کا لقب استعمال کرنا جو اس کے ہم عصر اکبر کے لئے استعمال ہوا تھا ۔ کم مائگی سے خالی نہیں * ـــ

مبصر کو متن کے علاوہ شان خط سے بھی زمانے کے رنگ کا پتہ چل جاتا ہے ۔ مثلاً محمد تغلق کے کتبے میں جو سادگی اور قوت نمایاں ہے وہ اس عہد کی تہذیب اور شائستگی کے حسب حال ہے ۔ اسی طرح اورنگ زیب کا بیدر کا کتبہ جو میں آپ کو دکھا چکا ہوں اس کی شان خط سے آپ اس زمانے کے تمدن کو تصور کرسکتے ہیں کہ ہرچیز معراج کمال پر پہنچ گئی ہے ـــ

اسلامی کتبوں کی عمارات کی تزئین میں بھی ایک خاص حیثیت ہے ۔ شمالی

---

* اکبر کا انتقال سنہ ۱۶۰۵ ع میں ہوا تھا اور محمد قلی قطب شاہ کا سنہ ۱۶۱۲ میں کتبے کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ایپی گرافیہ انڈیکا ، جلد ۱۲ ـ ۱۹۱۵ م

هلکه کی تو بعض عمارات کی یه حالت هے که اگر ان میں سے کتبے نکال دیے جائیں تو ان کی وهی حالت هوگی جو یورپ کے قوطی وضع (Gothic style)کی کلیساؤں کی هو - اگر ان میں سے مذهبی تماثیل (Religious Sculptnres) علحده کرلی جائیں - یه سچ هے که دکن کی عمارات کی تزئین میں کتبوں کو وه رتبه حاصل نهیں هے جو شمالی هند کی عمارات کو هے - لیکن پهر بهی یهاں بعض مقامات پر کتبات نے عمارت کی شان میں ایک نئی جان ڈال دی هے - مثلاً بیدر کے رنگین محل سے اگر سیپ کے کام کا کتبه نکال دیا جاے تو وه عجب بے رونق هوجائیگا - اسی طرح بهت سی محرابیں اور پیش طاق جو آیات قرآنی سے مزین هیں کتبوں کے بغیر ننگے ننگے نظر آئینگے —

حضرات! میں کتبوں کی اهمیت اور دلبستگی پر مختلف پهلوں سے بحث کرچکا - کام جو اس فن میں اب تک هوا هے وه بهت کم اور محدود نظر سے هوا هے - ریاست حیدرآباد اور اس کے روشن خیال بادشاه همیشه علم و فضل کے حامی رهے هیں - موجوده سلطان نواب میر عثمان علی خاں بهادر خلدالله ملکه نے عثمانیه یونیورسٹی کے قیام سے علم کی گنگا بهادی هے - اس فیض عام سے فائده اٹهائیے - طالب کو وسعت دیجئے - محنت اور تلاش سے همت نه هاریئے - حق پسندی آپ کا اصول رهے اور هر چیز کو بلند نظر سے دیکهئے اور چهوٹی چهوٹی باتوں پر نازاں نه هو جیے - دنیا خود آپ کے کام کی قدر کرے گی اور آپ کی شهرت فنهرشم (Von Berchen) کی شهرت کو ماند کر دیگی —

غزل

از

حضرت منشی میر امداد علی شاہ صاحب " مظہری " مرحوم

منشی صاحب رح کی غزل شائع کرتے ہوے ہم نے گذشتہ شمارے میں ایک نوٹ لکھا تھا ' جس میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ آپ کا کلام اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے - اس سلسلے ' میں مزید تحقیقات سے ہمیں معلوم ہوا کہ منشی صاحب رح کا سارا کلام مرتب شدہ ان کے ورثاء کے پاس موجود ہے لیکن خود منشی صاحب رح کی وصیت کی بنا پر ابھی شائع نہیں کیا گیا —

ذرۂ بود کہ صحرا شدہ است — قطرۂ بود کہ دریا شدہ است

ہر غباری کہ بہ بالا شدہ است — یار را نقش کف پا شدہ است

دلم از عشق چہ رسوا شدہ است — کعبہ کہ ' گاہ کلیسا شدہ است

حسن بر عشق زد و عشق بہ حسن — در جہان این ہمہ غوغا شدہ است

نقطہ شد دائرۂ و گشت محیط — ہو بہو بود کہ ہویدا شدہ است

سر مخفی ء دم روح قدس — مریمے بود مسیحا شدہ است

درد در دل شد و نامش شدہ عشق — داغ بر کف ' بد بیضا شدہ است

مہد رہ دامن ہر بو سلف را — دل می ہست زلیخا شدہ است

دلم از دیده ٔ من می بیند بیش که چه دیده چه بینا شده است
کشش کیست به تحت و فوقم که دل من کُه و بالا شده است
من بخود آمده با او شده ام او بخود آمده با ما شده است
شده علوی چو غلام آزاد بنده به بندهٔ مولا شده است

مقالہ بر اسلوب تحقیق

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(۲)

مترجمہ جناب میر حسن الدین صاحب بی - اے ' ایل ایل ' بی (علیگ)

میں اس زمانے میں جرمنی میں تھا ' اس ملک کے محاربات جو ابھی اختتام کو نہ پہنچے تھے مجھ کو وہاں کھینچ لے گئے اور جب میں شہنشاہ کی تاج پوشی کے بعد فوج کو واپس آرہا تھا ' سرما کے آغاز نے مجھ کو ایک مقام پر روک لیا ' جہاں میں نے دن بھر تنہائی میں بسر کی کیوں کہ میرے لئے یہاں دلچسپی رکھنے والی کوئی سوسائٹی نہ تھی - اس کے سوا میں خوش قسمتی سے تفکرات یا جذبات سے آزاد تھا اور مجھ کو اپنی توجہ اپنے ہی افکار و خیالات پر مرتکز کرنے کا پورا موقع حاصل تھا - سب سے پہلا خیال جو میرے دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ ایسے کاموں میں جو مختلف حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کی تکمیل میں مختلف لوگ حصہ لیتے ہیں ' شاذ ہی اس قدر کمال ہوتا ہے جس قدر کہ ان کاموں میں پایا جاتا ہے جن کی تکمیل ایک ہی ماہر فن کرتا ہے پس یہ قابل غور ہے کہ وہ عمارتیں جن کے نقشے کی تیاری اور تعمیر ایک ہی معمار کرتا ہے وہ ان عمارتوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اور وسیع ہوتی ہیں جن کی اصلاح کرنے کی متعدد لوگ اس طرح

کوشش کرتے ہیں کہ قدیم دیواروں کو ان اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کے لئے وہ ابتداً بنائی ہی نہیں گئی تھیں - اسی طرح ان قدیم شہروں کی ساخت جو ابتداً محض دیہات تھے لیکن رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہر بن گئے ان باضابطہ تعمیر شدہ شہروں کے مقابلے میں ہوتی ہے ' جن کا نقشہ ایک پیشہ ور معمار ایک کھلے میدان میں آزادی سے تیار کرتا ہے اگرچہ اول الذکر شہروں کی بہت سی عمارتیں آخرالذکر سے خوبصورتی میں مساوی یا برتر ہوتی ہیں پھر بھی جب کوئی شخص ان کے شہر متناسب اتصال کا مشاہدہ کرتا ہے یہاں ایک بڑی اور وہاں ایک چھوٹی عمارت کو اور ان کی بے ضابطہ اور ٹیڑھی سڑکیں دیکھتا ہے تو وہ یہ کہنے پر مائل ہوتا ہے کہ ایسی ترتیب کا باعث محض بخت و اتفاق تھا نہ کہ ایسا انسانی ارادہ جو عقل کی رہنمائی میں کام کر رہا ہو اگر ہم اس پر غور کریں کہ بہر صورت ہر زمانے میں چند عہدہ دار مقرر تھے جن کا فرض یہ تھا کہ اس پر نگرانی رکھیں کہ خانگی عمارتوں سے شہر کی زینت و آرائش میں اضافہ ہو ' تو فوراً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسروں سے سوا ایسا کیونکر عمل کرنے سے کمال تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے - اسی طرح میں نے یہ خیال کیا کہ وہ قومیں جو نیم بربری حالت سے تمدن کی طرف بتدریج قدم اٹھاتی ہیں وہ اپنے قوانین متواتر بناتی ہیں اور گویا محض مخصوص جرائم اور نزاعات کو مضرت رسانی کے تجربے سے (قوانین - م) قبول کر لئے گئے اس عمل کی وجہ سے ان کے اداارات لی (قوموں - م) کے ادارات کم مکمل ہوتے ہیں جو اپنی اجتماعی حیثیت کے آغاز ہی سے کسی دانشمند واضع قانون کو مقرر کرتی ہیں - اسی طرح یہ یقینی امر ہے کہ جس مذہب کی سرشت جس کے احکام کا مبدا خدا ہوتا ہے ہر ایک مذہب سے لاثانی طور پر برتر ہوتی ہے - اگر انسانی امور کی بحث کی جائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ اسپارٹا کی گزشتہ عظمت کا باعث خصوصاً ان کے قوانین نہیں کیوں کہ ان میں سے اکثر بے حد عجیب و غریب حتیٰ کہ مغائر اخلاق ہیں ' بلکہ اس کا سبب

یہ واقعہ تھا کہ ان کا بانی ایک فرد واحد ہونے کی وجہ سے ان سب کا میلان ایک مقصد واحد کی طرف تھا - اسی طرح میں نے خیال کیا کہ کتابی علوم جو مختلف افراد کے اجرام آرا پر مشتمل ہیں وہ آن سادہ نتائج کے مقابلے میں صداقت سے بہت دور ہیں جو ایک اچھی سمجھ کا آدمی اپنی فطری اور بے تعلق رائے سے اپنے تجربی امور کے متعلق اخذ کرتا ہے - اور چونکہ ہم سب کو حالت طفولیت سے گزر کر بلوغ تک پہنچنا ہے اور لازمی طور پر ہم ایک طویل عرصے تک اپنی خواہشات اور معلمین کے تابع رہے ہیں (جنکی ہدایات اکثر متعارض رہی ہیں اور کسی نے بھی ہمیں بھلائی کے لئے مشورہ نہیں دیا) میں نے مزید نتیجہ یہ اخذ کیا کہ یہ بالکل نا ممکن ہے کہ ہماری آرا ایسی صائب اور مستحکم ہوں جیسا کہ وہ اس صورت میں ہوتیں جب کہ ہماری عقل ہماری پیدائش کے وقت ہی سے پختہ ہوتی اور ہم صرف اس کی رہنمائی میں ہمیشہ عمل کرتے --

بہر حال یہ سچ ہے کہ کسی شہر کے تمام مکانات کو اس غرض واحد کے لئے منہدم کر دینا کہ ان کی مختلف طریقے پر از سر نو تعمیر ہو سکے اور اس طریقے سے سڑکوں کو زیادہ خوبصورت بنا یا جائے خلاف دستور ہے لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک خانگی شخص اپنے مکان کو منہدم کردیتا ہے تاکہ وہ اس کی از سر نو تعمیر کرے اور یہ کہ بعض اوقات لوگ ایسا کرنے پر مجبور ہوجاتے جب کہ سرور زمانہ کی وجہ سے ان کے مکانات کے منہدم ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے یا جب کہ ان کی بنیادیں غیر مستحکم ہوتی ہیں - جب یہ امر بطور مثال میرے سامنے موجود تھا تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ کسی خانگی شخص کے لئے یہ خیال کرنا ایک مہمل سی بات ہوگی کہ کسی مملکت کی اصلاح کرنے اور اس کو ایک بہتر حالت میں لانے کے لئے اس میں سر تا پا تغیر و تبدل کیا جائے - میں نے خیال کیا کہ یہی بات اس پر بھی صادق آئیگی جو علوم اور اس طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے متعلق پیش کی جائے

جو مدارس میں رائج ہے - لیکن ان آرا کے متعلق جو اس زمانے تک میں نے قبول کئے تھے میں نے خیال کیا کہ میں اس سے بہتر کچھ اور نہیں کرسکتا کہ ان کو کلیتہً ترک کرنے کا تہیہ کرلوں تاکہ میں بعد میں اس قابل ہوسکوں کہ ان سے زیادہ صحیح یا انہی آرا کو قبول کروں جبکہ یہ عقل کی تفتیش و تحقیق میں پوری اُتریں - مجھ کو یقین راسخ تھا کہ قدیم بنیادوں پر (خیالات کی - م) تعمیر کرنے اور ان اصول کی طرف مائل ہونے کی بجائے جن کو میں نے اپنے شباب میں اعتماد پر قبول کرلیا تھا اس طریقہ سے اپنی زندگی کی رہنمائی میں زیادہ کامیابی ہوگی - اگرچہ اس مہم میں میں نے کئی دشواریاں محسوس کیں لیکن یہ لاعلاج نہ تھیں اور نہ ان کا مقابلہ اُن دشواریوں سے کیا جاسکتا ہے جو امور عامہ کی معمولی سی اصلاح میں سدراہ ہوتی ہیں - بھاری اجسام اگر ایک بار بھی منہدم ہوجائیں تو ان کا اُٹھانا یا اُن کو شدید جھٹکا پہنچے تو ان کا کھڑا کرنا نہایت دقت طلب ہوتا ہے اور ایسے اجسام کا گرنا آفت خیز ہوتا ہے - پس اگر مملکتوں میں کوئی نقائص ہیں بھی (خود دستورات کا تعدد و اختلاف ہم کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ ایسے نقائص موجود ہیں) تو عادت نے ان دقتوں کو بلا شبہ آسان کر دیا ہے یا ان قباحتوں کی غیر محسوس طور پر اس طرح اصلاح کی ہے کہ فہم و فراست اسی خوبی کے ساتھ اُن کا انسداد نہ کرسکتی تھی - مختصر یہ کہ یہ نقائص بہ نسبت ان تغیرات کے زیادہ قابل برداشت ہوتے ہیں جو ان کے ازالہ کے لئے لازمی ہیں اسی طرح وہ راستے جو پہاڑوں میں سے گزرتے ہیں کثرت استعمال سے بتدریج ہموار اور آسان ہوجاتے ہیں لہذا انہیں راستوں پر چلنا زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ سیدھا راستہ تلاش کرنیکے لئے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر دوسری جانب دامن میں اُتریں-

پس یہی وجہ ہے کہ میں کسی طرح ان بے چین مداخلت کنندوں کو پسند نہیں کرسکتا جو نہ تو بہ لحاظ پیدائش اور نہ بہ لحاظ ثروت امور عامہ کے انتظام میں

حصہ لینے کے قابل ہیں لیکن پھر بھی تجاویز اصلاحات ہمیشہ پیش کرتے رہتے ہیں - اور اگر مجھ کو یہ خیال ہوکہ اس راستے میں کوئی چیز ایسی ہے جس سے اس شبہ کی تائید ہوتی ہے کہ میں ایسے بے وقوفی کا شکار ہوگیا ہوں تو میں کسی طرح اس کی اشاعت کی اجازت نہ دونگا - میں نے خود اپنی آرا و خیالات تک کی اصلاح اور ان کو کلیتاً اپنی بنیاد پر قائم کرنے کے سوا کسی اور اعلیٰ ترین چیز کا خیال تک نہیں کیا - اگر چہ مجھ کو اپنے کام سے تشفی ہونے کی وجہ سے میں نے یہاں اس کا ایک خاکہ پیش کیا ہے لیکن میں کسی اور شخص سے اس قسم کی کوشش کرنیکی سفارش نہ کرونگا - جن لوگوں کو خدا نے زیادہ ذہانت و دیعت کی ہے وہ غالباً اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان مقاصد اپنے پیش نظر رکھتے ہیں - مجھے خوف ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ موجودہ مہم ایسی نہیں جسکی وہ کامیابی کے ساتھ تقلید کرنے کی جسارت کرسکیں - اپنے ذہن سے تمام ماقبل معتقدات کو مٹادینا ایک ایسا مقصد ہے جسے ہر شخص کو اختیار نہ کرنا چاہئے - لوگوں کی اکثریت دو گروہ پر مشتمل ہے اور ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی یہ مقصد موزوں نہیں ہوگا - پہلا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو اپنی قوتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں اور ان میں اُس صبر و تحمل کا فقدان ہوتا ہے جو مربوط اور منضبط ہیں غور وفکر کے لئے لازمی ہے یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے لوگ جب ایک بار اُن آرا وخیالات میں شک کرنے لگتے ہیں جس کے وہ عادی ہیں اور پامال شاہراہ کو ترک کردیتے ہیں وہ قابل نہیں رہتے کہ پگڈنڈی پر چل سکیں جو ان کی رہنمائی قریب ترین راستے سے کرسکتی ہے اور وہ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ عمر بھر گمراہ رہتے ہیں - دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو اس امر کو متعین کرنے کی سمجھ رکھتے ہیں اور لوگ بھی ہیں جو اس سے زیادہ صداقت اور کذب میں امتیاز کرنے کی قوت رکھتے ہیں اور ان کو تعلیم بھی دے سکتے ہیں اس گروہ کو چاہئے کہ اپنی عقل سے زیادہ ایسے لوگوں کی آرا پر اکتفا کریں —

میری حد تک تو ، میں بلا شبہ آخرالذکر جماعت سے تعلق رکھتا اگر میں ایک سے زیادہ اساتذہ سے تعلیم نہ پاتا یا کم از کم مجھ کو اُس اختلاف آراء کا علم نہ ہوتا جو ایک طویل عرصے تک قابل ترین اشخاص میں پایا جاتا ہے - میں اپنی کالج کی زندگی ہی سے اس بات سے آگاہ ہوچکا تھا کہ کوئی رائے خواہ وہ کتنی ہی مہمل اور نا قابل یقین کیوں نہ ہو ایسی نہیں ہے جس کی کسی نہ کسی فلسفی نے حمایت نہ کی ہو۔اس کے بعد میں نے اپنے سفر کے دوران میں اس امر کا تجربہ کیا کہ وہ لوگ جن کی آراء ہماری رائے سے قطعاً متضاد ہوتی ہیں محض اس وجہ سے ربری یا وحشی نہیں ہوں - لیکن اس کے برعکس ان میں سے اکثر اقوام ایسی ہیں جو اپنی عقل کو ہم سے زیادہ بہتر نہیں تو دوسرے برابر استعمال کرتی ہیں - میں نے اس پر بھی غور کیا، ایک شخص جس نے اپنے بچپن سے فرانس یا جرمنی میں پرورش پائی ہو اُس شخص سے مختلف سیرت رکھتا ہے جس نے اس طرح کے ذہن کے ساتھ اپنی زندگی ہمیشہ چینیوں یا وحشیوں میں بسر کی ہے ، اور یہ واقعہ ہے کہ لباس میں جو فیشن ہم کو دس سال قبل مرغوب تھا اور جو ممکن ہے کہ دس سال اور گزرنے سے پہلے پھر مرغوب ہو جائے اس وقت ہم کو لایعنی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے - اس طرح میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے آراء کی بنیاد زیادہ تر رواج اور تعلیم ہے ، نہ کہ علم از عالمی - گو ہمارے آراء کی یہی بنیاد ہوگی لیکن بالآخر میں نے یہ معلوم کیا کہ کثرت آراء صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے جب کہ انکشاف صداقت دشوار ہوتا ہے اور ایسی صورتوں میں تو ایک ہی شخص کا (صداقت) کو منکشف کرنا بہ نسبت متعدد اشخاص کے زیادہ ممکن ہوتا ہے - بہر حال میں عوام میں سے کسی ایک شخص کو بھی منتخب نہ کر سکا جس کی رائے قابل ترجیح معلوم ہو ، پس میں نے اپنی زندگی کی رہنمائی میں اپنی ہی عقل کو استعمال کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا —

لیکن ایک ایسے شخص کی طرح جو تنہا اور تاریکی میں چل رہا ہو میں نے اس قدر آہستہ اور ایسی احتیاط سے آگے قدم بڑھانے کا تہیہ کر لیا کہ اگر میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکوں تو کم از کم گرنے سے محفوظ رہوں میں نے کبھی ایسی راہ کو بھی سر سری طور پر ترک نہیں کیا جو میرے اعتقاد میں بلا توسط عقل داخل ہو گئی تھی - لیکن سب سے پہلے میں نے اس کام کی عام نوعیت کے متعلق اپنے آپ کو مطمئن کرنے جو میں اپنے ذمہ لے رہا تھا اور ایسے صحیح طریقے کو معلوم کرنے کے لئے کافی وقت لیا جس کے ذریعے میں اُن اشیاء کا علم حاصل کر سکتا جو میرے دسترس میں تھے —

فلسفے کے شعبوں میں سے میں نے ابتدائی زمانے میں کسی قدر توجہ منطق پر کی تھی اور ریاضیات کے (شعبوں میں سے) ہندسی تحلیل اور جبر و مقابلہ پر - میں نے خیال کیا کہ ان تین فنون یا علوم سے میرے مقصد میں کچھ نہ کچھ مدد ملنی چاہیے - لیکن تحقیق و تدقیق کے بعد میں نے معلوم کیا کہ منطق اور اس کے قیاسات اوز اُس کے اکثر اصول اس وقت کار آمد ہوتے ہیں جب کہ ہم اُس علم کو پیشتر ہی سے حاصل کر کے دوسرے تک منتقل کرنا چاہیں نہ کہ نامعلوم کی تحقیقات میں - اگرچہ اس علم میں متعدد اصول صحیح اور عمدہ ہیں پھر بھی دوسرے اصول اکثر ایسے ہیں جو یا تو مضرت رساں ہیں یا غیر ضروری اور یہ اول الذکر سے اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں کہ صحیح اور باطل کو علحدہ کرنا اسی طرح دشوار ہے جس طرح کہ ناتراشیدہ سنگ مر مر سے ڈائنا یا مفروا کا مجسمہ مستخرج کرنا - قدما کی (ہندسی) تحلیل اور متاخرین کے جبر و مقابلہ کا یہ حال ہے کہ یہ بالکل مجرد اشیا سے متعلق ہونے کے با وجود بہ ظاہر کار آمد بھی نہیں - اول الذکر کے غور و فکر کا دائرہ اشکال تک اس طرح محدود ہے کہ تخیل کو بے حد تھکائے بغیر عقل کا استعمال ممکن نہیں آخر الذکر چند قواعد و ضوابط کے ایسے مکمل

طریقہ پر قانع ہے کہ اس سے ایک علم وجود میں آنے گی بجاے جو ذہن کی تربیت کر سکے ایک ایسا فن پیدا ہوجاتا ہے جو انتشار اور ابہام سے بھر پور ہوتا ہے اور اُلجھن پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے - ان خیالات کی وجہ سے مجھہ کو کوئی اور طریقہ تلاش کرنے کی ترغیب ہوئی جو ان تینوں کے فوائد پر حاوی اور ان کے نقائص سے بری رہے - چونکہ تعداد قوانین سے معدات گستری میں رکاوٹ ہوتی ہے اور بہترین حکمرانی ایسی سلطنت میں ہوتی ہے جو چند ہی قوانین کو سختی کے ساتھہ نافذ کرتی ہے اسی طرح ان متعدد اصول کی بجاے جن پر منطق مشتمل ہے میں نے خیال کیا کہ حسب ذیل چار اصول میرے لئے مکمل طور پر کافی ثابت ہونگے بشرطیکہ میں ایسا مستحکم اور غیر متزلزل ارادہ کرلوں کہ کبھی بھی ان کی پابندی میں قصور نہ کروں گا —

پہلا (اصول) یہ تھا کہ کسی چیز کو صحیح کبھی نہ تسلیم کروں گا جس کو میں واضح طور پر صحیح نہ جانتا ہوں یعنے جلد بازی اور تعصب سے احتیاط کے ساتھہ اجتناب کرونگا اور اپنی تصدیق میں اس چیز کے سوا کچھہ اور اضافہ نہ کرونگا جو میرے ذہن کے آگے اسقدر صاف اور واضح طور پر پیش کی گئی تھی کہ شک کی کوئی وجہ باقی نہ تھی —

دوسرے یہ کہ ہر ایک دشواری کو جو زیر غور ہو اسقدر ممکنہ حصوں میں تقسیم کیا جاے جو اس کے سوزوں حل کے لئے ضروری ہے —

تیسرے یہ کہ میں اپنے افکار کو اس طریقے سے استعمال کروں کہ سادہ اور آسان اشیا سے شروع کرکے زیادہ ملتف اشیا کے علم کی طرف آہستہ آہستہ گویا زینہ بہ زینہ گ دہ سکوں اور ذہن میں اُن اشیا کو بھی ترتیب دیتا جاؤں جو بالطبع قدم

مجھ کو یہ اطمینان ہو جائے کہ کوئی چیز حذف نہیں ہوئی —

آسان اور سادہ استدلال کے اس طویل سلسلے نے جس کے ذریعے علمائے ہندسہ اپنے دشوار ترین براہین کے نتائج تک پہنچتے ہیں مجھ میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ تمام اشیا میں جن کا علم حاصل کرنے کی قوت انسان میں ہے اسی طرح کا باہمی ربط و اتحاد ہے - اور یہ کہ کوئی شے ہم سے اس قدر دور نہیں ہے کہ ہماری دسترس سے باہر ہو یا اس قدر پوشیدہ نہیں ہے جس کا ہم انکشاف نہ کر سکتے ہوں - بشرطیکہ ہم کذب کو صداقت تسلیم کرنے سے پرہیز کریں اور اپنے افکار میں ہمیشہ اس ترتیب کو محفوظ رکھیں جو ایک صداقت سے دوسری صداقت کو مستخرج کرنے کے لئے ضروری ہے - اور مجھ کو ان اشیا کے معلوم کرنے میں بہت کم دشواری ہوں جن سے شروع کرنا ضروری تھا ' کیونکہ مجھ کو پیشتر ہی سے یقین تھا کہ آسان اور سلیس ترین شے سے شروع کرنا چاہئے اور اس پر غور کرنے کے بعد کہ ان لوگوں میں سے جنھوں نے اب تک علوم میں صداقت تلاش کی ہے صرف علمائے ریاضیات ہی ثبوت یعنے قطعی اور بدیہی دلائل پانے کے قابل ہو سکے ہیں - مجھ کو شک نہ رہا کہ ان کی تحقیقات کا بھی بس یہی قاعدہ رہا ہوگا - لہذا میں نے آسان ترین اشیا کی تحقیقات سے شروع کرنے کا تہیہ کر لیا پھر بھی میں نے اس کے سوا کسی اور فائدے کی پیش بینی نہیں کی کہ اس سے میرے ذہن کو صداقت سے محبت کرنے کی عادت اور جھوٹے دلائل سے نفرت پیدا ہو جائیگی - لیکن اس بنا پر میں نے ان تمام علوم مخصوصہ پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی جو عام طور پر ریاضیات کے نام سے موسوم ہیں لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کے مقاصد خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں یہ متفقہ طور پر ان علائق یا تناسب پر غور کرتے ہیں - جو اشیا میں پایا جاتا ہے میں نے اپنے مقصد کے لئے یہ بہتر سمجھا کہ ان تناسبات کی عام ترین ممکنہ صورت پر بغیر کسی خاص شے کے حوالے کے غور

کروں لیکن صرف ان اشیا کو پیش نظر رکھوں جن سے ان کا علم حاصل کرنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور ان (علائق) کو کسی طرح ان اشیا تک محدود نہ کروں تاکہ میں آگے چل کر ان کو اشیا کی ہر صنف پر جن پر یہ صحیح طور پر منطبق ہو سکتے ہیں منطبق کروں - علاوہ ازیں یہ دیکھ کر کہ ان علائق کو سمجھنے کے لئے مجھ کو کبھی ان پر یکے بعد دیگرے غور کرنا چاہئے اور کبھی ان کو ذہن نشین رکھنا یا ان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہئے میں نے خیال کیا کہ ان پر انفرادی طور پر اچھی طرح غور کرنے کے لئے اگر میں یہ تصور کروں کہ یہ ایک خط مستقیم میں رکھے ہوئے ہیں تو اس سے زیادہ آسان کوئی شے نہ ہو گی یا اس زیادہ وضاحت کے ساتھ کسی شے کا استحضار میرے تخیل اور حواس کے آگے نہ ہوگا - اس کے برخلاف ان کو حافظے میں رکھنے کے لئے یا ان کے مجموعے پر غور کرنے کے لئے مجھ کو چاہئے کہ میں ان کو چند مختصر سی علامات کے ذریعے ظاہر کروں - اس طرح میں نے خیال کیا کہ میں ان بہترین چیزوں کو مستعار لے سکتا ہوں جو ہندسی تحلیل اور جبر و مقابلہ میں پائی جاتی ہیں اور ایک کے نقائص کو دوسرے کی مدد سے رفع کر سکتا ہوں —

اپنے رقیب سے

از

جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم - اے (عثمانیہ)

عشق کی آگ تیرے دل کو بجادی کس نے　　کس لئے تو نے کیا ترک محبت کا خیال
تیری آشفتہ مزاجی وہ چھڑادی کس نے　　کس طرح ہوگیا مایوس تماشاے جمال
تیری تبدیلی سے ہے دل میں خلش سی پیدا　　چل کے دو چار قدم بیٹھ رہا تھک کے یہیں
ہاں بتا عشق ترا بوالہوسی تھی کہ نہیں ؟

آجا پھر عشق کے میداں میں ہمت کر کے　　تو مرے نالوں سے کچھ تو تپش اندوزی کر
پی لے تلخابۂ آلام کو جرات کر کے　　حاصل سوز بہت ہے جو جگر سوزی کر
یہ بتا کیا مرے دل میں تھی تمناے وصال　　تجھ سے بڑھنے کے لئے میرا قدم اُٹھتا تھا
راہ کٹتی تھی مری ختم سفر ہوتا تھا



شاهنامے کا جنم بھوم

از

جناب سید محی الدین صاحب متعلم ایم - اے کلیہ جامعہ عثمانیہ

ذیل کا مضمون آقائی سید حسن تقی زادہ کے ایک محققانہ علمی مقالے کا ترجمہ ہے جس کو انھوں نے مشہور و معروف رسالۂ " کاوہ " میں " محصل " کے فرضی نام سے شایع کرایا تھا - یہ مضمون علامۂ نولد کی نے " حماسۂ ملی ایران " میں جو محققانہ مقالہ لکھا ہے اس کا لب لباب اور سید حسن تقی زادہ کی تدقیق کا بہترین شاہکار ہے —

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالۂ کاوہ کے متعلق اس مقام پر چند سطور لکھہ دی جائیں تا کہ ناظرین کو اس کی اہمیت اور اس کے اعلیٰ مقاصد کا کچھہ اندازہ ہوسکے - جنگ عظیم کے دوران میں ایران ہمسایہ سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں سے تباہی اور بربادی کے غار میں گرتا چلا جارہا تھا اور اس کا سیاسی اقتدار معرض خطر میں آگیا تھا - چند وطن پرست ایرانیوں نے جو حسن اتفاق سے اس زمانے میں جرمنی میں مقیم تھے اس صورت حال کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے دلوں میں اپنے عزیز وطن کے اقتدار کو بچانے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی - یہ محبان ایران جرمنی کے طرفدار اور روس کے مخالف تھے کیونکہ وہ روسی اثرات کو ایران کے لئے خطرناک تصور کرتے تھے - چنانچہ انھوں نے اس سیاسی مقصد کے ساتھہ ایک رسالہ فارسی زبان

میں برلن سے سنہ ۱۹۲۶ ع میں جاری کیا - اور اسی کا نام " کاوہ " رکھا اس میں نکتہ یہ تھا کہ جس طرح کاوہ نے ایک ظالم اور جابر بادشاہ اور یعنی ضحاک سے ملک ایران کو نجات دلائی اسی طرح یہ رسالہ بھی موجودہ استبداد اور مظالم سے ایران کو محفوظ رکھنے میں کارنمایاں انجام دیگا علاوہ ازیں اس بڑے محب وطن کی یاد تازہ رکھنی بھی مقصود تھی ۳۵ شمارے نکلنے کے بعد سنہ ۱۹۱۹ ع میں اس کی اشاعت موقوف ہوگئی اور اس زمانے تک جنگ عظیم بھی اختتام کو پہنچ چکی تھی بعد ازاں سنہ ۱۹۲۰ ع کے اوائل میں آقائی سید حسن تقی زادہ حال وزیر مختار ایران مقیم لندن کی زیر ادارت اس کا نیا دور شروع ہوا - یہ محض علمی ادبی دور تھا اور سیاسیات سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا —

کامل دوسال یعنی سنہ ۱۹۲۲ ع تک یہ شائع ہوتا رہا - اس عرصے میں اس کے ۲۴ شمارے نکلے - کاوہ کی زندگی کا یہ دوسرا دور بہت اہم ہے - اسی زمانے میں اعلیٰ قسم کے محققانہ علمی ادبی اور معاشرتی مضامین اس میں شائع ہوتے رہے —

ہندوستان میں کاوہ کی جلدیں بہت کمیاب ہیں - کیونکہ جنگ عظیم کے باعث اس کی اشاعت یہاں کافی طور پر نہ ہوسکی پھر بھی چند علم دوست حضرات کے پاس اس کی جلدیں پائی جاتی ہیں - کتبخانۂ آصفیہ میں اس کی دوسری جلد موجود ہے

ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب پروفیسر فارسی کلیہ جامعہ عثمانیہ نے جو علمی تحقیقات سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ عشق رکھتے ہیں ایک فاضل بزرگ کے کتبخانے سے کسی نہ کسی طرح اس کی جلدیں حاصل کرلیں اوران کو ترجمے کے لئے ایم - اے کے طالبعلموں کے حوالے کیا اور خود بھی غور معمولی انہماک سے اس کام کی نگرانی فرماتے رہے

مترجم نے نہایت محنت سے کاوہ کے اس مضمون کا ترجمہ
کیا ہے جس کی پہلی قسط ذیل میں نذر ناظرین کی
جاتی ہے —

" مجلہ "

دنیا کی قوموں کے مشترک افسانے اور قصے

شاہنامے سے مراد ایران کی ملی داستانیں اور قومی افسانے ہیں یعنی وہ تمام قصے کہانیاں جو قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ اسلاف سے اخلاف تک چلی آرہی تھیں اور قوم کی زبان پر چڑھی ہوئی تھیں' جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان پر حاشیے چڑھتے گئے اور قومی داستان میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا - ان قومی افسانوں کی نظیریں جن میں پچھلے زمانے کے آبا و اجداد کے مبہم اور تاریک قصے بیان کئے گئے ہیں دنیا کی اکثر قومی داستانوں * میں مشترک ہیں اور قدیم سے پائی جاتی ہیں ان افسانوں کا ایک حصہ غالباً اس قوم کی تاریخی زمانے سے پہلے کی سرگزشتوں اور غیر قوموں سے لڑائی جھگڑوں اور مہاجرت پر مشتمل ہے - جو ملکی دیوتاؤں کے اساطیر اور قصوں کے ساتھ خلط ملط ہوکر مسلسل روایات کے ذریعے کئی صدیوں سے زبان زد خلائق ہے ' اور جس کی ایک دھندلی سی تصویر ہمارے سامنے پیش ہو جاتی ہے - ان افسانوں کو چند اقسام پر تقسیم کیا جاسکتا ہے —

اس کا ایک حصہ اس قدر قدیم ہے کہ اسے آریائی قوم کی قدیمی داستان کہا جاسکتا ہے اور جو ہندی ایرانی مشترک قصے کہانیوں میں سے ہے - اس کے آثار 'اوستا' اور 'رگ وید' دونوں میں پائے جاتے ہیں ' اور غالباً دونوں قوموں کے اجداد و اسلاف کے احوال مشترک پائے جاتے ہیں جیسا کہ جمشید و فریدوں

---

* جیسے یونانی دیوتاؤں کے قصے " ایلیاد " اور " اوڈیسی " میں ہومر شاعر نے منضبط کئے ہیں اور قدیم ہندوؤں کے قصے جو رگ وید میں پائے جاتے ہیں —

و کاوس وکیخسرو کہ اوستا میں بشکل " یِمَا " ۔ " ثرایتا اونا " ۔ " کاوی اوسان" و " کاوی هوسراوا " اور رگ ویدا میں بشکل " یاما" ۔ " ثرایتاؤ " " اوشنا " اور " سوشراواس " پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح ضحاک (آژی دہاکا = اژدہا) کا قصہ ہے جو آریائی قوموں میں مشترک ہے

تاریخی زمانے سے پہلے کے افسانے اور اوستا

علما کی تحقیقات سے جو انہوں نے ان ہندی افسانوں کے جنم بھوم کے متعلق کی ہیں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ افسانے زیادہ تر ایک قدیم بھوم داستان کا جزو ہیں جو ادنیٰ حد تک مرتب اور مسلسل صورت میں اوستا کی تالیف سے پیشتر قبل التاریخ زمانوں میں عوام کی زبان پر چڑھ رہے تھے دنیا کی ابتدا اور پہلے انسان کیومرتا (کیومرث کے ظہور سے لے کر زرتشت کے ظہور تک کے واقعات یک تاریخی افسانے کے طور پر منظم تھے ۔ اوستا کو ترتیب دینے والوں نے ان قصوں کو صحیح سمجھا ہے ۔ ظن غالب یہ ہے کہ س قدیم قومی داستان میں قدیم ترین عہد سے لیکر ازمنۂ متخارہ تک کے مسلسل واقعات کو ایک تاریخی ترتیب موجود تھی اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اوستا کی تالیف کے زمانے میں ایران کے اساطیری حصے کی تاریخ مدون صورت میں لوگوں کے پاس موجود ہو اور اس ملی داستان کی اساسی باتیں جس کے جزئیات عوام میں پھیلے ہوئے تھے اور طویل قصوں کی صورت اختیار کئے ہوئے تھے اوستا میں درج کرائی گئی ہوں ۔ مختلف قرینوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان قصوں کا مطبح و ماحول شمال مشرقی ایران رہا ہے ، جہاں شاہنامے کو داستانوں نے ترویج پائی اور ظن غالب ہے کہ یہی اوستا کا وطن ہے ۔

پروفسور نولدکہ کا شہور آفاق رسالہ حماسۂ ملی ایران

پروفسور نولدکہ نے اپنی بےنظیر کتاب " حماسۂ ملی ایران " میں ایرانی اساطیر کا اُن یونانی اور ارمنی ماخذات کا جو ہم تک پہنچے ہیں ملکی داستانوں کے ساتھ مقابلہ و مقایسہ کرتے

ہوے ثابت کیا ہے کہ اگر چہ اوستا کے وجود میں آنے کے زمانے سے پہلوی زبان میں سب سے پہلے مدون قصہ (یا تکارز ایران) کے لکھے جانے تک جو اب تک دستیاب ہوتا ہے کسی اور داستان کا پتہ نہیں چلتا پھر بھی ایران میں ملی داستان صدیوں زندہ رہی اور اسلام سے اخلاط تک پھیلتی رہی —

نئے پرانے قصوں کی تنظیم؛ داخلی و خارجی عنصر

پانچویں صدی میلادی کے نصف آخر سے ایران میں قومی داستان کے رواج اور شہرت کے موہوم سے آثار پاے جاتے ہیں - اور ایرانیوں میں قدیم داستانی اشخاص اور پہلوانوں کے نام بھی رواج پاتے ہیں یہاں تک کہ بعض ان ہی داستانی ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں - اوستا جس میں قومی داستان کا بہت بڑا حصہ موجود ہے اور جس کا ثبوت بھی اوستا کی موجودہ اجزا سے بخوبی ملتا ہے اور اس کی تفسیر اور دوسری مذہبی روایتی کتابوں کے علاوہ جس کتاب میں رزمیہ داستان کی سب سے پہلی جھلک نظر آتی ہے وہ یادگار امہ زریر یا یادگار ایران ہے جو پہلوی زبان میں سنہ ۶۰۰ میلادی یا اس کے بعد لکھی گئی ہے - یہ کتاب قدیم ترین تحریرات میں سے ہے اور خاص موضوع پر اس بڑی قومی داستان کا ایک ٹکڑا ہے - یہ قصہ یقیناً ایران کی ملی داستان کا جزو ہے کیونکہ یہی قصہ تاریخ طبری اور شاہنامہ فردوسی میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ پایا جاتا ہے - " یادگار ز ایران " کے بعد دوسری قدیم کتاب جو ساسانیوں کے زمانے میں لکھی گئی وہ " کارنامہ اردشیر بابکان " (کارنامک) ہے - یہ نیم رزمی کتاب جو اردشیر اور اس کے بیٹے اور پوتے کے کارناموں پر مشتمل ہے بظاہر سنہ ۶۰۰ میلادی کے حدود میں لکھی گئی ہے اور بالکلیہ ایک افسانہ ہے - حالانکہ اس وقت اردشیر کی زندگی کے تاریخی معلومات کافی موجود تھے لیکن یہ داستان صرف قصہ کہانی کے طور پر لکھی گئی ہے - فردوسی کے شاہنامے میں اس کتاب کے اجزا داخل ہوگئے ہیں - اس کتاب کا مضمون بظاہر

بعد کے زمانے میں قومی داستان کا جزو بھی بن گیا تھا —

ساسانیوں کے عہد میں خصوصاً ان کے آخر زمانے میں اس قسم کی تالیفات کثرت سے ہونے لگیں - معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اقوام کے داستان گویوں کی طرح ایرانی قصہ سرا اور افسانہ گو بھی اپنی قومی داستان سے مختلف موضوع پر قصے گھڑنے لگے اور اسی قسم کے مطالب کو جوڑ کر اور ان کی کانٹ چھانٹ کے بعد مختلف * قصوں کو کتابی شکل میں لانے لگے - ساسانی عہد میں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ملی داستان اور خصوصاً پہلوانوں کی داستان کئی بار قالب بدل چکی ہے - یعنی متعدد قصہ سراؤں اور مؤلفوں کے ہاتھوں سے گذری ہے اسی سبب سے بعد میں اس کی بعض تفصیلات بالکلیہ نا پیدا ہوتی گئیں اور ان شاہناموں میں جو اسلامی عہد میں لکھے گئے بہت سارے ایسے اشخاص کے نام ونشان جو اوستا میں موجود تھے نہیں پائے جاتے - دوسری بات یہ ہے کہ ملی داستان میں بہت سارا تازہ مواد داخل ہوگیا - ان تمام چیزوں سے جو بعد میں داستان میں داخل ہوئیں دو باتیں بالکل تازہ اور نہایت اہم ہیں - ایک اشکانی عہد کے واقعات اور شکانی سلاطین امرا اورسرداروں کے حالات کا رد وبدل کردینا ہے - مثلاً گودرز - بیژن قارون - گیو فرہاد اور میلاد (مہرداد) وغیرہ کی زندگی کے واقعات - یہاں تک کہ بعض ساسانی عہد کے واقعات بھی قومی داستان میں داخل ہوگئے ہیں جن کا اوستا میں قطعاً ذکر نہیں —

دوسرے رستم وزال کا قصہ ہے جو فردوسی کا شاہکار اور ایرانی پہلوانوں کے جنگی کار نامے پر مشتمل ہے - شاید یہ قصہ بھی ساسانی عہد آخری صدیوں میں

---

* مثلاً بنی اسرائیلی افسانوں میں سے جو توریت سے لئے گئے ہیں حسب ذیل ہیں قصہ یوسف و زلیخا - قصہ سلیمان و بلقیس - حکایت ایوب علیہ السلام اور قصہ ابراھیم و ذبیح اسمعیل علیہ السلام —

ملی داستان کا جزو بنگیا اس کا اوستا میں کہیں پتہ نہیں چلتا - داستان کا یہ حصہ بالکلیہ ایک افسانہ ہے اور فن مرچ لگائی ہوئی کہانی - یہ قصہ سیستان (بلخ سے جو اوستا کی جاے پیدایش ہے دور ہے کر مقامی داستان سے لیا گیا تھا اور ایران کی ملی داستان میں اسلام کے ظہور سے بہت پہلے داخل ہو کر مشہور ہو چکا تھا - چنانچہ ابن ہشام کا قول اس سے موافق ہے کہ ایک مکی تاجر نظر بن الحارث تقریباً ہجرت سے دو سال قبل حیرہ یعنی جنوب مغربی ایران میں رستم و اسفندیار کی جنگ کا قصہ یاد کر کے مکے میں کہا کرتا تھا جو بہت مقبول عام تھا - یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سیستانی روایتیں بہت پہلے ہی سے پھیل چکی تھیں حتیٰ کہ عراق عرب تک بھی ان کا اثر جا پہنچا تھا - اور اسی طرح بلاذری کے قول کے مطابق اسلام کی فتوحات کے اوائل میں لوگوں نے سیستان کو فتح کے وقت سیستان میں رستم کے گھوڑے کا طویلہ دیکھا تھا - ' موسیٰ خورن ' ارمنی مورخ جس نے ساتویں یا آٹھویں صدی میلادی میں اپنی کتاب تالیف کی ہے - رستم اور اس کی پہلوانی کے کارناموں کو نقل کرتا ہے ' جو موجودہ ایرانی ماخذ میں نہیں پائے جاتے —

ایران کی ملی داستان میں اشکانی عہد کے بعد ان دو حصوں یعنی اشکانی عہد کے واقعات اور رستم و زال کے واقعے کے متداخل ہونے کو استاد ' نولدکہ ' نے اپنی لاجواب کتاب میں کافی دلائل سے ثابت کیا ہے - جو شخص نہ صرف اس مسئلے کے متعلق بلکہ قدیم داستان اور شاہنامے کے متعلق عمیق معلومات اور دقیق نکات حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور اس مقالے میں بھی زیادہ تر اسی کتاب سے مواد حاصل کیا گیا ہے -

خارجی عنصر کا داستان میں داخل ہونا

اس کے علاوہ رفتار زمانہ نے ملی داستان میں اور مویدوں کی روایتوں میں دوسری اقوام کے کئی ایک

خارجی عنصر داخل کردئے ہیں - خاص کر بنی اسرائیل کی روایتوں کے اکثر اجزا ایرانی روایتوں میں داخل ہوگئے ہیں - مثلاً سلیمان علیہ السلام کے متعلق جو مافوق العادۃ قصے مشہور ہیں یعنی دیو و پری اور ہوا کا مسخر ہونا بعینہ یہی صفات جمشید پیشدادی سے منسوب کردی گئی ہیں

ایرانی داستان اور تاریخ کو جمع کرنے کی طرف ساسانی پادشاہوں کی توجہ

معلوم ہوتا ہے کہ ساسانی عہد کے پادشاہ خود تاریخ اور قدیم سلاطین کی داستانوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں اہتمام کرتے رہے ہیں اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایرانی تاریخ کو ابتداے آفرینش سے اپنے زمانے تک سلسلے وار ترتیب دے کر ان قدیم پادشاہوں سے جو اوستا میں مذکور ہیں اپنے نسب کو ملائیں - اشکانیوں کے متعلق اور اس سے بھی کم ھخا منشیوں کے متعلق کچھ پریشان روایتیں ملی داستان میں داخل ہوگئی ہیں - عام طور پر ملی داستان کی ابتدا کیو مرث سے ہوتی ہے اور گشتاسپ تک پہنچتی ہے اور جب ھخا منشی قرار واقعی پادشاہوں میں سے صرف ایک پادشاہ کا نام یعنی دارا کا نام لیا جاتا ہے اور اس کے سکندر ملعون کے ہاتھوں قتل ہونے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے تو داستان نے ایک اور حکایت میں ایک دوسرے دارا کا ذکر کر کے جو اس دارا سے بھی زیادہ شان و شوکت والا تھا گشتاسپ سے ملادیا ہے اور داستانی دارا کو پہلے دارا کا بیٹا قرار دیا ہے اس طرح سے تاریخ کی کڑیاں (پیشدادی کیانی) فتح سکندر کے زمانے تک ملادی ہیں*

---

* پیشدادی اور کیانی پادشاہوں کے وہ افسانے جو قومی داستان میں داخل ہوگئے ہیں مؤد اور ھخا منشی خاندان کے صحیح اور تاریخی واقعات سے کوئی تعلق نہیں

(باقی نوٹ بر صفحۂ آیندہ)

شاهنامہ کے اصلی ماخذ اور قومی داستان کے اجزا

خلاصہ یہ کہ قدیم ملی داستان اور شاہنامے کے ماخذ سے مراد حسب ذیل چیزیں ہیں : قدیم آریائی اور ہندی ایرانی افسانے - بلخ کی سینہ بہ سینہ روایتیں - آفرینش عالم اور ابتدائے دنیا اور اعصار قدیمہ کے متعلق اوستا کے مندرجات اوستا کے وہ مقامی قصے اور داستانیں جن کی نشو و نما دوسرے مقامات میں ہوئی ہے اور اوستا کے اثر سے خارج ہیں - اشکانی عہد کے واقعات کی قلب ہیئت تاریک اور مبہم افسانے کی شکل میں - اس کے علاوہ دوسری چھوٹی چھوٹی باتیں یا سچے واقعات جو ہخا منشیوں کے زمانے میں لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے جن کی دھندلی سی تصویر لوگوں کے پیش نظر تھی اور جو یونانی اور سریانی اثرات سے پھر دوبارہ ایران کی داستان میں داخل ہوگئے—

شاہنامے کے خارجی عناصر

اس کے علاوہ شاہنامے (یا قدیم ایرانی تاریخ) کی تدوین اوراس کو وجود میں لانے میں حسب ذیل چیزوں کو دخل ہے :-

پہلوی زبان کے کتابی قصے مثلاً (قصۂ بہرام چوبین و قصۂ شہربراز و پرویز

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

رکھتے اور سوسال سے جو صرف اس کا بھی نہ تھا ہمارے داستانی اور تاریخی بادشاہوں کی مطابقت میں پڑھی کو ہوں بالکل بے بنیاد ہوں اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ زرتشت کا مربی شاہ گشتاسپ ایک تاریخی شخصیت رکھتا ہے تو کہانیوں کا سلسلۂ نسب اس امیر بلخ یا باختر سے ملتا ہے جس کا نام گشتاسپ بتلایا جاتا ہے اور جس کا ذکر اوستا میں آیا ہے - صرف یہی ایک صورت موہوم سی معلوم ہوتی ہے باقی تمام تطبیقیں بے اصل ہیں —

و قصۂ بہرام و فرسی وغیرہ) پہلوی میں مذہبی قصے مثلاً مز دک نامہ - ۔ جعلی قصہ یونانی " سکندر نامہ " منسوب " بہ کالستنس " جو یونانی سے سریانی میں اور سریانی سے پہلوی میں ترجمہ کیا گیا ہے اور بظاہر ساسانیوں کے آخری عہد میں ایران میں ترویج پا یا - " ہندی " حکایتیں جو پہلوی میں ترجمہ ہوی تھیں (مثلاً کلیلہ و دمنہ اور بازی شطرنج کی تفصیل اور حکایت بلاش بن فیروز و دختر پادشاہ ہند وغیرہ) " ساسانی " پادشاہوں کے کارنامے (مثلاً کارنامۂ اردشیر بابکان و کارنامۂ نوشیروان) رومی اور سریانی قصے (مثلاً قصۂ یولیانوس و یوویانوس (ژولیان و ژویان) اور بعض دوسری روایتیں جیسا کہ سکندر کا مکے تو جانا —

قومی داستان کی تنظیم اور اس کی موجودہ صورت اور اس کے کتابی ماخذ

اس میں شک نہیں کہ ساسانیوں کے عہد میں خصوصاً ان کے آخری زمانے میں متعدد تاریخی اور داستانی قصے کہانیاں، مذہبی رویتوں کی کتابیں موجود تھیں اور ملی داستان کی ترتیب نے موقع پر ان کو کام میں لایا گیا - ہم چند کتابوں کے نام صرف اس وجہ سے جانتے ہیں کہ وہ یا تو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے قبضے میں تھیں یا اُن کا ذکر قدیم عربی کتابوں میں پایا جاتا تھا یا یہ کہ ان کا ترجمہ عربی و فارسی میں کیا گیا تھا اکثر ترجمے بھی مفقود ہوگئے اور صرف ان کے نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں) یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ عین پہلوی متن کی کوئی کتاب سوائے " کارنامۂ اردشیر بابک " اور " بادگار زاسپرم زریر " کے آج تک نہیں ملتی - وست + نے اپنی فہرست میں جو ۹۳ پہلوی کتابوں کے نام

---

* اسلامی عہد میں سکندر کے متعلق جو روایتیں رواج پائیں اور جن کو فردوسی اور نظامی نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ نظم کیا ہے ایک جعلی کتاب پر مبنی ہیں جو مصر میں تاریخ اسکندر کے نام سے شائع ہوی اور کالستنس کی جانب منسوب کردی گئی۔ اور درحقیقت یہ وہ " سکندر نامہ " جو کالستنس نے یونانی زبان میں لکھا تھا وہ تو دنیا سے نا پید ہوگیا بعد میں مصری سکندر نامے کا ترجمہ پہلوی اور سریانی میں ہوا جس کو تمام عربی اور فارسی مورخین نے سکندر کے متعلق اپنی معلومات کا ذخیرہ قرار دیا —

† Grundriss der Iranieshn philogloie article on " Avesta " Vol. II p . .

گنوائے ہیں ۔ان میں سے اکثر ساسانی زمانے کے بعد کی لکھی ہوئی ہیں اور ان میں سے بھی صرف گیارہ ہی غیر مذہبی ہیں ۔ ایرانی تاریخ کی پہلوی زبان میں تالیف کی جو اسلام کے بعد کے مؤلفین کا اساسی ماخذ ہے اور شاہنامہوں کی کیفیت بیان کرنے سے پہلے ایک مختصر فہرست ان چند پہلوی کتابوں کی دی جاتی ہے جو ساسانیوں کے عہد میں موجود تھے اور اب صرف ان کے نام عربی ترجموں کے توسط سے ملتے ہیں —

"کتاب الفہرست" (تالیف ابوالفرج محمد بن اسحق بن ابی یعقوب الندیم المعروف بہ وراق بغدادی متوفی سنہ ۳۸۵) میں جو سنہ ۹۷۷ کی تالیف ہے قدیم ایرانی کتابوں کے نام پائے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کا ترجمہ عربی میں ہوچکا ہے اور بعض کا اصل متن بھی چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یعنی اس زمانے میں جب کہ نظم شاہنامہ فردوسی لکھی گئی موجود تھا ان کتابوں کے نام یہ ہیں :—

(۱) کتاب مانی و خصوصاً " شاپور کان "
(۲) و کتب خلفای او
(۳) کتاب آئین نامہ
(۴) کتاب کلیلہ و دمنہ
(۵) کتاب مزدک نامہ
(۶) کتاب ہزار افسان
(۷) کتاب ہزار داستان
(۸) کتاب سند باد
(۹) کتاب قصہ بہرام چوبین
(۱۰) کتاب التاج
(۱۱) کتاب عہد اردشیر
(۱۲) کتاب الادب الکبیر (ماقر احسیس)
(۱۳) کتاب الادب الصغیر
(۱۴) کتاب التیمیہ فی الرسائل
(۱۵) کتاب الزہر و برداسف
(۱۶) کتاب الصیام والاعتکاف
(۱۷) زیج الشہریار
(۱۸) اختیار نامہ
(۱۹) کتاب شہیرک در علم طب
(۲۰) کناش تیا دورس

(۲۱) کتاب یوسفاس و فسلرس
(۲۲) کتاب حمد حسروا (؟)
(۲۳) کتاب الحرس (؟)
(۲۴) افسانه وگشت گذار (خرافه و فزهه)
(۲۵) کتاب خرس و روباه
(۲۶) کتاب روز به یتیم
(۲۷) کتاب مشک زناله و شاه زنان
(۲۸) کتاب نمرود و پادشاه بابل
(۲۹) کتاب خایل و دعد
(۳۰) کتاب رستم و اسفندیار
(۳۱) کتاب شهر براز با اپرواز
(۳۲) کتاب کار نامه انوشیروان
(۳۳) کتاب دارا و بت زرین
(۳۴) کتاب بهرام و نرسی
(۳۵) کتاب انوشیروان
(۳۶) کتاب بنیان دخت
(۳۷) کتاب بنیان نفس
(۳۸) کتاب بهرام دخت
(۳۹) کتاب الفال
(۴۰) کتاب الاختلاج
(۴۱) کتاب آئین چرگان بازی
(۴۲) کتاب آئین تیراندازی بهرام گور یا بهرام چوبین

(۴۳) کتاب فن جنگ و آداب سواران و چگونه پادشاهان چهار حصه مملکت را برادران می سپرد داده
(۴۴) کتاب آداب جنگ و قلعه کشائی وشهر گیری و کمین گذاشتن و جاسوسی فرستادن و اسلحه خانه تعبیه کردن
(۴۵) کتاب معالجه چهار پایان واسب وأشترو گاو و گوسفند و شناختن قیمت آنها و داغ کردن آنها
(۴۶) کتاب بیطاری
(۴۷) کتاب باز شکاری
(۴۸) کتاب زادانفرم در تر بیت پسرش
(۴۹) کتاب مهراك و حسیس موبدان به بزر جمهر بن بختگان
(۵۰) کتاب وصیت نامهٔ نوشیروان به پسرش هرمز و جواب هرمز
(۵۱) کتاب وصیت نامه نوشیروان باهل بیت خود
(۵۲) کتاب وصیت نامه اردشیر بابکان به پسرش شاپور
(۵۳) کتاب موبدان موبد در حکمت و پند و آداب

(۵۴) کتابے دیگر در وصیت نو شیروان (۵۸) کتاب نوشیروان ہمزرگان ملت
بہ پسرش کہ ترجمۂ عربی آں بعین البلاغۃ در تشکر
موسوم بود (۵۹) کتاب سیرت نامہ تالیف دھاقون
(۵۵) کتاب نامہ نوشیروان ہبرزبان و بن فرخ زاد در اخبار و احادیث
جواب او (۶۰) زراوہ؟
(۵۶) کتاب انچہ بحکم اردشیر از کتاب (۶۱) پیران ویسک نامک
خانہ ہا استخراج شد از انچہ (۶۲) کتاب شطرنج
حکمائے بابسیاست سلکداری نوشتہاند (۶۳) کتاب سکیسران *
(۵۷) کتاب سکرسوی بن مردیوہ بہ (۶۴) کارنامہ
ہرمز بن نوشیروان و نامۂ نوشیران (۶۵) کتاب تصاویر سلاطین ساسانی
بہ جواسب (؟ جاماسپ) و جواب او (۶۶) کتاب کاروند
(۶۷) نامہ تنسر †

یہ ان کتابوں کی فہرست کا خلاصہ ہے جن کے نام ہم تک پہنچے ہیں اور ان میں کی اکثر کتابیں عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں - اگر کوئی شخص اسلام کی ابتدائی صدیوں کی عربی کتابوں کی تحقیق کرے تو شاید اس فہرست میں اضافہ کرسکے قوی گمان ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ وہ ایرانی رزمیہ و بزمیہ قصے

---

* اس کتاب متعلق مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ یہ ایران و توران کی جنگ کے احوال پر مشتمل تھی اور ایرانی اس کتاب کی بڑی عظمت کیا کرتے تھے - چنانچہ ابن المقفع نے اس کا فارسی قدیم سے عربی میں ترجمہ کیا ہے -

† نامۂ تنسر اردشیر بابکان نے طبرستان کے شہزادے کے نام جو خط کہ ہربد ہر بدان تنسر سے لکھوایا تھا اس کا بھی ابن المقفع نے عربی میں ترجمہ کیا ہے - موجودہ زمانے میں تنسر نامے کا فارسی میں ترجمہ ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان میں پایا جاتا ہے —

بھی پہلوی زبان میں تھے ، جنھیں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عرب و عجم کے شعرا نے نظم کیا ہے - مثلاً وامق و عذرا - ویس و رامین - شاہ بہرام و عین الصیرۃ اور خسرو ان شیریں وغیرہ —

صاحب مجمل التواریخ لکھتا ہے - " اس کے (اردشیر بابکان) پاس جو علم کا زبردست مربی تھا بہت سارے حکما جمع تھے - مثلاً ہرمز آفرید - بہروز - برز مہر و ایزد واد اور یہ سب ہر قسم کی علمی کتابوں کے مصنف تھے - ان کی بہت ساری کتابیں عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں " ابتک جن ایرانی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے انکا تعلق ملی داستان سے براہ راست نہیں تھا لیکن اب جن کتابوں کا ذکر ہوگا وہ براہ راست ملی داستان سے متعلق ہیں —

خدای نامہ ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ، ایک نہایت اہم کتاب دستیاب ہوئی ہے جو ساسانیوں کے آخری زمانے کی تالیف ہے بلکہ اس زمانے کی مابقیہ کتابوں میں اس کا پایہ نہایت بلند ہے اور جس کا تعلق ہمارے موضوع سے براہ راست ہے - یہ کتاب ایرانی بادشاہوں کی تاریخ ہے جس کی موجودگی کا ثبوت ہمیں کئی ایک * دلائل سے ملتا ہے اور جس کا نام و نشان بھی صحیح طور

---

* عربی اور فارسی زبان میں جو کچھ مواد اب قدیم ایرانی داستان کے متعلق موجود ہے اور قدیم ایرانی ملکی ماخذ سے مستنبط ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک ایسے ماخذ یا کتاب سے لیا گیا ہے جو اور دوسری کتابوں کا بھی ماخذ رہ چکی ہے- دوسری بات یہ ہے کہ خدا ینامہ کے متعلق پرانی عربی کتابوں میں مثلاً الفہرست ، تاریخ حمزہ بن حسن اصفہانی اور مسعودی میں بیشمار ذکر آیا ہے اور تیسری دلیل یہ ہے کہ خود شاہ نامے میں ساسانیوں کے زمانے کا ایک قدیم شاہنامہ یا وہ کتاب جو سیر الملوک کا ماخذ رہ چکی ہے بصراحت ذکر موجود ہے - فردوسی خود لکھتا ہے :

یکے نامہ بد از گہ باستان فراوان بد و اندرون داستان
پراگندہ دو دست ہر موبدے از و بہرہ بردہ بطرفے

پر ہم تک پہنچتا ہے - یہ کتاب "خدای نامک" (یا خدا نامہ) پہلوی ہے، جو بہ ہمہ اوصاف شاہنامہ ہے - شاہنامہ فردوسی کے بایسنقری * مقدمے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ساسانی بادشاہ پچھلے ایرانی داستانی بادشاہوں کے حالات اور واقعات کی ترتیب اور تہذیب میں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور خصوصاً خسرو انوشیروان (۵۷۹ - ۵۳۱ میلادی) نے تو اس طرف خاص توجہ مبذول کی تھی - مقدمۂ مذکور اگرچہ (سنہ ۸۲۹) میں لکھا گیا ہے اور جس کے اکثر بیانات لائق اعتماد نہیں ہیں مگر شاہنامے کے سب سے پہلی دفعہ ترتیب پانے کے متعلق جو کیفیت اس میں درج ہے بظاہر نہایت قدیم ماخذ سے لی گئی ہے اور بیحد قرین اعتماد نظر آتی ہے اس مقدمے کے مندرجات کے مطابق سب سے پہلے نوشیرواں کے حکم سے تمام ایرانی ممالک سے قدیم بادشاہوں کی تاریخ اور حالات جمع کئے گئے :—

"و ہمیشہ دنیا کے مختلف حصوں میں لوگوں کو بھیجتا کہ وہ ہر ملک میں قدیم ایرانی بادشاہوں متعلق کے جو روایتیں پائی جاتیں اُن کی تحقیق کرکے جمع کریں اور اس کا ایک نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کریں" —

خداینامہ کی بنا اور نوعیت

لیکن ایران کی ایک مکمل اور مبسوط تاریخ کی ابتدا (شاہنامے کے مقدمے کے قول کے مطابق جو نوشیرواں کے خزانے کی متفرق کتابوں سے واقعات جمع کرکے لکھا گیا ہے) یزدجرد سوم (۱۰ - ۳۱) کے زمانے میں ہوئی ہے - یعنی درحال سنہ ۱۱ ہجری، سنہ ۱۵ ہجری کے درمیان میں ہوئی ہے، جبکہ یزدجرد سوم تمام ایران کا حقیقی حکمراں تھا - اس کے حکم سے ایک دہقان † عالم نے جس کا نام دانشور تھا، ان تمام قدیم نسخوں سے جو

---

* شہزادہ بایسنقر جس کی وفات سنہ ۸۳۸ ھ میں واقع ہوئی، امیر تیمور گورگانی کا پوتا تھا اسی شاہنامہ کی تصحیح کا خیال پیدا ہوا اور جو مقدمہ کہ آج کل مروجہ شاہناموں کی ابتدا میں پایا جاتا ہے، اسی کے حکم سے لکھا گیا —

† ساسانی دور میں اور اس کے دو تین صدی بعد بھی لفظ دہقان سے مراد زمیندار اور صاحب املاک اور شرفا تھے جو در حقیقت قومی روایتوں کے برقرار رکھنے والے اور ملک کے محسن و بانی تھے —

اس وقت موجود ہیں ' ایک کتاب تیار کی جو بظاہر یہی خدا ینامہ پہلوی ہے - اس کتاب میں کیومرث سے خسرو پرویز * کی سلطنت کے آخر زمانے تک کے حالات لکھے گئے ہیں اور یہی کتاب اسلامی زمانے کی عربی سیر الملوک اور فارسی شاہنامہوں کی بنیاد ہے - یقیناً یہ کتاب تحریری اسناد پر مبنی ہے ورنہ اس قسم کے کتابی مواد کے بغیر ایسی کتاب کا جو اس قدر مرتب اور معین تفصیلات پر مشتمل ہے زبانی روایت سے تالیف پانا ممکن نہیں - اُس بات کی سنہ میں کہ یہ اہم کتاب یزدجرد سوم † آخرو ساسانی بادشاہ کے زمانے میں تالیف ہوئی ہے بہت ساری دلیلیں اور قرینے موجود ہیں - شاہنامے کے ایک پرانے دیباچے میں جو بایسنقر کے زمانے کے پہلے لکھا گیا ہے ایرانی تاریخ کے ترتیب دینے والوں میں ایک نام فرخان (یا فرخانی) بھی ہے جو اسی یزدگرد بن شہریار کے زمانے کا ایک موبد تھا اور اس مقدمے کے دوسرے نسخوں میں راسین کا نام بھی لکھا ہے جو اس بادشاہ کے درباریوں میں تھا - مختلف ذرایعے سے جس قدر بھی خداینامہ پہلوی کے اصلی مضامین کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خداینامہ کے بعض اصلی اور قدیم ٹکڑے ابھی تک محفوظ ہیں - مثلاً بعض عربی کتابیں جو تاریخ ایران پر لکھی گئی ہیں ' ان کی مطابقت شاہنامۂ فردوس کے ان

---

* پروفیسر نولدکی نے اپنی تحقیقات کے ضمن میں یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تاریخیں یا کتابیں جو اسوقت ہمارے ہاں موجود ہیں ' ان میں اور داستان میں کیومرث کے زمانے سے لیکر خسرو پرویز تک مطابقت پائی جاتی ہے مگر اس عہد کے بعد اختلاف بھی پایا جاتا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں سے ماخذ بدل گیا تھا —

† یزدجرد سوم جو خسرو پرویز کی نسل سے تھا نہ کہ شہرویہ کی نسل سے اس نے جا بجا خسرو پرویز کا نام نہایت احترام سے لیا ہے اور شہرویہ پر لعن و طعن کیا ہے -

حصوں سے ہوتی ہے جو در حقیقت خدایانامہ پر مبنی ہیں اور یہ مماثلت عربی ترجموں کے واسطے سے نہیں بلکہ خالص فارسی ترجموں کے ذریعے سے ثابت ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مضامین نہایت شجاعت انگیز اور وطن پرستانہ ہیں اور اس میں حکمراں خاندان کی طرفداری اور غاصبین اور باغیوں پر لعن طعن ہے - اس کتاب کی طرز تحریر رزمی اور رجزی ہے اور بادشاہوں کی تخت نشینی کی تقریروں، ادیبانہ خطبوں، سیاسی رمیتوں اور ذاتی نصیحتوں سے بھری ہوئی ہے - جس میں عبارت آرائی اور سخن پردازی سے جو قدیم سے ایرانیوں کو مرغوب رہی کام لیا گیا ہے - اور خصوصاً اس میں بہت سے اخلاقی خطبے پائے جاتے ہیں —

اس کا پہلوی اصلی نسخہ

تاریخ ایران کے پہلوی نسخہ کا نام یعنی " خواتای نامک " جو بعد میں خدایانامہ سے موسوم ہوا عربی کتابوں کے مؤلفین کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اور جس کا مطلب نامۂ خداوندان یعنی نامۂ خسروان ہے - بعد میں لفظ خدا کے استعمال سے بچنے کے لئے اس کا نام شاہنامے سے تبدیل ہوگیا - اس کتاب کو شروع میں عبداللہ ابن مقفع نے دوسری صدی کے نصف اول میں عربی میں ترجمہ کیا - اور اس کا نام " سیر ملوک الفرس " رکھا اور اسی کتاب کے واسطے سے ایرانی تاریخ اور سلاطین کی اساطیری داستان کو مسلمانوں میں شہرت حاصل ہوئی اور عربی ادبیات میں اس کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی یہاں تک کہ مغرب و مصر و حجاز کے دور دراز مقامات تک پہنچی اور ایرانی قصے عربوں میں اس قدر رائج ہوگئے کہ عرب کے شعراء نے بھی اپنے کلام میں ان کو جگہ دی —

---

* مثلاً ابونواس نے جو قبیلۂ نزار کی ہجو لکھی اور ابوتمام نے افشین کی مدح میں فحطان اور افریدون کا نام لیا ہے —

خدائنامہ کے علاوہ دوسری پہلوی کتابیں

یقیناً خدائنامہ کے علاوہ اور بھی تاریخی کتابیں پہلوی میں تھیں جو خدائنامہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتی تھیں مگر ساسانیوں کے حالات میں مستقل طور پر لکھی گئی تھیں - اس کی دلیل یہ ہے کہ قدیم عربی تاریخی کتابوں میں اور اسی طرح شاہنامے میں ایرانی تاریخ کے متعلق بہت ساری ایسی روایتیں لی جاتی ہیں جو ابن المقفع کی سیرالملوک کی روایتوں سے بالکل مختلف ہیں - اس کے علاوہ تاریخ طبری میں اردشیر بابکان اور آخری ساسانی بادشاہوں کے احوال میں نہایت صحیح واقعات پائے جاتے ہیں ' جو قطعاً خدائنامہ سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ خدائنامہ کو چھوڑ کر اور دوسرے قدیم پہلوی ماخذ سے لئے گئے ہیں - اور بعض پہلوی قصے اور افسانے ایسے بھی ہیں جن کے مضامین کا کچھ حصہ خدائنامہ کی تالیف کے بعد ایران کی تاریخ میں داخل ہوگیا - مثلاً (۱) کارنامہ اردشیر بابکان جس کا اصل متن ابھی تک موجود ہے - اور (۲) بہرام چوبین والا مبسوط تاریخی قصہ جس کو جبلہ بن سالم نے عربی میں منتقل کیا تھا اور جس کا مواد ہمیں دوسری عربی تاریخی کتابوں اور طبری کے فارسی ترجمہ اور شاہنامے سے دستیاب ہوتا ہے - غالباً یہی وجہ ہے کہ عربی ادبیات میں بہرام چوبین کا نام زیادہ تر مشہور ہوگیا - (۳) غالباً کتاب قصۂ رستم و اسفندیار " بھی مستقل طور پر موجود تھی - اس کا بھی ترجمہ جبلہ مذکور نے کیا ہے - اور اسی طرح " نامہ و دستہ " پہلوی " سندباد " پہلوی اور " یادگار زریران " اور " وزرگ نامہ " بھی مستقل وجود رکھتے تھے - غالباً چند اور قصے اور ادب کی کتابیں بھی جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے خدائنامہ کی تالیف کے زمانے میں موجود تھیں - یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ بہت سارے عاشقانہ قصوں اور فارسی و عربی رزمی داستانوں کا اصلی متن (اگرچہ مختصر طور پر) کتابی

صورت میں ساسا نہیوں کے عہد میں موجود تھا یا یہ کہ انکے مطالب زبان زد عام تھے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں (دوسری صدی سے چوتھی صدی تک) میں نظم یا نثر میں لکھی گئیں اور ایرانیوں میں مقبول ہوئیں۔ قبل اسلام کی داستانیں پہلوانوں کے حالات اور ایران و ہند کے قدیم بادشاہوں کی روایتیں ان کا موضوع و مبحث ہے مثلاً قصہ ویس و رامین * — وامق و عذرا †

---

* فخرالدین اسعد گرگانی (سنہ ۴۴۰) کا یہ منظوم فارسی قصہ بتیناً پہلوی میں تھا چنانچہ اس کے متعدد میں کہتے ہیں: —

ولیکن پہلوی باشد زبانش ندانند ہر کہ برخواند بہانش

مگر یہ معلوم نہیں کہ اس شعر میں پہلوی سے مراد آج کل کی اصطلاحی پہلوی ہے یا گیا۔ لیکن کتاب کا مضمون (یعنی بھائی کا عشق بہن سے) دیکھنے سے یہ بات محال معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسلام کے بعد لکھی گئی ہو۔ مجمل التواریخ میں لکھا ہے کہ "شاپور اردشیر کے زمانے میں ویس و رامین کا قصہ واقع ہوا"۔

† اگرچہ اس قصے کا نام عربی ہے لیکن بظاہر یہ نام ایرانی نام کا ترجمہ ہے۔ دولت شاہ سمرقندی کے قول کے مطابق قدیم وامق و عذرا "نوشیرواں کے نام پر اس کے حکم سے لکھی گئی تھی" —

نیشاپور میں عبداللہ بن طاہر امیر خراسان (۲۱۳ - ۲۳۰) کے پاس پیش کی گئی اور اس نے اس کے تلف کردینے کا حکم دیا۔ عنصری نے اس کتاب کو نظم کیا تھا لیکن اس کا نسخہ اب موجود نہیں ہے اور صرف اس کا ترکی ترجمہ ہے جسے ایک ترکی شاعر مخلص بہ لامعی نے جس کا سنہ ۹۳۷ ھ میں انتقال ہوا عنصری نظم سے ترکی میں ترجمہ کیا تھا کتاب۔ الفہرست میں وامق و عذرا کی تالیف نہ کہ ترجمہ سہل بن ہارون کی طرف جو خلیفہ مامون عباسی کا کتاب دار اور پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا منسوب کی گئی ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سہل بن ہارون نے جیسے مصنفین قدیم ایرانی قصوں کو اپنی طرف سے تازہ کیا کرتے تھے اور کتابی شکل میں لاتے تھے اور پھر ایرانیوں کی طرف منسوب کردیتے تھے۔ چنانچہ جاحظ کا یہ قول ہے:

باقی نوٹ بر صفحۂ آئندہ

خسرو شیریں و فرہاد * - قصۂ بہرام گور - داستان گرمتاسف - قصۂ فریمان و سلم و کیقباد و افراسیاب - قصۂ کی شکن - قصۂ آغش و ہادان † - قصۂ لہراسپ ‡ - داستان شہر براز $ - قصۂ زال و رودابہ و بیژن و منیژہ قصۂ شاد و بہرو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ بہت ساری کتابیں جو قدیم ایرانیوں کی طرف منسوب کردی گئی ہیں وہ دراصل بعد میں لکھی گئیں اور یہ بتلانا مشکل ہے کہ واقعاً ان کی کوئی پہلوی اصل بھی تھی - ممکن ہے کہ یہی حالت وامق و عذرا کی ہو —

* خسرو سے مراد خسروپرویز ہے اور شیریں یا (سیرا) خسرو کی ارمنی عیسوی عورت تھی - اور فرہاد خسرو کا سپہ سالار تھا جو شیریں کے حسن کے چرچے سن کر اس پر عاشق ہوگیا تھا - یہ تاریخی قصہ نہیں ہے - لیکن جاحظ کی کتاب التحاسن والاضداد میں بعض حکایتیں موجود ہیں - ممکن ہے کہ ابتدا میں اس کا پہلوی متن بہت ہی مختصر طور پر پایا جاتا ہو —

† موخرالذکر تین داستانیں اور بعد کے مذکورہ در قصے مجمل التواریخ میں پائے جاتے ہیں - اس سے اور دوسرے قرائن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ فردوسی کے شاہنامے سے پہلے اصل پہلوی میں موجود تھے اور ان کی صورت ان قصوں کی طرح نہیں ہے جو فردوسی کی اتباع میں لکھے گئے - مثلاً فراموز نامہ - سام نامہ - جہانگیر نامہ - برزو نامہ - بہمن نامہ - یا نوگشتسپ نامہ - داراب نامہ - قہرمان نامہ - ہوشنگ نامہ - فغفور نامہ - طہمورث نامہ - قران حبشی اور حکایت جمشید اور قصۂ کوش پیل دندان

‡ یہ قصہ اشکانیوں کے زمانے میں لکھا گیا —

§ مسعودی کتاب التنبیہ والاشراف میں اپنی ایک تالیف کا ذکر کرتا ہے جو مقاتل فرسان العجم کے نام سے موسوم ہے جس میں شہر براز ساسانی بادشاہ کے قصے اور اس کے قتل کی کیفیت لکھی ہے —

عین الحیوۃ • قصۂ شرویں و خرین † - قصۂ طلسند و کو ' حکایت شطرنج وغیرہ باقی دارد

• مجمل التواریخ میں لکھا ہے کہ "بہمن بن گشتاسپ کے زمانے میں شاد بہر (شاہ پور = شاپور ؟) و عین الحیوۃ واقع ہوے ہیں" -

† یہ مخلوط افسانہ برنوان کے بیٹے شرویں کے حالات پر مبنی ہے - جو بلوک دشتوہ کا رئیس تھا اور جو یزد جرد اول کی جانب سے آرکا دیوس اسپرا طور دوم (۳۹۵ - ۴۰۸) کی وصیت کی تعمیل میں اس کے نابالغ بیٹے تئو دئوس دوم (۴۰۸ - ۴۵۰) کی ولیعہد کے لئے بیز نطین بھیجا گیا تھا بیس سال تک یونان کی حکومت کو سنبھالے رہا -

غزل

از

علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طبا طبائی)

من و نگاہ تو با کیف مے چہ کار مرا
من وبہار تو با فصل دے چہ کار مرا

بغیر صور سرافیل محشرست ایں جا
فغاں چو خیز کم از دل بہ نے چہ کار مرا

من و ثنا گری لذت جفاے حبیب
بہ شکوۂ ستم پے بہ پے چہ کار مرا

فریب عشوۂ دنیا نخوردہ ام نخورم
بناز و غمزۂ بیجاش ہئے چہ کار مرا

بمن چو دوست شدی پس ضمان من بر تست
چنیں مگوکہ بہ کردار وے چہ کار مرا

جزاے ترک وفا ابن سعد میدا نست
ولے نہ گفت کہ با ملک رے چہ کار مرا

بلند شد علم مہر و شہنم از جا شد
کہ با مسابقۃ ظل و فے چہ کار مرا

زبیخودی بگز شتم ز لا مکان و مکان ق
بفکر ہستی لاشے و شے چہ کار مرا

بظل معدلت خسرو دکن اے نظم
بعدل و سطوت کسری و کے چہ کار مرا

خلدالله ملکه

وظیفہ ام رسد ازخوان نعمت عثماں
بوصف حاتم طائی و طے چہ کار مرا

تہذیب و تمدن

مترجمہ

(جناب معتمد ولی الرحمن صاحب ایم - اے مددگار پروفیسر فلسفہ
کلیہ جامعہ عثمانیہ)

سلسلہ مضمون نیویارک کے سپیریم کورٹ کے ایک جج (وزلی ' او' ہاورڈ ') کا لکھا ہوا ہے ' جس کو میں نے اردو میں منتقل کیا ہے - جن خیالات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے وہ عجیب و غریب ضرور ہیں ' لیکن نئے نہیں - فطرت انسانی کی بوالعجبوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ اپنی موجودہ حالت میں کبھی خوش نہیں رہتی - اس کو ہمیشہ اپنی موجودہ حالت کے علاوہ کسی اور حالت کی خواہش رہتی ہے - اسی تلاش میں بعض فطرتیں تو مستقبل کی طرف انکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہیں ' اور اس کو اپنے لئے بہتر سمجھ کر اس کے حصول کی کوشش کرتی ہیں ' بعض پیچھے پھر کر دیکھتی ہیں ' اور کف افسوس ملتی ہیں ' کہ جو کچھ گزر گیا وہ بہت بہتر ہی تھا - ان کو مستقبل سے کسی بہتری کی امید نہیں ہوتی - ان صورتوں میں مقدم الذکر رجائیت کہلاتی ہے اور موخرالذکر قنوطیت - قنوطیت مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہوتی ہے اور تہ از کماں جستہ کو واپس لانے کی ناکام

کوشش کرتی ہے - ہم کو آج کل اپنے زمانے میں ہرطرح کے عیوب دکھائی دیتے ہیں - '' اگلے وقتوں کے لوگ '' ہمارے نزدیک خوبیوں کے مجسمہ تھے - لیکن بعینہ یہی خیال '' اگلے وقتوں کے لوگوں '' کا خود اپنے زمانے کے متعلق تھا - مثلاً یوں سمجھیے کہ مغربی عورتوں کی نیم برہنگی زمانۂ حال کے عیوب میں سے ایک زبردست عیب ہے - لیکن '' اگلے وقت '' کی عورت کا کیا حال تھا ؟ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعینہ یہی شکایت پلو ٹارک کو اپنے زمانے کی عورتوں سے ہے ارسطو نے جو لباس اپنے زمانے کے سپارٹا کی عورتوں کا بیان کیا ہے وہ بعینہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ان مغربی عورتوں کا جن کو انگریزی میں Flappers کہا جاتا ہے - وہی گھٹنے سے اونچا لہنگا اور وہی سینہ اور کمر کھلا ہوا کرتا ! اس نے بھی اپنے زمانے کو بہت برا بھلا کہا ہے اور زمانہ گزشتہ کو سراہا ہے - مختصر یہ کہ اپنے زمانے کی مزمت اور گزشتہ زمانے کی مدحت کا یہ سلسلہ اس زمانے پر جا کر ختم ہوتا ہے جب انسان موجودہ انسان نہ تھا ' بلکہ جنگل کے جانوروں میں سے ایک جانور تھا ' اور جب اس کو اچھے یا برے کی تمیز نہ تھی ! اگر اس کو بھی تمیز ہوتی تو وہ بھی یہی چلاتا کہ کہ گزرا ہوا زمانہ بہت بہتر تھا - وہ زمانہ کیا ہوا اس کا اندازہ قارئین بطور خود کر لیں !

یہی خیالات ہیں جو اس قسم کے مضامین کے محرک ہوتے ہیں اس مذہب فکر کے جراثیم میرے نزدیک یونان کے فرقہ کلبیہ میں تلاش کئے جانے چاہئیں - زمانہ حال نے بھی بہت سے سرگرم اور پر جوش وکلاء اس مذہب کے پیدا کئے ہیں - روس میں کونٹ ٹالسٹائی اور لنہلس ' انگلستان میں رسکن اور برگ ' فرانس میں روسو امریکہ میں تھرو ' ہندوستان میں مہاتما گاندھی یہ چند بڑے بڑے مفکرین ہیں جو تہذیب و تمدن کے دشمن ہیں - ان ہی میں اب مصنف ہذا کو بھی شریک کرلیجئے ان لوگوں کے خیالات اور ان کی تعلیمات پر ہر زمانہ میں مذاق

ارایا گیا ہے اگرچہ خود مذاق اڑانے والے اور اعتراض کرنے والے جب ایک عامی (یعنی غیر فلسفی) کی جون میں ہوتے ہیں تو بعینہ یہی کہا کرتے ہیں - کیا یہ ریاکاری اور دورخی (اور واقعہ تو یہ ہے کہ ہر قسم کی ریاکاری اور دورخی !) تہذیب و تمدن کا نتیجہ نہیں ؟ مجھے تو ان لوگوں پر اس وقت ہنسی آیا کرتی ہے جب یہ ایک طرف تو تہذیب وتمدن کی حمایت میں دھواں دھار تقریریں کرتے اور مضامین لکھتے ہیں ، اور دوسری طرف حریت وآزادی کو '' پیدائشی حق '' کہ اس کے علمبردار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں - کیا تہذیب وتمدن ہمارے اس '' پیدائشی حق '' کا دشمن نہیں ؟ کیا ان دونوں آگ اور پانی کا تعلق نہیں ؟ کیا غیر مہذب و غیر متمدن مہذب و متمدن کے مقابلہ میں زیادہ آزاد نہیں ہوتا ؟ کیا یہ واقعہ نہیں ، کہ جوں جوں تہذیب و تمدن ترقی کرتا جاتا ہے ، آزادی اسی طرح سلب ہوتی جاتی ہے ؟ تہذیب و تمدن کا جو اثر انسان کے جسم پر پڑتا ہے اس کا اندازہ ایک '' وحشی '' گنوار اور ایک '' مہذب '' نواب کے مقابلے سے بآسانی کیا جاسکتا ہے - اور جو اثر کہ ذہن پر پڑتا ہے وہ ایک جاہل ، مگر راسخ الاعتقاد مسجد کے ملاں اور ایک عالم ، مگر مشکک و مرتاب ، فلسفی کو ایک دوسرے کے سامنے رکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے - ان ہی دونوں مقابلوں سے مسرت و اطمینان کی اس مقدار کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے جو علی الترتیب وحشت و تہذیب سے پیدا ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے ، کہ علم حجاب اکبر ہے اور ہماری ذہنی کوری تہذیب و تمدن کا نتیجہ وحشی آنکھیں کھول کر نیچر کو دیکھتا ہے ، اور مہذب و متمدن دیکھتے وقت ،، اپنی آنکھوں کے سامنے گرد و غبار کا طوفان اٹھاتا ہے ، اور پھر شکایت کرتا ہے ، کہ وہ دیکھ نہیں سکتا ،، - پھر لطف یہ کہ اس شکایت کے باوصف وہ تمام باتیں اس انداز سے بیان کرتا ہے ، گویا اس نے سب کچھ دیکھا ہے !!

اب قارئین اس مضمون کو خود ملاحظہ فرمائیں ، اور اس کی

صحت و غلطی کا بطور خود اندازہ کرلیں - اگر ان کو ان خیالات سے اختلاف بھی ہوگا ، تب بھی یہ ان کی دلچسپی کا باعث تو ضرور ہونگے —

معتضد ولی الرحمن

انسان فی الاصل وہ نہ تھا جو ' وہ آج ہے - ایک لاکھہ یاشاید اس سے بھی زیادہ سال گزرے کہ اس زمین پر پہلے پہل اس کی شکل دکھائی دی اس وقت یہ شکل و صورت میں عادات و خصائل میں ' رفتار و گفتار میں ' مقاصد واغراض میں مختصر یہ کہ ہر لحاظ سے بالکل مختلف تھا - ابتدا میں تو یہ جنگلوں میں درختوں پر رہتا تھا ' اور وہیں یہ ریلگتا بھی تھا ' چڑھتا بھی تھا ' چھپتا بھی تھا ' شکار بھی کرتا تھا ' اور سوتا بھی تھا ' پھر کئی قرنوں کے بعد وہ زمین پر اترا اور درختوں کی بود وباش ترک کی - اب وہ خطرے کے وقت غاروں اور کھوؤں میں پناہ گزیں ہوتا تھا اور بھوک کے وقت گوشت نوچتا اور کھاتا تھا - یہی وہ وقت ہے ' جب اس نے سیدھا کھڑا ہونا سیکھا ہے —

جن جاندار اور رینگنے والی اشیا پر وہ غلبہ پاسکتا تھا ' وہ اس کی خوراک بنتی تھیں - چنانچہ کچھوے مکوڑے مینڈک ، مچھلی سانپ ' گدھے ' پرندے ' کتے چھپکلی ' یہاں تک کہ دوسرے اشخاص ' سے وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا - صدیاں اور قرن گزر گئے ' لیکن وہ اب بھی دیگر بہائم کی طرح بسیار خور ' شہوت ران ' شکار پیشہ ' تند خو ' اور قتل و غارت کا عادی تھا - وہ آوارہ گردی کرتا تھا ' چوراتا تھا ' لڑتا تھا ' تکلیفیں دیتا تھا ' مارتا تھا ' اور مارا جاتا تھا - اب تک وہ آگ سے واقف نہ تھا - ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی یہ ابتدائی اور وحشی انسان

سرد ی کا تمام موسم پہاڑوں کی کھوؤں میں کانپ کانپ گزارتا تھا آخر ایک دن جنگل میں بجلی گری ' جس کی وجہ سے خشک پتوں نے آگ پکڑلی اب انسان اور اس کے ساتھی انسان نما بندر ' محو حیرت ہو کر اس کے ارد گرد جمع ہوے ' اور آگ تاپنے لگے - اس حالت میں انسانوں اور بندروں میں تمیز بمشکل ہو سکتی تھی —

ان انسانوں میں ایک نے آگ چھوا ' اور اس کی جلن اور تپش محسوس کی - لیکن تھوڑی ھی دیر بعد آگ بجھ گئی - پھر کئی صدیوں کے بعد انسانوں اور بندروں کی ایک دوسری نسل نے اسی طرح آگ سے اپنے آپ کو گرم کیا - لیکن پہلی آگ کی طرح یہ بھی کچھہ دیر بعد سرد ہو گئی اور پھر بہت سی صدیاں گزر گئیں اس کے بعد اور بہت سی آگیں لگیں اور بجھیں ' لیکن انسانوں اور بندروں میں سے کسی کی بھی یہ سمجھ میں نہ آیا ' کہ یہ آگ کس طرح محفوظ کی جاے آخر کار ایک اور آگ اسی طرح لگی - اس مرتبہ تمام بندر اور چند انسان کچھہ دیر تک تو اس کی طرف دیکھتے رہے ' اور عجیب و غریب طرح کے منھہ بناتے رہے ' اور پھر بھاگ گئے - تھوڑی دیر بعد وہ اس کو بالکل بھول گئے اپنا پیٹ بھرنے کا سامان کرنے لگے -

لیکن چند انسان وھیں کھڑے رہے اور سوچتے رہے - انہوں آگ بجھتی ہوی دیکھی اور برابر کسی سوچ میں لگے رہے ان کا یہ تمام تفکر خام اور ابتدائی تو ضرور تھا ' اتنا خام اور ابتدائی کہ اس وقت ہم اس کو تفکر کہ ھی نہیں سکتے لیکن بہر کیف یہ تفکر تھا - آخر سوچتے سوچتے ایک انسان (جو بندر تو نہیں تھا لیکن بندر سے مشابہت تامہ رکھتا تھا) کو یہ حیرت انگیز خیال آیا کہ بہت ممکن ہے کہ " شرارزیر خاکستر " پر سوکھی لکڑیاں اور سوکھے پتے ڈالنے سے یہ محفوظ ہوجاے چنانچہ اس نے یہ تجربہ کیا ' اور اسے کامیابی ہوئی - یہ اس زمانے کا سب سے بڑا اور عظیم الشان انکشاف تھا - انسان نے آگ کا اکتشاف کیا —

اس کے بعد انسان نے اور ترقی کی - اس نے اپنے غاروں اور کھوؤں کو ترک

کرکے جھونپڑوں میں رہنا سہنا شروع کیا ' اور اس کے بعد گھروں کی بنیاد ڈالی - اب گویا وہ جانور سے وحشی انسان ' وحشی انسان سے اکھڑ انسان ' اکھڑ انسان سے شکاری انسان ' شکاری انسان سے گلہ بان انسان ' اور گلہ بان انسان سے کاشتکار انسان بن گیا - اس نے بھیڑیوں کو اس طرح سدھایا کہ ان کی حیثیت کتے کی سی ہوگئی ' اور یہی بھیڑئے اس کے ہم صحبت بنے - اس نے گھوڑے پکڑ کر سدھائے اور ان سے باربرداری کا کام لیا - اس نے گاؤں اور شہر آباد کئے اور سڑکیں بنائیں - اس نے پل بنائے اور مندر و معبد کھڑے کئے اور دیوتاؤں ' بہت سے دیوتاؤں ' کی پرستش شروع کردی —

اس نے گیت لکھے اور عشق بازی کی - اس نے اپنے ابنائے جنس پر فوج کشی کی ' اور ان کو قتل و برباد کیا - اس نے لوٹ مار کی ' زنا کاری کی ' آگیں لگائیں ' اس نے بستیاں اجاڑیں ' اور آبادیاں ویران کیں - اس نے دوران خون کا انکشاف کیا ' اور فن طباعت کو ایجاد کیا - اس نے بارود ' بوائلر ' اور برق کو مکتشف کیا - اب حالت یہ ہے کہ وہ ہوا میں ہزاروں میل سفر کرتا ہے ' اور ہر مقام پر وہ تمام دنیا سے بلکہ کرسکتا ہے ' اور تمام دنیا کی باتیں سن سکتا ہے - اس نے بلند ترین پہاڑوں میں سرنگ کھودے ہیں اور عمیق ترین دریاؤں کے نیچے سڑکیں تیار کی ہیں - اس نے وادیوں کو صاف کرکے زرخیز میدان بنایا ہے - اس نے صحراؤں کو سیراب کرکے باغات لگائے ہیں - اس کی ریلیں تمام روئے زمین پر پھیلی ہیں ' اور اس کے قرقزت تمام سطح آب پر پھیلے ہوئے ہیں - اس کے جہاز سمندروں میں اتنا گہرا غوطہ لگاتے ہیں کہ وہیل مچھلی بھی جس کی تہہ نہیں کرسکتی - اس کے پروں نے اسے اس مقام پر پہنچایا ہے جہاں پہنچ کر عقاب بھی چکر آتا ہے اور گر پڑتا ہے —

یہی تہذیب و تمدن ہے !

اسی کو انسان اپنے کمالات ' اور حیوان مطلق سے تقریباً خدا تک اپنی ترقی کہتا ہے - مہدان ترقی میں اس نے بندر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور یہی بندر اس کا قدیم ترین ہمسایہ تھا - اس کے اور بھائی بند بن مانس وغیرہ سب کے سب ساکن و جامد رہے - ان کی عقل تو جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی اور ذہن انسانی نے حیرت انگیز ترقی کی - اب اس وقت وہ زمین پر کے حیوانات ' پانی میں کی مچھلیوں ' اور ہوا میں اڑنے والے پرندوں ' سب پر فائق ہے - اب بھی اس کے کمالات و اکتسابات کی حدود مقرر نہیں —

اس کی نگاہ صرف زمین ہی پر نہیں پڑتی - آسمان بھی اس کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں - اس نے ایسی ایسی دور بینیں ایجاد کی ہیں ' جو آسمان کے ستاروں کو زمین پر کھینچ لائی ہیں - وہ چاند پر کے پہاڑوں کی بلندی کی پیمائش کرتا ہے ' اور اس کے عمیق ترین غاروں کی تہ تک پہنچتا ہے - وہ اس کے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں کی تعداد ' اور ان کے نام بتلا سکتا ہے ' اور اس کے سمندروں اور صحراؤں سے بھی خوب واقف ہے - سریخ تو اب اس کا گویا ہمسایہ بن چکا ہے - اس نے اس کی نہروں کو دریافت کر لیا ہے اور ان کی پیمائش کرلی ہے ' اور اس کے موسموں سے بھی واقفیت حاصل کرلی ہے - اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس کے باشندوں کی حرکات و سکنات کا بھی انکشاف کرلیا ہے - اس نے تمام آسمان کا نقشہ تیار کر لیا ہے ' اور دسہا ستاروں کے ظہور کے لئے اس نے باقاعدہ اوقات نامے بنائے ہیں —

اسی کو وہ تہذیب و تمدن کہتا ہے !

اس نے حروف و قوانین و ادبیات ایجاد کئے - اس نے مذاہب فلسفہ کی بنیاد ڈالی ' جن کی غایت یہ تھی کہ کائنات اور انسان کے مبدا و معاد کو معلوم کیا جائے ' لیکن ہر مذہب فا کام رہا حالانکہ ان مذاہب کی بنیاد ان لوگوں کے ہاتھوں

سے بڑی تی ' جو نہایت زبردست مفکرین تھے زینو ' سقراط ' افلاطون ' ارسطو ' اپیکورس ' اپیکٹیٹس ان زبردست مفکرین میں سے چند ہیں اس نے فرقے بنائے ' توہمات اختیار کئے اور مذاہب کی بنا ڈالی کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے منافی ہے - پھر ہر مذہب کے لئے ایک پیغمبر کو وا کیا زرتشت ' بدھ ' کنفوشس ' مسیح ' وغیرہ ان کی مثالیں ہیں —

اسی کو انسان تہذیب وتمدن کہتا ہے !

انسان نے شہر آباد کئے - اب ہم ان کو " قدیم شہر " کہتے ہیں - اشور ' نینوہ بابل ' قرطاجنہ ' وغیرہ ان میں سے چند کے نام ہیں یہی تمام دنیا کا مرجع تھے ' اور اب یہی شہر لاکھوں من مٹی اور گندگی میں دفن ہو کر نذر نسیاں ہوچکے ہیں - یہ تمام شہر نہایت عظیم الشان تھے ان میں بڑے بڑے مناظر تھے قلعے تھے ' محلات تھے ' اور محلات تھے - ہمارے آج کل کے بڑے بڑے شہروں کی طرح ان کے باشندے بھی مرفہ الحال اور فارغ البال بھی تھے اور مفلس اور قلاش بھی ان کی سڑکیں بھی پکی بنی ہوئی تھیں ' ان میں بھی فلک بوس عمارتیں اور خوبصورت جنت باغات تھے - اس کے ساتھ ہی ان میں نہایت گنجان اور غلیظ آبادی بھی تھی - ان شہروں میں بھی امراء نشۂ عیش میں مخمور رہتے تھے ' اور غرباء فاقوں مرتے تھے - ان میں بھی دھوکے باز فجوسی اور جادو گر تھے ' کیمیا داں تھے اور بھنگ و چرس پینے والے تھے - ان میں بھی جوے بازوں ' عیاشوں ' گنہگاروں ' اور فریبیوں کے ٹھکانے تھے - یہ بھی کچھ زمین کے اوپر تھے اور کچھ زمین کے نیچے - جو حصہ زمین کے اوپر تھا ' اس میں امارت کا غرور ' کثرت دولت کی بے فکری ' حکومت کا دبدبہ شان اور ان سب سے پیدا ہونے والی نفاست مزاج ' اور نفاست مزاج کی وجہ سے صفائی پاکیزگی ' سلیقہ ' حسن انتظام ' غرض دنیا بھر کی خوبیاں تھیں - لیکن جو حصہ کہ زمین کے نیچے تھا اس میں پستی ' فلاکت ' ذلت ' گندگی ' عدم صفائی ' جرم

پیشگی ،فاقہ مستی' مصیبت زدگی ' مختصر یہ کہ اپنی زندگی سے مایوسی کے سوا اور کچھہ نہ تھا۔

اس زمانے کا انسان اسی کو تہذیب و تمدن کہتا تھا!

اسی انسان نے موجودہ شہر' نیویارک' لندن ' وائنا ' چکاگو' پیرس' برلن و غیرہ بھی بنائے ہیں' یہ سب کے سب تمدن و تہذیب کے گویا عظیم الشان گرداب ہیں۔ ان میں افراد انسانی چلتے پھرتے ' نمودار اور غائب ہوتے ' دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے فلک بوس عمارتیں کھڑی کی ہیں' جو سات سو فیٹ تک ہوا کو چیرتی ہوئی اوپر کی طرف چلی گئیں ہیں ' یعنی یہ کہ باز و عقاب بھی ان کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان عمارتوں میں افراد انسانی زندگی گزارتے ' سانس لیتے ' اور بچے پیدا کرتے ہوں ۔ ان شہروں اور فلک بوس عمارتوں کے نیچے' زمین کے اندر' اس نے سڑکوں' اور راستوں کے جال بچھائے ہیں۔ یہ تمام سڑکیں اور راستے پختہ ہیں' ان کے اوپر سواریاں بنی ہیں۔ ان میں روشنی ضرورت سے زیادہ ہے' اور وسعت اندازے سے باہر۔ افراد انسانی چیونٹیوں کی طرح ان راستوں میں اترتے ہیں اور چشم زدن میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں —

پھر انسان نے اپنے ان موجودہ شہروں میں چوڑی اور کھلی سڑکیں بنائی ہیں ' کہ جن کے دونوں طرف درخت لگے ہیں۔ ان میں نہایت خوبصورت ' صحت بخش اور وسیع شوارع عامہ ہیں۔ اسی انسان نے ان ہی شہروں میں تنگ و تاریک گلیاں بھی بنائی ہیں ' جو ان تنگ اور غلیظ پہاڑی راستوں کے مشابہ ہیں ' جن میں برساتی نالے بہتے ہیں۔ ان گلیوں میں انسان بھی برساتی نالوں کی طرح بہتے نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے شہروں میں بڑے بڑے پارک بنائے ہیں ' بہت نصب کئے ہیں ' چڑیا گھر قائم کئے ہیں ' اور ہسپتال جاری کئے ہیں۔ اسی انسان

نے ان ہی شہروں میں قہدار ' گنجان آباد ' تاریک کوٹھریاں ' مرض پرور طویلے ' غریب خانے ' پاگل خانے اور مجرموں کی اصلاح کے لئے محابس بھی تیار کئے ہیں - ان ہی کوٹھریوں اور طویلوں میں ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں ' جو چرخ نیلگوں کی شکل نہیں دیکھتے ' اور جن کی ناکوں میں تازہ ہوا نہیں جاتی - ان میں ایسی مائیں مرتی ہیں جنھوں نے کبھی آنکھ کھول کر سبزہ زار نہیں دیکھا اور ۵۰ برس میں ایک دفعہ بھی کھلے میدان میں قدم نہیں رکھا —

اسی کا نام تہذیب و تمدن ہے !

اسی انسان کا ترقی پذیر ذہن اس دنیا کا باعث ہے جہاں کارخانوں اور جگہوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی نسل حرام بڑھتی اور پلتی ہے یہ نسل سوسائٹی کو گھن لگاتی ہے - اس کے لڑکوں کو چوری کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے ' اور لڑکیوں کو عصمت فروشی کی - یہ گویا نشے بازوں ' کتلیوں ' اچکوں جیب کتروں اور مفلسوں کی دنیا ہے - یہ اندھیرے میں شکار کی خاطر نکلتے ہیں اور صبح ہوتے ہوتے غائب ہو جاتے ہیں - یہ لوگ جو کپڑا ایک دفعہ پہنتے ہیں اس کو پھٹنے تک پھر بدن سے علیحدہ نہیں کرتے - ان کے یہ کپڑے جوؤں اور ہر طرح کے کیڑوں کے مخزن ہوتے ہیں - ان کے بدنوں میں سے بو آتی ہے یہ مصیبت ' افلاس ' تنگدستی ' گندگی ' اور امراض میں اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہیں —

یہ دنیا قانون کے پنجے سے باہر اور خیرات کی پہونچ سے بالا ر ہے - یہاں بچوں کے گلے گھونٹے جاتے ہیں ' بڈھے بے پروائی کے ساتھ چھوڑ دئے جاتے ہیں ' بیماروں کی تیمار داری نہیں کی جاتی ' کمزور ستائے جاتے ہیں ' مجانین کو تکلیفیں دی جاتی ہیں اور جوانوں کو خراب کیا جاتا ہے ' اس ذلیل مخلوق کی گنجان آبادی میں جہاں اسے کہ قصبہ بنتے رہتے ہیں ' جہاں ٹھگ جوا کھیلتے اور

پر ہوتا ہے ' اور ہر روز میں سگریٹ پیتے اور لڑتے لڑاتے رہتے ہیں - ان ہی میں بچے تو کھیلتے کودتے رہتے ہیں اور شہرت پرست شرابیں پیتے اور بکواس کرتے رہتے ہیں اس مخلوق کے افراد میں نہ کوئی فرق و امتیاز ہے ' اور نہ ان کی کوئی قومیت ہے - ان سب کی زبان ایک ہی ہوتی ہے - چینی اور انگریز ' عورتیں لڑکیاں ' حبشی ' خانہ بدوش ' جاپانی ' امریکانی ' ملاح بوڑھے ' بھکوڑے ' مفسد ' بدوقچی ' دھوکے باز غرض سب برابر ہوتے ہیں —

غاروں ' کوٹھریوں ' طویلوں ' بھٹکڑ خانوں اور تنگ و تاریک گلیوں ہی پر علم و دولت ' عشرت و فارغ البالی ' فیشن اور تکلفات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے کوئی بڑا شہر بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں - جب سوسائٹی اور قانون ' اخبارات اور غیر انسانی کمالات کی تعریف رطب اللسان ہوتے ہیں ' تو ان کو سطح پر کی چیزوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا ' اور یہ یقیناً بہترین ہوتی ہیں - ان ہی بہترین چیزوں پر ان کے فزدیک سوسائٹی مشتمل ہوتی ہے - وہ ان انسانی کمالات پر فخر کرتے وقت ان لاکھوں آدمیوں کو بھول جاتے ہیں ' جو ہر سوسائٹی کے لئے باعث شرم ہوتے ہیں - مصیبت زدہ ' ذلیل ' مجرم ' اپنی جان سے بیزار ' بگڑے ہوئے اور نا قابل علاج اشخاص پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی - وہ انسانوں کے ان رہن بسیروں کی طرف بھی نہیں دیکھتے ' جہاں چوہے اپنے بل بناتے ہیں ' جہاں بلیاں غراتی ہیں جہاں ہر طرح جراثیم پلتے ہیں ہر طرح اور مرضوں کی پرورش ہوتی ہے - انسانی کمالات کی تعریف کرتے وقت یہ سب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں - حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کا ذکر کرتے وقت ہم کو ان کو بھی گنوانا چاہئے ' کیوں کہ تہذیب وتمدن بہترین چیزوں پر نہیں ' بلکہ تمام اچھی اور بری چیزوں کے مجموعے پر مشتمل ہوتی ہے —

بعض اوقات میں سوچا کرتا ہوں کہ جب مشتری کے باشندے اپنی زہرناک

دور بینوں سے ہمارے اس چھوٹے سے ستارے کی طرف دیکھتے ہونگے تو وہ کیا کہتے ہونگے - میرا خیال تو یہ ہے ' کہ ان کو ہماری ان چھوٹی چھوٹی کوششوں ' چھوٹے چھوٹے شہروں اور ہماری عجیب وغریب عادات پر ہنسی آتی ہوگی ' بعینہٖ اس طرح جیسے ہم چیونٹیوں کے شہرو ، اور ان کی عادات پر ہنستے ہیں - اگر اور ستاروں کے باشندوں ' مثل مریخ کے انسانوں اور مشتری کے دیووں نے اتنی طاقتور دوربینیں ایجاد کرلی ہیں ' کہ وہ ہم کو دیکھ سکتے ہیں ' تو ان کو ہمارے ,, فن حرب ،، پر تو ضرور ہنسی آتی ہوگی - اس میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں ' کہ ان ستاروں کے ماہرین علم الافلاک و النجوم کے لئے یہ بات اب تک ایک معمہ ہے ' کہ ہماری دنیا کی جنگ عظیم آخری ہوئی کیوں - اس میں شبہ کی گنجائش اس وجہ سے نہیں کہ ہم خود اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے - غالباً انہوں نے اس کو ایک بہت بین الاقوامی کھیل ' یا دل کا بہلاوا ' سمجھا ہوگا - بہر حال یہ تمام کھیل ان ستاروں کے مشاہدین کے لئے ایک معمہ تھا —

انہوں نے دیکھا کہ مہذب و متمدن دنیا (کیونکہ وحشی اور جنگلی دنیا اس میں شریک ہی نہ تھی !) کے ہر حصے سے ہزار ہا آدمی زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جمع ہوے ہیں ' اور یہاں طول طویل ' گہری اور کچی خندقیں کھود کر ان میں ہر سوں رہے ہیں - ان لوگوں نے اپنے آرام دہ گھروں اور خوش گوار ماحول ، پیاری بیویوں ماں باپوں کو چھوڑا اور ان خندقوں کی گندی ' اور تکلیف دہ زندگی اختیار کی - ان خندقوں میں سے بعض آڑی تھیں ' اور بعض ان آڑی خندقوں کو آپس میں ملاتی تھیں - ان کے علاوہ زمین کے نیچے غبار اور شکستہ و ریختہ غار تھے - ان سب میں یہ لوگ نہایت تکلیف کی اور گندہ زندگی بسر کرتے تھے - یہاں ان میں امراض پھیلے اور جوؤں نے ان کے بدن کو نوچا جب یہ سوتے تھے تو چوہے ان کے اوپر مٹر گشت کرتے تھے - اور جب یہ مرجاتے تھے ' یا مرنے والے ہوتے تھے تو یہی چوہے ان

کو کہا جاتے تھے ' لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ لوگ وہاں سے نہ ہلے اغلب یہ ہے کہ ان ستاروں کے مشاہدین کی سمجھہ میں یہ بات اب تک نہ آئی کہ آخر اس لوگوں نے اس زندگی کو خیرباد کیوں نہ کہا —

پھر ان ہی مشاہدین نے اپنی زبردست دوربینوں کے ذریعہ سے بھی دیکھا ' کہ ان خندقوں میں رہنے والے لوگ کبھی کبھی اپنے چہروں پر عجیب و غریب چیزیں لگاتے ہیں - عرصے تک تو ان ستارے والوں کی سمجھہ میں نہ آیا ہوگا ' کہ یہ آخر ہیں کیا لیکن انجام کار انھوں نے معلوم کر ہی لیا ہوگا کہ اس کیپل میں دوسرا گروہ ان خندقوں پر زہریلی گیسیں چھوڑتا ہے ' جو ان خندقوں میں ہر چہار طرف پھیل کر مٹی میں مل جاتی ہیں ' اور ہمیشہ کے لئے ان خندقوں میں اپنا گھر بنا لیتی ہیں ان گیسوں کی وجہ سے انسانوں کا دم گھٹتا ہے ' وہ جل جاتے ہیں ' مرجاتے ہیں اور بولے چنگے آدمی دیوانے یا پاگل ہو جاتے ہیں سریخ کے انسان اور مشتری کے دیو اس جادو گری کو بھی یقیناً نہ سمجھہ سکے ہونگے —

اس کیپل میں ہوائی جہاز بے بس پناہ گزینوں پر بمب کے گولے پھینکتے تھے ' چوہتر میل کی مار مارنے والی توپیں گرجوں اور معبدوں پر لوہے کی چٹانیں برساتی تھیں ' اور ان کے علاوہ ہزاروں ترکیبیں لڑائی کی ایسی تھیں ' جن کو دیکھہ دیکھہ کر ان ستاروں کے باشندے سراپا حیرت بنے جاتے تھے - پھر اکثر نظارے اس قسم کے دکھائی دیتے تھے ' کہ جن کو دیکھہ دیکھہ کر عقل کو چکر آتا تھا - جنگ کی پیدا کی ہوئی ہلاکت و تباہی ' حسرت و تنگی ' قربانی ' بے رحمی ' خوں ریزی ' اور امید شکنی اس کا شور و غل ' آہ و بکا کے نالے ' اس کی دہشتیں ' تکلیفیں ' ایذائیں ' آفات و بلیات ' لنگڑے لولے صورت مسخ شدہ اندھے ' بیوائیں ' یتیم ' بمب اور مورچے ' شکستہ و ریختہ خون بہتی ہوئی چوٹیں اور کھلے پڑے ہوئے زخم ' دردکی چیخوں ' رات کے وقت میدان جنگ کا خوفناک سماں ' سڑے ہوئے اور متعفن مردوں کے ڈھیر ' جاں بلب زخمیوں

کی آھیں ' اور ان کا تکلیف سے تڑپنا ' سبزہ آغاز جوان لڑکوں کا عالم سکرات ' پیاس کی وجہ سے ان کا زبانوں کو بار بار باہر نکالنا ' گلے پھاڑ پھاڑکر پانی مانگنا ' چوھوں سے ان کی لڑائی ' اپنے بیوی بچوں ' ماں باپوں کو یاد کر کر کے ان کا تڑپنا اور چلانا ' خار دار تار پر ان کا خون آلود حالت میں کروٹیں بدلنا ' بحالت مایوسی ان کا ستاروں کو تکنا اور آسمان سے فریاد کرنا ' ان کا دم توڑنا ' ایڑیاں رگڑنا ' اور مرجانا - یہ ایک نہایت ناقص اور نامکمل لفظی تصویر ھے ' ان نظاروں کی جو مہذب و متمدن انسانوں نے محض کھیل کھیل میں پیدا کئے !

ان ھی انسانوں میں سے عقلمند ' بظاھر متین و سنجیدہ ' لکھے پڑھے ' اور پختہ کار افراد (جن کو عرف میں سیاست داں کہا جاتا ھے) جنگ کے دونوں اطراف پارلیمنٹوں اور جلسوں میں کھڑے ھوے ' اور بکمال متانت و سنجیدگی ارشاد فرمایا کہ اب قتل و غارت کے اس خونیں تماشے کو جاری ھی رکھنا چاھئے ' چنانچہ یہ جاری ھی رھا ' برسوں جاری رھا ' اور نوع انسان کی فلاح وبہبودی کی خاطر جاری رھا - یہ تماشہ کیا تھا ؟ قصابی تھی ' مجسمہ ظلم و بے رحمی تھا ' اور چند دیوانوں عقل باختہ لوگوں کی بہیمانہ مجلس عیش و طرب تھی !! یہ سب تماشا بھی ان ستاروں کے باشندوں کے لئے نا قابل فہم تھا —

لیکن ھم ساکنان ارض اس کو تہذیب و تمدن کہتے ھیں !

کیا تہذیب و تمدن ایک اچھی چیز ھے ؟ کیا یہ اس قابل ھے کہ اس کے حصول کی کوشش کی جاے ؟ کیا یہ وحشت اور بربریت سے بہتر ھے ؟ یہ تمام سوالات نہایت عجیب و غریب ھیں - ھر شخص ان کا جواب اثبات میں دیتا ھے - لیکن مجھے بذات خود اس میں بہت شبہ ھے - تہذیب و تمدن کی واحد غرض و غایت یہ ھے ' کہ نوع انسان حالت وحشت و بربریت کی بہ نسبت زیادہ خوش ھوجاے - اگر تہذیب و تمدن سے یہ بات حاصل نہ ھو ' تو سمجھنا چاھئے ' کہ یہ ناکام رھا -

لیکن کیا اس سے نوع انسانی زیادہ خوش ہو جاتی ہے ؟ معاشرتی ارتقا کے سلسلے کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھ جاؤ - جوں جوں تم نیچے اترتے آؤ گے اسی طرح قناعت، خوشی، اطمینان، زیادہ ہوتا جاے گا - ایک معمولی، ہوتا سا تاجر ایک کرور پتی تھوک فروش کے مقابلے میں زیادہ خوش رہتا ہے - معمولی آمدنی رکھنے والا شخص لاکھوں اور کروروں کمانے والے شخص کی بہ نسبت زیادہ مسرور ہوتا ہے - گمنام شخص کو شہرۂ آفاق شخص کی نسبت زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے جاہل کسان اپنے بڑے زمیندار کے مقابلے میں بہت زیادہ خوش ہوتا ہے - اور میرا خیال تو یہ ہے، کہ وحشی اور جنگلی انسان اس جاہل کسان سے بھی زیادہ خوش رہتا ہے —

اغلب یہ ہے، کہ وحشی و جنگلی، انسان مہذب و متمدن انسان کی نسبت زندگی سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے - عالم جوانی میں یہ تو گلچھرے اڑاتا ہے، مزے لوٹتا ہے، اور مہذب انسان تعلیم حاصل کرتا ہے، اور تکلیف اٹھاتا ہے - چھبیس برس کی عمر کے قریب کہیں جاکر مہذب انسان کی تعلیم ختم ہوتی ہے اور اب گویا اس کی عملی زندگی شروع ہوتی ہے - لیکن وحشی انسان اس وقت تک بے انتہا لطف اٹھا چکا ہوتا ہے - گرم ملکوں میں نیچر لڑکیوں کو بارہ برس کی عمر میں شادی کے لائق بنا دیتی ہے - وہ نیچر کی فرمانبرداری کرتی ہے - اور ایک نو خیز بیوی جو کچھ مزے حاصل کرسکتی ہے، وہ اس کو حاصل ہو جاتے ہیں - تیرہ برس کی عمر میں مادرانہ خوشیوں سے بہرہ اندوز ہوتی ہے - سترہ برس کی عمر میں وحشی لڑکا مردوں کا مقابلہ کرتا ہے، کیونکہ اب وہ مرد ہے - اب وہ خود اپنا مالک ہے، اور آزادی کے معنوں سے واقف ہے، اول تو وہ کبھی قیدی ہو کر رہا ہی نہیں، کیونکہ رسوم و آداب کی ہتکڑیاں اور بیڑیاں اس نے کبھی نہیں پہنیں —

وہ نہائت شریر یابو پر بغیر زین اور کاٹھی کے سوار ہوتا ہے، اور بھینس کے ساتھہ نبرد آزما ہوتا ہے۔ وہ گھنے اور بےراستہ جنگلوں میں چیتوں کی طرح دبے پاؤں چلتا ہے موسم بہار و برشکال میں وہ دریا کے کنارے لیٹ کر چاندنی رات میں اپنی معشوقہ پر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جنگ کے نعرے لگاتا ہے، اور حریت اور وطن کی خاطر بہادری کے کارنامے دکھانے کے لئے لڑائی کی آگ میں کود پڑتا ہے۔ وہ موسم سرما کی کڑکڑاتی سردیوں میں شکار کی تلاش میں بن بن پھرتا ہے، اور خوراک حاصل کرنے کے لئے فاقہ زدہ بھیڑیئے سے پنجہ آزما ہوتا ہے وہ ہندوستان کی گرمیوں میں اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھہ جاتا ہے، اور اپنے بچوں کی نقلی لڑائی کا تماشا دیکھتا ہے —

جب وہ بڑاھو جاتا ہے، تو وہ آسمان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے، اور اس کی وسعت پر حیرت کرتا ہے وہ روح بر تر کے متعلق سوچتا ہے، لیکن سمجھہ نہیں سکتا۔ لیکن فلسفی بھی تو اس کو ہزاروں برس کی کوشش کے باوجود سمجھہ نہیں سکا ہے! وہ ابدیت پر فکر کرتا ہے، لیکن یہ بھی اس کے فہم سے بالاتر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن کوئی ہے، جس کا فہم اس کو احاطہ کرسکتا ہے؟ وہ کبھی کبھی سوچتا ہے، کہ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے؟ لیکن وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیا الٰہیات کے عالموں کا بھی بعینہ یہی حال نہیں؟

وہ سوال کرتا ہے، کہ یہ دنیا عدم سے وجود میں کس طرح آئی؟ لیکن وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا، اور ہمیں کو کس نے اس کا جواب دیا ہے؟ موت سے اس کو دہشت و وحشت ہوتی ہے، لیکن کیا مہذب و متمدن انسان کو نہیں ہوتی؟ وہ اپنی زندگی کے دن پورے کرتا ہے، اپنی نسل بڑھاتا ہے، اور آخرکار ایک دن اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردیتا ہے، بعینہ یہی ہمارا حال ہے اس حالت میں کون کہہ

سکتا ہے کہ ہم اس سے بہتر ہیں ؟ واللہ اعلم —

اب اگر تہذیب و تمدن نہ ہم کو اس زندگی میں زیادہ خوش کرسکتا ہے اور نہ موت کے بعد ہماری حالت بہتر کرسکتا ہے ، تو اس کے حصول کی خاطر تکلیف کیوں برداشت کی جائے ؟

چاندنی رات

از

جناب غلام دستگیر صاحب ' رشید ' متعلم کلیۂ جامعہ عثمانیہ

چمن کے پودوں کے اوٹ میں یہ حسین کوئی چھپا ہوا ہے
کہ اس کے عکس جمال رخ سے جہاں منور بنا ہوا ہے
وہ چاند تاروں بھرے فلک پر عجیب عالم دکھا رہا ہے
صراحی لے کر حسین ساقی چمن میں گویا کھڑا ہوا ہے
خزاں اندھیرے کی آگئی تھی ' چمن جہاں کا اجڑا گیا تھا
ضیاء کی اس میں بہار آئی کہ اس سے سب پر ضیا ہوا ہے
ہر ایک وادی ہے کوئے مستی ہر ایک دریا ہے جوئے مستی
شراب عالم نے پی ہے کیسی ' یہ کیسا نشہ چڑھا ہوا ہے
یہ کس کا سایہ پڑا ہے اس پر کہ سارا عالم ہے یہ منور
یہ بھید سیمیں تنی کا کس کی کہو تو اس میں چھپا ہوا ہے
زباں پہ جس کے ہورب ارنی وہ آنکھ کھولے جہاں کو دیکھے
نقاب کس مہ جبیں کے رخ سے بتائے وہ اب اٹھا ہوا ہے
یہ پیلی پربت پہ چاندنی ہے کہ طور جلوے سے جل اٹھا ہے
ہر ایک سو سی ہر ایک ذرہ جو مست و بیخود بنا ہوا ہے

جمال اے رشک ماہ اپنا دل حزیں کو مرے دکھادے
اندھیرے ہستی کے سب مٹادے تو رشک سینا اسے بنادے

تصوف

از

جناب ذوالفقار علی خاں صاحب بی - اے - (عثمانیہ)

جان عالم گویمش گر ربط جاں دانم بہ تن
در دل ہر ذرہ ہم پنہان و ہم پیدا ستی

تاریخ مذاہب کا سرسری مطالعہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ہر مذاہب میں تصوف کی کچھہ نہ کچھہ جھلک نظر آتی ہے ' ہندی مذاہب اور عیسائیت میں خصوصیت کے ساتھہ تصوف کی ترقی کے نمایاں آثار پائے جاتے ہیں لیکن ان میں حالات و مواقع کے لحاظ سے کچھہ نہ کچھہ جزئی اختلافات ہوی پائے جاتے ہیں تاریخ فلسفہ پر اگر ہم ایک سرسری نظر دوڑائیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ روحانی ارتقاء کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ کر فلسفہ ہوی یہیں دم لیتا ہے -

ہندو مذہب کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتاہے کہ اس کی روسے ہوی ارتقاء روحانی کے اعلیٰ مدارج میں خالق و مخلوق میں یکتائی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حقیقت کے بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ جو کچھہ ہے خدا ہے اور خدا کے سوا کچھہ نہیں - مذہب میں وحدت الوجود والا تصور تمام دوسرے تصورات سے اعلیٰ ترین خیال کیا جاتا ہے اور روحانی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج میں مذہب وحدت الوجود ہی تشفی بخش ثابت ہوتا ہے —

انسانی زندگی کے ابتدائی مدارج میں مذاہب مادیت کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں - ہر عجیب و غریب اور نئی شے انسانی دماغ کو مرغوب کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے - انسان ہر مادی شے کو ذی قوت تصور کرتا اور اس کی پرستش کرتا ہے - یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب کے تانتے صنمیات (Mythology) سے جاملتے ہیں لیکن انسان کی متجسس فطرت اس پر مطمئن نہیں رہتی آہستہ آہستہ اس کے خیال کی رسائی تصورات مجردہ تک ہونے لگتی ہے اور مادیت سے ہٹ کر تصوریت کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے اور ہر کثرت میں ایک وحدت کی تلاش شروع کرتا ہے - یہاں تک کہ اس کی نکتہ رس نگاہیں آخر میں ایک ایسے تصور پر مرتکز ہوتی ہیں جس کو فلاطون تصور تصورات کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس تصور کو تمام دیگر تصورات کا منبع و مرجع قرار دیتا ہے اور یہی وہ تصور ہے جس کو اصطلاح عام میں خدا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے —

فلاطون کے بعد فلسفہ نو فلاطونیوں میں تصوف کی خاص جھلک نظر آتی ہے لیکن نو فلاطونیت کا اصل مسلک فلسفۂ اشراق ہے اس مسلک کا اثر غالباً عیسائیت پر بہت زیادہ بڑا کیونکہ تاریخ اس بات کا پتہ دیتی ہے - باستثنائے (Johannes) (Scotus) اور (Eckhert) قرون وسطہ کے تقریباً مسیحی صوفیہ (Christian Mystics) اسی مسلک پر گامزن تھے —

اسلام میں تصوف کی ابتدا عام داخلی یا نور داخلی سے ہوتی ہے جس کو بعض اوقات مکاشفے کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے —

اسلام میں یہ خیال آہستہ آہستہ راسخ ہوتا گیا کہ قران مجید کے ظاہری اور باطنی دو معنی ہیں - الفاظ ظاہری کی پابندی تو عوام کے لئے لازمی ہے لیکن اس کے باطنی دو معانی صرف ان حضرات پر واضح ہوسکتے ہیں جن کو قران کی اصطلاح میں ' راسخون فی العلم ' کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال کہ خدا ہر جگہ موجود ہے جس

کی تائید خود قرآن اور قول پیغمبر سے ہوتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ' ایلہا تولو و جوھکم فثم و جہ اللہ ' مسلمانوں کو غور فکر اور تصوریت کی طرف راغب کیا جس نے ارتقا کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ کر تصوف کا نام اختیار کیا —

تصوف کی وجہ تسمیہ

غالباً تصوف کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مشرب کے لوگ عموماً کمل جو اونٹ کے بالوں کی بنی ہوتی تھی جس کو عربی میں صوف کہا جاتا ہے استعمال کیا کرتے تھے - جس کی وجہ سے ان کو صوفی پکارا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ نام اس قدر زبان زد عام ہوا کہ ہر وہ شخص جو اس مشرب سے ذرا بھی تعلق رکھتا ہو صوفی کہلانے لگا —

" بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صف سے مشتق ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ صوفیہ تعلقات الٰہیہ میں شریک صف اول ہیں - اور بعضوں نے اسے اہل صفہ * سے منسوب کیا ہے -' القشری ' اور دوسرے صوفیہ ان تمام تعبیرات میں کسی کو تسلیم نہیں کرتے ابو نصر السراج نے تسلیم کیا ہے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے (بحوالہ کتاب اللمع مرتبۂ نکلسن)- جاسف فان ہیمرو کی تحقیق ہے صوفیہ ہندوستان کے (Gymns Sophists) † سے متعلق ہیں اور یہ کہ ' صوفی ' اور ' صفہ ' دونوں یونانی

---

* اہل صفہ عہد نبوت کی وہ جماعت صحابہ تھی جو غربت وافلاس کے باعث مسجد نبوی کے نزدیک ایک چبوترے پر اقامت گزیں تھی امور دنیوی سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا وہ ہمیشہ تلاوت قرآن اور عبادت میں مشغول رہتے تھے —

† " انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ اتھکس " میں لفظ تھیاسفی کے ماتحت مقالہ نگار نے عالمانہ اور محققانہ بحث کرتے ہوے ہندوستانی تصرف کے چار ماخذ قرار دے ہیں ' اپنشد ' ویدانت ' سانکھیہ (فلسفہ) ' یوگا (فلسفہ) ' اور اس کے بعد جین اور بدھ مذہب کا تذکرہ کرتے ہوے لکھا ہے کہ کس طرح تھیاسفی (ہندی) مذہب کی شکل میں رو نماہوئی —

الفاظ (Orpos) اور (Oopys) کی طرح ایک ہی ماخذ سے ہیں۔
' تیالک نے ' اس کی تردید کی ہے لیکن عہد جدید کے ایک عالم
اتیسبرت سرکس نے ' وان ہیمر ' کے نظریہ کی تائید کی ہے ۔ نالدک نے
جو اسٹرس برگ یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا 'سنہ ۱۸۹۴ ع
میں اس مسئلہ کو حل کر دیا کہ لفظ (Oopos) ارمی (Aramaic)
میں بھی پایا جاتا ہے اس لئے عربی زبان میں پایا جانا قرین قیاس
نہیں دوسری بات یہ کہ ارمی اور عربی دونوں زبانوں میں (Oopiatys)
اور (Petoopos) پائے جاتے ہیں عربی میں یونانی لفظ ' O ' کی جگہ
سین استعمال ہوتا ہے ۔ اگر ' وان ہیمر ' کا نظریہ صحیح ہوتا تو
لفظ صوفی میں پہلا حرف " صاد " کی بجائے "سین " ہوتا نالدک
نے یہ بھی دکھلایا کہ لباس الصوف ادب کی ابتدائی کتابوں میں پایا
جاتا ہے جس کے متعلق یہ بھی ہے کہ اُسے وہ شخص پہنتا تھا جو
تارک الدنیا ہوتا ۔ فارسی زبان میں تارک الدنیا درویشوں کے متعلق
پشمینہ پوش ؛ کا لقب پایا جاتا ہے ۔ یہ مسیحی راہبوں سے لیا گیا ۔
جب حماد بن سلمی سنہ ۷۸۴ ع میں بصرہ آئے تو اُنھوں نے
فرقدالسنجی سے جو پشمینہ (صوف) کا لباس پہنے ہوئے تھا کہا کہ
یہ لباس اتار دو کیونکہ اسے نصاریٰ پہنتے ہیں ۔ قشیری کا بیان ہے
کہ اس کا رواج سنہ ۲۰۰ ہجری میں ہوا ۔ ' السراج ' کا خیال ہے کہ
اہل بغداد نے اسے ایجاد کیا " —

لیکن صوفی کی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا
بعضوں نے اس کا لفظ تھاسوفی سے مشتق ہونا بھی بتلایا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب
مشرق میں امام غزالی مغرب میں ابن طفیل تصوف کے بہت بڑے نمائندے گذرے

ھیں امام غزالی نہ صرف ایک صوفی تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی بھی قرار دیے جاتے ھیں غزالی نے اپنے عہد کے مختلف حصوں میں مختلف مسالک کی نمائندگی کی - کبھی تو وہ ہم کو ایک فلسفی کی شان لئے ھوے نظر آتے ھیں اور کبھی فلسفی کی تردید پر آمادہ دکھائی دیتے ھیں - کبھی وہ ایک فقیہہ نظر آتے ھیں اور کبھی ایک صوفی - غزالی نے سب سے آخر میں تصوف کے سایہ عاطفت میں پناہ لی - جلال الدین رومی - فرید الدین عطار - شمس الدین حافظ خاقانی - سعدی - اور نظامی - یہ سب صوفیہ کی صف میں شمار کئے جاتے ھیں جن میں مولوی روم کو خصوصیت کے ساتھہ اھمیت حاصل ھے —

تصوف کی ابتداء اور اسلام میں اس کا صحیح تخیل

تصوف کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس کی ابتداء مسیحیت یا اسلام سے نہیں ھوئی بلکہ یہودیوں اور دنیاے روم میں بھی اُس کے جراثیم پاے جاتے تھے تصوف کی نشو و نما کو ھندو فلسفہ کے ساتھہ خصوصیت حاصل ھے - غالباً ھندو فلسفہ ھی کا اثر تھا کہ تصوف وسط ایشیاء اور مغربی ایشیاء میں پھیلتا گیا - جہاں کہیں بھی ان خیالات نے عروج پایا یہ رھبانیت کے زبردست حامل رھے باوجود ھندی رھبانیت کے نظر انداز کرنے کے کہ جس میں ترک دنیا کی تلقین نہایت شد و مد کے ساتھہ کی گئی ھے ' ہم کو عیسائیت میں بھی اس کے متعلق نہایت پر زور مواعظ ملتے ھیں - خود مسیح نے کہا ھے کہ - " اوروں کے لئے بہت ھے لیکن انسان کے لئے بہت ھی نہیں ' لیکن پیغمبر اسلام نے تصوف کے ان ھمت شکن مواعظ کو اپنا مسلک ھرگز نہیں قرار دیا - چنانچہ صریحی ارشادات موجود ھیں کہ " لا رھبانیت فی الاسلام " - وغیرہ —

تصوف کی تاریخ میں پیغمبر اسلام کے یہ ھمت افزا خیالات یقیناً قابل ستائش ھیں حضرت کی ھمیشہ یہ کوشش رھی کہ انسان قربت الہی کے شوق میں کہیں دنیا

کو بالکل ترک نہ کر دے اس میں شک نہیں کہ فلسفہ ویدانت کی طرح اسلام میں بھی مختلف احادیث سے جن کا ذکر بعد میں آئے گا اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دنیا اور دنیوی اشیا آنی جانی اور فنا ہونے والی ہیں اور ان کو ثبات نہیں لہذا ان کے حصول کی کوشش بیکار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وقتاً فوقتاً اس امر سے متعلق بھی حکمات موجود ہیں کہ انسان کو تارک الدنیا نہ ہونا چاہئے۔ جس طرح کہ بھگوت گیتا میں سری کشن جی نے وقتاً فوقتاً اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر اس سے علحدہ رہنے کی کوشش کرے اسی طرح اسلام میں بھی ہمیشہ یہی ہدایت کی گئی ہے کہ انسان نہ تو تارک الدنیا بنے اور نہ دنیا کا کتا۔ چنانچہ ایک مقام پر تو کہا جاتا ہے " لا رہبانیت فی اسلام۔" یعنی رہبانیت اسلام میں جائز نہیں۔ اور دوسرے مقام پر کہا جاتا ہے " الدنیا جیفۃٌ و طالبہا کلاب۔" یعنی دنیا مردار ہے اور اس کا طلب کرنے والا کتا۔ ان دونوں احکام میں بہ ظاہر تناقض معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا منشا وہی ہے جیسا کہ سری کشن جی نے کنول کے پھول اور پانی سے تشبیہ دی تھی کہ انسان کو مثل کنول کے پھول کے زندگی بسر کرنا چاہئے کہ وہ باوجود پانی میں رہنے کے اس سے علحدہ رہتا ہے —

خلافت راشدہ کا اختتام کوفے میں حضرت علی کی شہادت پر ہوتا ہے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد مذہب اسلام میں بین تفریق نظر آتی ہے۔ دمشق میں بنی امیہ کی سلطنت نے اکثر سچے مسلمانوں کو عزلت و گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کیا * یہ عزلت و گوشہ نشینی کی زندگی غالباً رہبانیت کے لئے پہلا درجہ تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام میں تصوف کا ارتقا غیر معمولی سرعت سے ہوتا ہے صوفیہ کے خیال کے مطابق روحانی ترقی اور قربت خدا یعنی اتصال کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی ذات کو اس لا محدود ذات

---

* لائق مضمون نگار کا یہ بیان تاریخی ثبوت کا محتاج ہے۔ مجلہ

میں فنا کرنے جس کو عام طور پر خدا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - اور اُس کے ذرایع جس کو تصوف کی اصطلاح میں سلوک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ' ریاضت و تزکیہ نفس توکل فنا وغیرہ ہیں کہ ان کے ذریعے انسان میں احساس داخلی یعنی مکاشفہ کی قوت پیدا ہوتی ہے - صوفیہ کے عقائد کے مطابق اس قسم کی ریاضت و تزکیۂ نفس سے انسان اور خدا میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو الفاظ کا متحمل نہیں ہوسکتا —

مکاشفہ کا وحی سے تعلق

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ عرفان کشف کے خیال کو سب سے پہلے غزالی نے پیش نہیں کیا - بلکہ خود رسول اللہ کے اقوال اور قرآن مجید سے اس کا پتہ چلتا ہے - قرآن میں جا بجا قربت من اللہ اور نیت پر زور دیا گیا ہے قربت کی بہترین مثال ہم کو معراج کے ذکر میں ملتی ہے - معراج کے ایک مسئلہ پر اگر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی جاے اور خرق و التیام کے فرسودہ مسائل سے در گزر کیا جاے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معراج کے معنی محدود کی نا محدود کے ساتھ ممکنہ قربت کے سوا اور کچھ نہیں - وحی کے مسائل پر اگر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ وحی الفاظ غیر میں نام ہے مکاشفہ کا لیکن یہ ضرور ہے کہ مکاشفہ کے مدارج ہوتے ہیں - اور ہر شخص کو اس کے حوصلے اور ظرف کے مطابق مکاشفہ نصیب ہوتا ہے - ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق بھی اس فیض سے محروم نہیں - خود قرآن میں ایک مقام پر وارد ہوا ہے " و اوحینا الا النحل " یعنی (ہم نے وحی کی مکھی کی طرف) جس سے صاف ظاہر ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق میں علم داخلی موجود ہوتا ہے - جس کو قرآن کی اصطلاح میں وحی کے نام سے اور صوفیہ کی اصطلاح میں مکاشفہ کے نام سے ' یاد کیا جاتا ہے - یہاں اس مغالطہ سے بچنا ضروری ہے کہ علم داخلی ہر فرد کے لئے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس علم کے داخلی کے مدارج ہوتے ہیں - اور صرف اس علم داخلی

یا مکاشفہ کو جو ایک پیغمبر کو حاصل ہوتا ہے وحی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ مولانا روم نے وحی کے متعلق جو صوفیہ کی اصطلاح میں دوسرا نام ہے مکاشفہ کے اعلیٰ ترین درجہ کا ، مثنوی میں اس طرح اظہار فرمایا ہے —

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس آن چو زر سرخ است وایں حسہا چو مس

اس کے بعد ایک دوسرے شعر میں ارشاد فرماتے ہیں —

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

فلسفی کو منکر حنانہ است از حواس انبیاء بیگانہ است

پس محل وحی گردد کوش جاں وحی چہ بود؟ گفتن از حس جاں

اس تمام بحث سے مولانا کا یہ مطلب ہے کہ علاوہ حواس خارجی کے انسان میں حواس داخلی بھی موجود ہیں ۔ جس کے ذریعہ اس کو روحانی علم حاصل ہوتا ہے لیکن یہ " ادراک جو ان حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے انبیاء کے ساتھہ مخصوص نہیں بلکہ اصفیا و اولیاء کو بھی حاصل ہوتا ہے چنانچہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم ان اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں " —

" گفتن حس نہاں کہ حس قلب است وحی است نہ مطلقاً بلکہ گفتن انچہ از حق گرفتند وحی بدیں معنی عام است اولیاء و انبیاء را "۔

اس کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ ۔

" متکلمین لفظ وحی را اطلاق بر الہامات اولیاء نمی کنند الا بہ مجاز خود مولانا فرماتے ہیں —

از پئے رو پوش عامہ در بیان وحی دل گویند آں را صوفیان

مولانا کے خیال کے مطابق " وحی کے معنی اُس علم کے ہیں جو تعلیم و تعلم درس و تدریس تلقین و ہدایت کے بغیر خود بخود خدا کی طرف سے القاء ہوا ہو " —

ارتقا کا تعلق فنا سے

عام طور پر مسلک تصوف پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ مسلک رہبانیت کی تلقین کرتا ہے حالانکہ رہبانیت سے قرآن میں صاف طور پر منع کیا گیا ہے - اس کا استدلال اس طرح کیا جاتا ہے ' مسئلہ فنا مذہب تصوف کی جان ہے اور مسئلہ فنا کی رو سے انسان کا میلان ترک دنیا کی طرف بڑھتا جاتا ہے لیکن سچ پوچھو تو ہماری حالت " خواب ز دیدہ راهمه تعبیر می کنند " کا مصداق ہے اگر ہم تصوف کی حقیقت سے کچھ بھی آشنا ہوتے تو ہم تصوف کی شان میں اس قسم کے اعتراضات ہرگز نہ کرتے —

مسئلہ ارتقاء کہ جس کے نہ صرف متقدمین قائل نظر آتے ہیں بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اکابر علما مثلاً ڈارون ' وائسمن ' لامارک اور اسپنسر کا بھی یہی مذہب رہا ہے اور زمانۂ موجودہ میں سر آلیور لاج اس کا پر زور حامی نظر آتا ہے - اگر ہم فلسفۂ اسلام پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو واضح طور پر ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں بھی اس خیال کے حامی عنقا نہیں - کیونکہ مولانا روم جیسے بزرگ اس کے حامی نظر آتے ہیں - ارتقا سے متعلق مولانا کا استدلال گو بظاہر ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت گہرے معنی کا حامل ہے - مولانا نے انسان کی ابتدا اور ترقی کی توجیہ اس طرح کی ہے ' چنانچہ فرماتے ہیں —

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — در جمادی باز ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیوان اوفتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تاشد اکنون عاقل و دانا و زفت

ایک اور موقع پر مولانا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا فرمایا ہے —

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بہ حیوان سرزدم

مردم از حیوانی و آدم شدم　　پس چہ ترسم کہ ز مردن کم شدم
حملہ دیگر بہ میرم از بشر　　تا بر آرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پر آں شوم　　آنچہ اندر وہم نایہ آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں از غنون　　گویدم کانا الیہ راجعون

ایک اور مقام پر اسی مضمون کو اس طرح ادا فرمایا ہے —

باز از پستی سوے بالا شدم　　طالب آں دلبر زیبا شدم
چار بودم سہ شدم اکنوں دوم　　از دوئی بگذشتم و یکتا شدم

ایک اور مقام پر اسی مسئلہ کا اس طرح اظہار کیا ہے —

ساکنان راہ را محرم شدم　　ساکنان قدس را ہمدم شدم
کہ چو عیسیٰ جملگی گشتم زباں　　گہ لب خاموش چوں مریم شدم
آنچہ از عیسیٰ و مریم یاد شد　　گر مرا باور کنی آں ہم شدم
پیش نشتر ہاے عشق لم یزل　　زخم گشتم صدرہ و مرہم شدم
رو نمود اللہ عالم سر مرا　　کشتہ اللہ و پس عالم شدم

ارتقا کے مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد غالباً ناظرین اس بات کو نہایت آسانی سے سمجھ لیں گے کہ ارتقا کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ہستی جو ترقی کرتی ہے اپنی پہلی شکل کو چھوڑ کر دوسری شکل اختیار کرتی ہے - مثلاً جب تخم زمین میں بویا جاتا ہے - تاوقتیکہ وہ اپنی موجودہ ہستی کو فنا نہ کرے اس میں کسی قسم کے ارتقا کا پایا جانا ناممکن ہے - جب تخم اپنی ہستی کو فنا کر دیگا تو اس میں ارتقا ہوگا اور وہ درخت کی شکل میں رونما ہوگا - یہی مثال انسان کی ہے کہ انسان جب اپنی موجودہ ہستی کو اس غرض سے فنا کرتا ہے کہ وہ معبودہ سے نا معبودہ بنے تو اس فنا کو ہم عام مفہوم کے لحاظ سے فنا نہیں کہہ سکتے بلکہ اس فنا میں حقیقی بقا مضمر ہوتی ہے کیونکہ بغیر اس فنا کے انسان کسی قسم کی روحانی

ترقی نہیں کر سکتا انسان کی روح اور جسم میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک پام کے درخت اور اس کے کونڈے میں ہوسکتا ہے - درخت جب تک چھوٹا ہوتا ہے وہ چھوٹا سا کونڈہ اُس کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے درخت بڑھتا جاتا ہے وہ کونڈہ اُس کے لئے تنگی پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ کونڈا درخت کے بڑھ جانے سے پھوٹ جاتا ہے - اور ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ یا تو اس درخت کو کسی بڑے کونڈے یا زمین میں نصب کیا جائے تاکہ وہ اس کی ترقی میں کسی قسم کی مزاحمت نہ پیدا کرسکے - یہاں اس کونڈے کا ٹوٹ جانا درخت کی موت نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی حقیقی زندگی اس میں تھی کہ درخت زمین میں نصب کیا جائے - بالکل یہی مثال انسان پر ہوی منطبق ہوتی ہے کہ انسان کے جسم کا فنا ہونا اس کی موت نہیں کیونکہ حقیقی حیات روح کو حاصل ہے نہ کہ جسم کو - جسم روح کے لئے ایک آلہ کا کام دیتا ہے - جسم کے فنا ہونے سے روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس مقصد کے لئے جسم کا فنا ہونا کہ ہماری محدود روح اس نامحدود میں پورا اسی طرح مل جائے جس طرح قطرہ دریا میں مل جاتا ہے اس کے لئے حقیقی حیات و مسرت ہے - جیسا کہ غالب نے کہا ہے - (م) عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا - لہذا معلوم ہوا کہ " کسی چیز کے فنا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے معدوم ہوجائے بلکہ ایک ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ موجودہ صورت میں فنا ہوجائے - اس کی مثال مولانا روم نے اشعار ذیل میں اس طرح دی ہے —

لوح را اول بشوید پیرقوت انگہے بروے نویسد او حروف
چوں اساس خانۂ تو انگند اولیں بنیاد را بر می کند
گل بر آرند اول از قعر زمین تابہ آخر بر کشی مائے معین
ہستی آن نیستی بتواں نمود مال داراں بر فقیر آرند جود

ایک مقام پر مولانا نے اس کی اس طرح تشریح کی ہے کہ روح جسم سے جداگانہ ایک جوہر نورانی ہے - اور جسم کے فنا ہونے سے اس پر صرف اس قدر اثر پڑتا ہے جتنا کہ ایک کاریگر پر ایک خاص آلہ کے جاتے رہنے سے - لیکن ساتھ ہی اگر اس کو اس سے بہتر آلہ مل جائے تو کیا اس کو خوشی نہ ہو گی ؟

وجدان

انسان تصوف کے دائرہ میں داخل ہونے کے بعد غالباً اس پر وہ کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جس کا کہ وہ الفاظ کے ذریعہ اظہار نہیں کرسکتا - جیسا کہ غالب نے کہا ہے (شعر) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی - کچھ ہماری خبر نہیں آتی - یہ وہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے طاری ہونے کے بعد انسان میں ذات و غیر ذات کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اسی لئے فلسفۂ ویدانت میں کہا گیا ہے —

" تت توام اسی آہم برم مہا سمی "

حضرت رابعہ بصریہ نے اس کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے- کہتی ہیں - " مجھے نہ تو جہنم کا خوف باقی ہے اور نہ بہشت کی طلب و امید میرے دل میں محبت نبوی بھی نہیں چونکہ میں خدا کی محبت میں اس قدر جذب ہوں کہ کسی دوسری ذات سے محبت و نفرت کے لئے میرے دل میں جگہ ہی نہیں" —

مقامات فنا پر اگر انسان سرسری نظر ڈالے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ " مقام فنا میں انسان صفات الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے اور اُس عالم میں اُس کا اناالحق کہنا جائز ہے"- اس خیال کو مولانا نے مثنوی میں اس طرح اظہار کیا ہے —

رنگ آہن محو رنگ آتش است ز آتشے سے لا وز آہن وش است
چوں بہ سرخی گشت ہمچو زرکان پس انا النار است لافش بیگمان
شد ز رنگ و طبع آتش محتشم گوید او من آتشم من آتشم

آتشم سی گر ترا شک ست ظن ازمون کن دست را بر سی بزن

تصوف کا ثبوت آیات قرانی سے

بعض حضرات کا خیال ہے کہ تصوف اسلام میں ابتدا سے موجود نہیں بلکہ مسالک بدہ مت، ویدانت و مسیحیت کا اثر ہے کہ اسلام نے قبول کیا - لیکن پروفیسر نکلسن تصوف کے متعلق لکھتا ہے کہ

> اگر پیروان اسلام دنیا کے اور مسالک بدہ، مسیحی اشراقی وغیرہ سے الگ بھی رہتے تو بھی اسلام کے اندر قرانی تعلیم کی بنا پر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رونما ہوتی لہذا جب ایک محقق قران مجید پر اس نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے تو مفصلۂ ذیل آیات کی اہمیت نظر انداز نہیں کرسکتا - مثلاً یہ کہ زندگی کی بے ثباتی، موت کا ناگزیر ہونا دنیا کے انہماک سے پرہیز"

کل نفس ذائقۃالموت و انما توفون اجورکم یوم‌القیامہ فمن زخرج من‌النار و ادخل الجنۃ فقد فاز و مالحیوۃالدنیا الامتاع‌الغرور - (آل عمران)-

ترجمہ :- ہرنفس کے لئے موت ناگزیر ہے - اور تمہیں قیامت کے دن تمہاری مزدوری ملے گی اور وہ جو آتش دوزخ سے کنارے آے گا اور جنت میں داخل ہوگا خوش ہوگا اوردنیاکی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی ہے —

دیگر - یا ایھاالذین امنوا ان من ازواجکم و اولادکم و لکم فاحذروھم و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان‌اللہ غفور الرحیم - انما اموالکم و اولادکم فتنۃ و اللہ عندہ اجرٌ عظیم (تغابن)

ترجمہ :- اے ایمان والو تمہاری بیویاں اور تمہاری اولاد تمہارے دشمن ہیں - ان سے واقف رہو اور تم ان سے درگذر کرو اور اُن کے قصور معاف کردو - پس

اللہ بخشش کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے - تمہاری دولت اور تمہاری اولاد فتنہ ہے - اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے —

دیگر -زین للذین کفروالحیواۃ الدنیا (بقرہ)

ترجمہ :- کافروں کو حیات دنیوی کی زینت ملی -

دیگر - والذکر واللہ قیاماً وقعوداً و علی جنوبھم (آل عمران)

ترجمہ :- اور وہ کھڑے ہوے اور بیٹھے ہوے اور پہلوؤں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں -

دیگر - فاذ کروفی اذکرکم -(بقرہ)

ترجمہ :- پس تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کرتا ہوں -

ان تمام آیات قرانی سے ظاہر ہے کہ تصوت مذہب اسلام میں ابتدا سے داخل ہے نہ یہ کہ یہ آفریدہ ہے مختلف دیگر مذاہب کا جن کا اثر بعد میں مذہب اسلام پر پڑا - پس ایسی صورت میں مفتی محمد عباس صاحب مرحوم کی یہ تعلی کہ —

این کلامے صوفیاے شوم نیست مثنوی مولوی روم نیست

کس حد تک درست ہے - اور صوفیہ کو کس حد تک شوم کے لقب سے یاد کیا جاسکتا ہے ؟ خود ناظرین غور فرما سکتے ہیں -

عبادت

جب سالک تصوت کے ابتدائی مدارج کو طے کرلیتا ہے اور اس پر وہ کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جس کو تصوت کی اصطلاح میں مکاشفہ کہا جاتا ہے تو اس کے لئے اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ اس طریق عبادت کو اختیار کرے جو عامیوں کا طریق عبادت ہوتا ہے کیونکہ

ارباب تصوت کے نزدیک عبادت کا مفہوم اس سے الگ ہے جو عام علما اور ارباب ظاہر بیان کرتے ہیں - ان لوگوں کے نزدیک عبادت ایک قسم کی مزدوری ہے جس کے صلے کی توقع یا تعمیل حکم ہے جس کے نہ بجالانے سے سزا کا خوف ہے

لیکن تصوف میں عبادت کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی
توقع یا خوف کے محض محبت الٰہی اس کا باعث ہو"۔

اسی مضمون کو کسی شاعر نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس طرح ادا کیا ہے کہتا ہے :

سوداگری نہیں ہے عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

عبادت ظاہری کی پابندیوں اور اس کے عامیانہ مقاصد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پابندیوں اور مقاصد ظاہری کے مد نظر حقیقی عبادت و زہد کا مقصد بالکل فوت ہوجاتا ہے - تا وقتیکہ انسان سزا و جزا کے خیال کو دل سے نہ مٹادے اُس کی عبادت ہرگز سچی عبادت نہیں کہی جاسکتی - کیونکہ ایسی صورت میں اس عبادت کرنے والے کے پیش نظر وہ مقصد ہوتا ہے جس کو عبادت کا مقصد قرار دیتے ہوئے شرم آتی ہے تاوقتیکہ حوران بہشتی اور جنت کے سرسبز و شاداب باغ شیریں نہریں اور قصر زمردین کا خیال یک لخت دماغ سے دور نہ کیا جائے اُس کا اطلاق یقیناً مزدوری پر ہوگا نہ کہ عبادت خداوند متعال پر - بعض لوگوں نے تو اس خیال کو افراط کے اس درجہ پر پہونچایا کہ اطاعت و عبادت کا خیال بھی ایک قسم کی غلامانہ ذہنیت ہے- اسی لئے ان لوگوں نے اس کے بجائے یہ تخیل پیش کیا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ارادے اور خواہش کو خدائے تعالیٰ کے ارادوں اور خواہشات میں اس طرح فنا کردے کہ جس طرح قطرہ دریا میں اپنی ہستی کو فنا کردیتا ہے اور اس قسم کی فنا میں حقیقی اور سچی بقا ہمیشہ مضمر ہوتی ہے —

دوسری بات جو اسی عنوان کے تحت قابل غور ہے یہ ہے کہ اگر عبادت میں ظاہری پابندیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے تو بھی عبادت کا حقیقی مقصد فوت ہوجاتا ہے

کیونکہ جب تک انسان کی توجہ ظاہری پابندیوں کی طرف مائل رہے گی اس پر وہ کیفیت ہرگز نہیں طاری ہوسکتی جس کو علما کی اصطلاح میں خضوع و خشوع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کو نماز کا جز قرار دیا جاتا ہے جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوجاتی ہے تو پھر وہ ان تمام پابندیوں کو معمول کردیتا ہے۔ اس بحث کو ہم دوسرے الفاظ میں اس طرح ادا کرسکتے ہیں کہ جب تک انسان ظاہری پابندیوں میں مقید ہوتا ہے اُس کو خضوع و خشوع حاصل نہیں ہوسکتا اور جب خضوع و خشوع حاصل ہوجائے تو پھر وہ ظاہری پابندیوں کا مقید نہیں رہ سکتا۔ اسی کیفیت کو ذیل کے شعر میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے کہتے ہیں :

ہم اور زبان حال کسی دم بہم نہیں
ہم ہیں تو بے زبان زباں ہے تو ہم نہیں

یہی وجہ ہے کہ "ارباب ظاہر عبادت کے لئے اوقات معینہ کے پابند نہیں لیکن اہل دل کے لئے ہر وقت عبادت کا وقت ہے"۔ چنانچہ، مولانا روم فرماتے ہیں :

پنج وقت آمد نماز رہنمو — عاشقانش را صلوٰۃ دائمو
نہ بہ آرام گیرد آن خمار — راست گویم نہ بہ صد نہ صد ہزار
نیست زر غبا نشان عاشقاں — سخت مستقی ست جان عاشقاں
نیست زر غبا طریق ماہیاں — زانکہ بے دریا ندارد انس و جان
آب این دریا کہ ہائل بقعہ ایست — با خمار ماہیا یک جرعہ ایست
یک دم ہجران بر عشق چو سال — وصل سالے متصل پیشش خیال
عشق مستقسی ست مستقسی طلب — در پئے ہم این وآن چون روز و شب
ہیچ کس با خویش زر غبا نمود — ہیچ کس با خود بہ نوبت یار بود

اسی مضمون کو کہ عالم استغراق میں تکلفات شرعیہ کی پابندی باقی نہیں

رہتی مولانا نے اس طرح ادا کیا ہے

موسیا ! آداب دانان دیگر اند　　سوختہ جان و ر دانان دیگر اند
خون شہیدان را ز آب اولی تر است　　این گناہ از صد ثواب اولی تر است
در بیان کعبہ رسم قبلہ نیست　　چہ غم از غواص را پا چیل نیست
عاشقان را ہر زماں سوزیدہ نیست　　بر دہ ویران خراج و عشر نیست

تصوف اور سلوک

تصوف اور سلوک کے مسائل عام ادراک بشری سے خارج ہیں۔ اس لئے جو شخص خود اس عالم میں نہ آئے وہ ان باتوں پر یقین نہیں کرسکتا۔ یہی حال الہیات کے اکثر مسائل کا ہے کہ عام لوگ ان مسائل کے سمجھنے سے بھی اکثر قاصر رہتے ہیں مثلاً یہ کہ روح کیا ہے خدا کیا ہے مادہ کیا ہے روح کا خدا سے کیا تعلق ہے کائینات اور خدا میں کیا تعلق ہے روح کو مادہ سے کیا تعلق ہے آیا مادہ کا کوئی حقیقی وجود ہے بھی کہ نہیں۔ بہرحال اسی طرح کے اور مختلف مسائل ہیں کہ جو بڑی مشکل سے سمجھہ میں آتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ ہر شخص کے طریقہ تفہیم و استدلال میں کچھہ نہ کچھہ فرق بھی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تصوف اور سلوک کے مسائل کو سمجھانے کے لئے عموماً مثالوں سے مدد لیجاتی ہے۔ اس خیال کو مولانا نے ایک مقام پر اس طرح ادا فرمایا ہے —

خوشتر آں باشد کہ راز دلبران　　گفتہ آید در حدیث دیگران

مسئلہ سلوک یا مسئلہ فنا و توکل سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ فنا کے متعلق گذشتہ چند سطروں میں کچھہ بیان کیا گیا ہے لہذا یہاں صرف توکل کے متعلق کچھہ تحریر کرنا کافی ہوگا —

(توکل) مسئلہ فنا کی طرح مسئلہ توکل سے متعلق بھی آراء میں اختلاف ہے بعضوں نے توکل کے یہ معنی قرار دیے کہ انسان کو کسی قسم کی کوشش کرنے

کی ضرورت نہیں جو کچھہ ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور جو کچھہ کرنے والا ہے وہ خدا ہی ہے لہذا انسان کو ہمیشہ خدا پر توکل کرنا چاہئے اور ہر حالت میں قناعت سے کام لینا چاہئے اس خیال کے فرقہ کو مذہبی اصطلاح میں جبریہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - بر خلاف اس کے دوسرا فرقہ قدریہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - اُس کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہاتھہ پاؤں عطا کئے ہیں اور اُس کو عقل بھی دی ہے کہ وہ ان کا استعمال کرے- جو بھی ہوتا ہے اُس کا ذمہ دار خود انسان ہے خدائے تعالیٰ کا اُس میں کوئی دخل نہیں - اس کے ثبوت میں وہ جزاء و سزا کے اٹل مسائل پیش کرتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو فریق مبالغہ سے کام لے رہے ہیں - انسان نہ تو اس قدر مجبور محض ہے جیسا کہ جبریہ کا خیال ہے اور نہ اس قدر مختار کل جیسا کہ قدریہ خیال کرتے ہیں - ابن رشد بھی اسی خیال کا حامی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ مختار کل - بلکہ انسان ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے کیونکہ انسان اپنے ماحول فطرت اور عادت سے ایک حد تک تو مجبور ہے جیسا کہ جبریہ کا بیان ہے اور ایک حد تک وہ مختار بھی ہے کیونکہ باوجود ان تمام مجبوریوں کے وہ وہی کرتا ہے جس کا کہ وہ ارادہ کرتا ہے- اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات اُس کا ارادہ جذبات کی غلامی بھی کرتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی عقل کو بھی کام میں لاتا ہے قریب‌قریب یہی خیال مولانا کا بھی ہے مولانا نے اس افراط و تفریط کا اس طرح تصفیہ فرمایا- چنانچہ فرماتے ہیں کہ توکل کے یہ معنی نہیں کہ انسان ہاتھہ پر ہاتھہ دھرے خاموش بیٹھا رہے اور یہ خیال کرے کہ خدا جو چاہے گا کرے گا ہم کو کوشش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ انسان جہاں تک اس سے ممکن ہو کوشش کرے اور نتیجہ کے لئے خدا پر توکل کرے اگر کسان محنت کو نہ بوئے اور یہ خیال کرے کہ خدا جو

چاہتا ہے کرتا ہے ہم کو کوشش کرنے کی ضرورت نہیں تو کبھی بھی اُس کا کھیت شاداب و سر سبز نہیں ہو سکتا - توکل کے تو یہ معنی ہیں کہ کسان زمین کو صاف بھی کرے اور اُس میں تخم بھی بوئے اور اُس کے نتیجہ کے لئے خدا پر توکل کرے مولانا نے اس مسئلے کو ایک فرضی مذاکرہ کے ذریعہ طے کیا ہے یہ مناظرہ شیر اور جنگل کے دیگر جانوروں میں واقع ہوتا ہے ذیل کے اشعار پر جو اسی مناظرہ سے نقل کئے جاتے ہیں غور کریں تو کافی روشنی پڑتی ہے -

گفت پیغمبر بآواز بلند　　بر توکل زانوے اشتر بہ بند

جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو چاہئے کہ خدا پر توکل کرے اور حسب مقدور سعی بھی کرے چنانچہ اسی مناظرہ میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :

سعی شکر نعمت قدرت بود　　جبر تو انکار آن نعمت بود

شکر نعمت نعمتت افزوں کند　　کفر نعمت از کفت بیروں کند

گر توکل مے کنی در کار کن　　کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

مقامات سلوک

مقامات سلوک میں مشاہدہ کو سب سے پہلے جگہ دی جاتی ہے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے سالک پر حقیقت کے دروازے کھلنے لگتے ہیں - یہ ایک صاف بات ہے کہ تاوقتیکہ انسان کسی شے کا مشاہدہ نہ کرے وہ اس کی حقیقت سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتا یہی حال سائنس کا بھی ہے کہ انسان کو مختلف تجربے ہوتے ہیں اس کے بعد وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور ان تجربات میں عمومیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے —

مشاہدہ کے بعد جس کیفیت کا سالک کو تجربہ ہوتا ہے وہ مقام حیرت ہے کہ کسی غیر معمولی تجربہ یا مشاہدہ پر اس کو حیرت ہوتی ہے ' اور جب وہ عالم حیرت سے ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے تو وہ غور و فکر کے میدان میں قدم رکھتا

ہے اور ان مشاہدات پر نظر ثانی کرتا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہی وہ مقام ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں مقام فکر کہا جاتا ہے ان تمام کیفیات سے گذرنے کے بعد مقام فنا میں سالک قدم رکھتا ہے اور اس طرح ظاہری فنا میں بقائے حقیقی کو تلاش کرتا ہے - مقامات فنا اور بقا کے درمیان سالک کو ایک اور مقام سے دو چار ہونا پڑتا ہے جس کو فلسفہ کی اصطلاح میں مقام توکل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کا ذکر آپکا ہے —

توکل کی مزید توجیہ

سالک جب مقام توکل میں قدم رکھتا ہے تو اس پر وہ حالت طاری ہوجاتی ہے کہ وہ تمام عالم سے قطعاً بے نیاز ہوجاتا ہے اس کو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تقدیر سے ہو رہا ہے جس میں اس کو کوئی اختیار نہیں - جس طرح کٹ پتلیوں کے تماشہ میں کہ جس شخص کی نظر ان تاروں پر ہوتی ہے جن کے ذریعہ وہ حرکت کرتی ہیں وہ یہ سمجھتا ہے یہ تمام حرکات نتیجہ میں تاروں کی حرکت کا اور یہ تمام کھیل کوشمہ ہے اس شخص کا جو تاروں کو حرکت دے رہا ہے مقام توکل میں سالک کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ایک کٹ پتلی کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے اور اس چھپے ہوئے بازیگر کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے جس کو خدائے قدیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ تمام عالم سے بے نیاز ہوجاتا ہے - اور رفتہ رفتہ اس کی قوت ارادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ اپنے کو دلتاً رضائے الٰہی پر چھوڑدیتا ہے "یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچکر سالک اپنی ہستی کو مٹادیتا اور ذات الٰہی میں فنا ہوجاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچکر منصور نے اناالحق اور بایزید بسطامی نے سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا محمود شبستری نے اس نکتہ کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ سے سمجھایا ہے وہ کہتے ہیں —

روا باشد اناالحق از درختے چرا نبود روا از نیک بختے

پھر یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ نے درخت پر جو روشنی دیکھی تھی وہ خدا نہ تھی لیکن اُس سے یہ آواز آئی کہ 'انا ربک' یعنی میں تیرا خدا ہوں جب ایک درخت کا دعویٰ اس بناء پر جایز ہے کہ وہ خدا کے نور سے منور ہوگیا تھا تو انسان جو قدرت الہی کا سب سے بڑا مظہر ہے ایک خاص مقام پر پہنچ کر کیوں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا مولانا نے اس مقام کو مختلف تشبیہوں سے سمجھایا ہے کہ عوام کا اعتقاد ہے کہ انسان پر جب کبھی کوئی جن مسلط ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ جو کچھہ کرتا ہے یا کہتا ہے وہ اُس جن کا قول و فعل ہوتا ہے جب جن کے تسلط میں یہ حالت ہوتی ہے تو نور الہی جس شخص پر چھا جاے اُس کی یہ حالت کیوں کر نہ ہوگی —

چوں پری غالب شود بر آدمی گم شود از مرد۔ وصف مردمی
ہر چہ گوید آں پری گفتہ بود زیں سرے نہ زاں سرے گفتہ بود
خوے او رفتہ پری خود او شدہ ترک بے الہام تازی گو شدہ
چوں بخود آید نہ داند یک لغت چوں پری راہست ایں ذات و صفت
پس خدا وندی پری و آدمی از پری کے باشدش آخر کمی
چوں پری را ایں دم و قانوں بود کردگار آں پری خود چوں بود

بعض حضرات کو غالباً یہاں اعتراض ہوگا کہ جن و پری کے قصے تو قصے ہی ہیں حقیقت و واقعات سے اس کا کیا تعلق۔ اظہار حقایق میں جن و پری کے قصوں کے ذریعہ استدلال کرنا بوالعجبی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ خواہ نام جن کا دیا جاے یا پری کا یا اُس قوت کو کسی اور نام سے یاد کیا جاے لیکن موجودہ سائنس بھی خود یہاں ساکن نظر آتی ہے اور اس قسم کے واقعات کی کوئی قابل تشفی علمی توجیہہ نہیں کرسکتی کہ اس قسم کی حالت میں جب بعض افراد پر

یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ گذشتہ اور آئندہ کے متعلق صحیح بیان کیونکر دے سکتی ہیں اسکاٹ لینڈ کی ایک لڑکی کا حال ہی کا واقعہ ہے کہ یہ لڑکی اپنے کو عربی النسل بتلاتی اور یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ کسی ہندو راجہ کی بیوی تھی یہ لڑکی خاص عربی بول سکتی تھی - اس طرح کا اور واقعہ حال ہی میں میرے ایک عزیز نے جن کو فلسفہ اور نفسیات سے بہت زیادہ دلچسپی ہے مجھ کو ایک اخبار سے پڑھ کر سنایا اس اخبار میں مختلف تصویریں دی گئی تھیں جو فن مصوری کے لحاظ سے ایک بہتر مصور کی شاہکار سمجھی جاسکتی ہیں - اس میں اس مصور کے حالات یوں تحریر کئے گئے تھے کہ اس مصور کے کوئی تقریباً ایکزار شاہکار اس وقت موجود ہیں کہ جن کو وہ مصور اس وقت تیار کرتا تھا جب کہ اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی - اور ایک تصویر کے بنانے کے لئے اس کو زیادہ سے زیادہ تیس (۳۰) منٹ کا وقفہ کافی تھا غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی جب نہ علوم اس قدر ترقی کر چکے ہیں ان کی کیا توجیہ پیش کرسکتے ہیں یوں تو بہتے کو بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن اب تک کسی ماہر نفسیات نے اس قسم کے واقعات کی کوئی قابل تشفی علمی توجیہ نہیں پیش کی —

ایسی صورت میں ہم مولانا روم کے اس استدلال کو اس وقت تک غیر صحیح نہیں کہہ سکتے - جب تک کہ ہم اس قسم کے موجودہ واقعات کی کوئی عام اطمینان بخش توجیہ پیش نہ کرلیں —

توکل سے متعلق اوپر جو کچھ بحث گزر چکی ہے اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ مولانا کے عقائد نہائت پست کن ہیں اور عملی زندگی کے لئے وہ بالکل مفید نہیں - کیونکہ مولانا نے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے توکل کے صحیح مفہوم کی کافی توجیہ کی ہے اور یہ ثابت کر دکھلایا ہے کہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ

انسان مقدور بھر کوشش کرے اور نتیجے کے لئے خدا پر توکل کرے —

حلول و ظہور

تصوف کی اس تمام بحث کے بعد حلول و ظہور کے فرق کو بھی واضح کردینا نہایت ضروری ہے حلول کے جو معنی عام طور پر خیال کئے جاتے ہیں یہ ہیں کہ خدا کسی ذات میں حلول کر سکتا ہے اور خدا کے اس ذات میں حلول کرنے کے بعد وہ ہستی اپنے میں اور خدا میں کوئی فرق نہیں کرتی - ایسی صورت میں اس ہستی کا اپنے کو خدا کہنا جائز ہے جیسا کہ منصور کا اناالحق کہنا صوفیہ کے پاس جائز قرار پاتا ہے - اسی طرح بایزید بسطامی وغیرہ کی مثالیں ہیں کہ جس وقت ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی وہ اپنے میں اور خدا میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے تھے - اور کہتے تھے سبحانی ما اعظم شانی - اور ظہور کے یہ معنی خیال کئے جاتے ہیں کہ خدا ہر ذات میں ظہور کرتا ہے اور کر سکتا ہے - اور وہ ذات خدا کا مظہر کہلاتی ہے - اس طرح زید - عمر - بکر - جہاز - پتا وغیرہ خدا کا مظہر کہلائے جاسکتے ہیں - لیکن ان ذاتوں کو ذات خداوند تعالیٰ سے وہی تعلق ہوگا جو تعلق کہ قطرے کو دریا سے ہے - قطرہ دریا کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے اس کا مظہر کہلایا جا سکتا ہے لیکن اگر قطرہ یہ کہنے لگے کہ میں دریا ہوں تو وہ بالکل ناجائز ہوگا - کیونکہ قطرہ دریا کا ایک جز ہے نہ کہ خود دریا - اس لحاظ سے صوفیہ کا یہ خیال کہ خدا انسان میں حلول کرتا ہے غلط ٹھیرتا ہے - مولانا روم نے حلول کے اس مسئلے کو اس طرح واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ لوہے کو اگر آگ میں ڈال دیا جائے تو تھوڑی دیر بعد لوہا بھی مثل آگ کے سرخ ہوجائے گا - اور یہ بہت مشکل ہوگا کہ ہم لوہے اور آگ میں تمیز کرسکیں - ایسی صورت میں لوہے کا یہ کہنا کہ میں آگ ہوں غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں لوہے میں تقریباً تمام وہی خصوصیات پائے جاتے ہیں جو آگ میں ہوتے ہیں - اور یہی مثال انسان اور خدا کی ہے کہ انسان جب اپنی

ذات کو خدا کی ذات میں محو کردیتا ہے تو پھر اس کا یہ کہنا درست ہے کہ میں خدا ہوں —

لیکن اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان تمام خصوصیات کے ہم لوہے کو آگ نہیں کہہ سکتے کیونکہ لوہا باوجود ان تمام خصوصیات کے اپنی ذات کو بالکل فنا نہیں کردیتا اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ہم لوہے اور آگ میں تمیز کر سکتے ہیں اور لوہے کو آگ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا خدا سے وہی تعلق ہے جو تعلق کہ قطرے کو دریا سے ہوتا ہے —

تاج محل کو دور سے دیکھ کر

از

سید محمد اکبر صاحب وفا ملکانی بی اے (عثمانیہ) سابق مدیر مجلہ

ایک خواب کی دنیا کو کھڑا دیکھ رہا ہوں
میں دہر میں تعبیر فنا دیکھ رہا ہوں
وہ گنبد و محراب وہ مینار نگینہ
جوں محو تبسم کوئی خوابیدہ حسینہ
یوں دور درختوں میں جو جلوہ نظر آیا
بادل سے کوئی چاند نکلتا نظر آیا
ہر شئے متناسب کوئی کوہر کی لڑی ہے
ایک دور ہے جو سرحدی جامے میں کھڑی ہے
ہر قبہ چمکتا ہوا ہیرے کی کنی ہے
یہ ہند کا احرام زلیخا بنی ہے
دوشیزۂ اقبال سلاطیں کہیں اس کو
تیمور کی اولاد کی تمکیں کہیں اس کو
گنبد ہے کہ یہ لعبت مہ شاہ جہاں ہے
جو اپنی تمنا کے لئے خود نگراں ہے

تنقید*

از

جناب محمد جمال الدین صاحب 'اشک' مدیر مجلہ عثمانیہ

اصلی اور محدود معنوں کے لحاظ سے عام طور پر کوی تی سی زم (تنقید) سے مراد "فیصلہ" لی جاتی ہے - جب ہم اس لفظ کو عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں تو عموماً اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے - یعنی ایک تنقید نگار کسی شاعر یا ادیب کے کلام اور تصانیف کے متعلق ان کے اچھے یا برے اعلیٰ قسم کے یا ادنیٰ قسم کے ہونے کا "فیصلہ" کرتا ہے - تاہم جب ہم "ادبی تنقید" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس اصطلاح کے معنی اتنے محدود نہیں رہتے - بلکہ ان میں خاصی وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور ہم تنقیدی ادب کو ایک ایسی چیز تصور کرتے ہیں جو محض "فیصلہ" سے کہیں زیادہ اہم اور وسیع ہوتی ہے - تنقیدی ادب میں ہم ان تمام چیزوں کو داخل کرلیتے ہیں جو ادب کے متعلق لکھی گئی ہیں خواہ ان کا مقصد تحلیلی ہو یا توضیحی یا معیار کو متعین کرنا - شاعری، ڈراما اور ناول راست زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور تنقیدی ادب کا محور شاعری، ڈراما اور ناول ہوتے ہیں اگر تخلیقی ادب کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کا بڑا

---

* یہ مضمون مسٹر ہڈسن کی مشہور و معروف کتاب Introduction to the study of literature سے ماخوذ ہے —

مقصد زندگی کی ترجمانی ہے تو بلا تامل تنقیدی ادب کے متعلق بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس قسم کی ترجمانی کا ترجمان یعنی توضیح اور تفسیر کرنے والا ہے —

تنقید پر عام اعتراضات

تنقید پر اکثر اوقات اعتراضات کئے جاتے ہیں اور اس کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق بعض غلط خیالات پھیلے ہوے ہیں - ایک اعتراض جو عام طور پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ ہمیں شاعر اور ادیب سے راست سروکار رکھنا چاہئے کسی شاعر یا ادیب کا کلام یا تصانیف ہی ایسی چیزیں ہوسکتی ہیں جن سے ہمیں دلچسپی ہو اور جن کا مطالعہ ہمیں بذات خود بغیر کسی واسطے کے کرنا چاہئے - جب اس امر کو تسلیم کرلیا جاے تو پھر ان درمیانی واسطوں کو جن کو نقاد کہتے ہیں کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے - ہم اپنا گراں بہا وقت شیکسپیئر اور دانتے کے کلام کا مطالعہ کرنے میں کیوں نہ صرف کریں اور کیوں ہم ان نقادوں کی ضخیم تصانیف کو پڑھنے میں مشغول رہیں جنہوں نے ان شعراء کے کلام پر تنقیدیں لکھی ہیں - کتابوں کے متعلق اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ہمارے کتبخانے ان سے اٹے پڑے ہیں اور اگر ہم ان پر ایک غلط انداز نظر بھی ڈالیں تو اس سے ہماری توجہ میں انتشار پیدا ہونا یقینی ہے - اگر اتنا ہی ہوتا تو پھر بھی غنیمت تھا - لیکن حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں - خود نقادوں کے متعلق اتنی تنقیدیں لکھی گئی ہیں کہ ان کا خیال کرتے ہوے دم گھٹنے لگتا ہے - لطف یہ ہے کہ ہر تنقید نگار دوسرے کی راے سے اختلاف کرتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کے کلام یا تصانیف کی جو کچھ توضیح یا تشریح وہ کررہا ہے بس وہی درست ہے اور باقی سب نقاد غلطی میں مبتلا ہیں - دور حاضر میں اس قسم کی تصانیف کی بڑی گرم بازاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عام طور پر ایسی کتابیں کثرت سے

پائی جاتی ہیں جو نہ صرف کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہیں بلکہ ان کتابوں کے متعلق ہیں جو کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہیں --

اگر ہم اس قسم کی کتابوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے تنقیدی ادب میں تنقید کی ضخیم تاریخیں ہیں- عمر و زید جیسے نقادوں کے طریقۂ تنقید پر تفصیلی کتابیں ہیں- رسالوں کے ایسے طول طویل مضامین ہیں جن میں مذکورۂ بالا کتابوں کے خلاصے کئے گئے ہیں- اس طرح ہمیں بہکایا جاتا ہے کہ دنیا کے عظیم الشان ادب کا راست مطالعہ کرنے کے بجائے معمولی اور ادنیٰ قسم کی تصانیف میں اُلجھ کر رہ جائیں- مثلاً شرر (Scherer) صاحب ملٹن کی فردوس گم گشتہ پر ایک تنقید لکھ مارتے ہیں ان کے بعد میا تھیو آرنلڈ صاحب تشریف لاتے ہیں اور شرر صاحب کی تنقید پر تنقید کرتے ہیں' ممکن ہے کہ ہمیں اس امر سے دلچسپی ہو کہ شرر صاحب کا نقطۂ نظر ملٹن کی شاعری کے متعلق معلوم کریں- اور اس کا بھی امکان ہے کہ میا تھیو آرنلڈ کا نقطۂ نظر شرر کی تنقید کے متعلق جاننے کا ہمیں اشتیاق ہو اور اسی طرح اور حضرات کے خیالات جو میا تھیو آرنلڈ کی تنقید کے متعلق ہوسکتے ہیں ہم جاننا چاہتے ہوں- لیکن اس صورت حال میں بڑا اندیشہ اس بات کا ہے کہ ہم خود ملٹن کو فراموش کردیں اور اپنی فرصت کے اوقات اس قسم کی تنقیدیں دیکھنے میں ضائع کردیں- اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نقاد کا وجود دنیائے ادب کے لئے ایک بار گراں ہے اور وہ ہم میں اور حقیقی ادب میں ایک دیوار کی طرح حائل ہوکر ہمیں ادب کے پر لطف نظاروں سے بڑی حد تک محروم رکھتا ہے- یہ تو ظاہر ہے کہ کسی عہد آفرین ادب سے براہ راست واقفیت حاصل کرنا اور چیز ہے اور اس سے دوسروں کے توسط سے واقف ہونا چیزے دیگر --

یہ اور اسی قسم کے اور اعتراضات نہایت درست اور معقول نظر آتے ہیں-

خاص کر موجودہ زمانے میں جب کہ تخلیقی ادب بے شمار شرحوں اور تفسیروں کے نیچے بری طرح دبا جا رہا ہے ان کی معقولیت میں کوئی شک یا شبہ پیدا نہیں ہوسکتا - لیکن باوجود اس صورت حال کے ہم تنقید کی اہمیت اور ضرورت سے کسی طرح انکار نہیں کرسکتے - حقیقت یہ ہے کہ تنقید اگر اس میں معقولیت اور اعتدال پایا جائے تو ادب کے لئے نہایت ضروری اور ناگزیر چیز ہے —

تنقید ادب کی حیثیت میں

اس موقع پر مجھے ایک خاص نکتہ کی طرف جسے عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے ناظرین کو متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - اگرچہ ادب میں جو راست زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور تنقید میں جس کا موضوع ایسا ادب ہوتا ہے ایک نمایاں اور بنیادی فرق تسلیم کیا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فرق زیادہ تر مصنوعی ہے یعنی حقیقی اور اصلی نہیں ہے - ادب زندگی کے ان اہم امور سے تشکیل پاتا ہے جو ہمارے لئے بے حد دلفریب اور دلچسپ ہوتے ہیں - لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ " شخصیت " بھی انہی دلچسپ اور دلفریب امور میں داخل ہے - بلکہ اس کی اہمیت اور امور سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے - اس سے لازما یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نقاد جو کسی بڑے شاعر یا ادیب کی شخصیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے فی الحقیقت ایک ایسی چیز سے بحث کرتا ہے جو زندگی سے قریبی اور اہم تعلق رکھتی ہے اور اس طرح وہ اس شاعر یا ڈرامہ نگار سے جس کے کلام یا تصانیف پر وہ تنقید کر رہا ہے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا - اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک بلند پایہ کتاب اپنے دوررس نتائج اور اثرات کے لحاظ سے وہی درجہ رکھتی ہے جو کسی یادگار اور نا قابل فراموش " کار نمایاں " کا ہوتا ہے - ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں ادب اور تنقید میں کوئی بنیادی اور اصلی فرق قائم کرنے کی ضرورت نہیں اور جو اعتراضات کہ اس طرح کا فرق قائم

کرنے سے پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی بحث کرنا غیر ضروری ہے - واقعہ یہ ہے کہ حقیقی تنقید ایک طرح سے تخلیقی ادب کے زمرے میں داخل کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ بھی اپنا مواد شاعری کی طرح زندگی ہی سے حاصل کرتی ہے - البتہ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تنقید کی برائیوں اور اس کے فوائد سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں تاکہ ہم اس فن شریف سے ممکنہ فوائد تو حاصل کرلیں لیکن اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں - خوش قسمتی سے یہ مسئلہ ایسا پیچیدہ نہیں ہے کہ اس کو حل کرنا ہمارے لئے بہت زیادہ دشوار ہو - اگر ہم اپنے تجربات سے کام لیں تو نہایت آسانی سے اس امر کا پتہ چل سکتا ہے کہ کب تنقید ہمارے لئے سود مند ہوتی ہے اور کب یہ مضرت رساں بن جاتی ہے —

تنقید کی خرابیاں

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تنقید اس وقت مضرت رساں ثابت ہوتی ہے جب ہم کسی خاص نقاد کے چند مضامین پڑھ کر اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس شاعر یا ادیب کے کلام یا تصانیف کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے جس کے متعلق یہ مضامین لکھے گئے ہیں - یہ ایک خطرناک امر ہے کہ کسی عظیم الشان شخصیت سے ہم بالواسطہ واقفیت حاصل کریں اور براہ راست اس کی عظمت کا پتلا چلانے کی کوشش سے دستکش ہو جائیں - حصول علم کے لئے راہ راست کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں کو اختیار کرنا آج کل بہت مروج ہے ہماری کاروباری زندگی متضاد اغراض و مقاصد کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن گئی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری فرصت کے اوقات بہت کم اور محدود ہو کر رہ گئے ہیں - ایک طرف تو ہم دنیا کے شہرۂ آفاق شاعروں اور ادیبوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ سوسائٹی میں عزت کی نظروں سے دیکھے جائیں اور دوسری طرف ہمیں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ان کے شاہکاروں کا اطمینان سے مطالعہ کریں

اور اُن کی خصوصیات کا بطور خود پتہ چلائیں مثلاً اُڈیسے (Odyssey) کو شروع سے آخر تک پڑھنا ایک ایسا کام ہے جس کو ہم میں سے اکثر اس بنا پر ناپسند کریں گے کہ وہ بہت طولانی ہے - علاوہ ازیں صرف اُڈیسے ہی ایک ایسی کتاب نہیں ہے جس سے ہم واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں - بلکہ اس کے علاوہ اور سیکڑوں کتابیں ہیں جن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنا ہمارے لئے ضروری ہے - ایسی صورت میں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ ایسی طولانی کتابوں کے خلاصوں پر اکتفا کریں اور جہاں تک ہو سکے تھوڑے سے وقت میں ان کتابوں کے مضامین اور خصوصیات سے واقف ہو جائیں - بعض لوگ اس عام رجحان کو قابل ملامت قرار دیتے ہیں - لیکن یہ ان کی غلطی ہے - ہمیں عملی نقطۂ نظر سے اس صورت حال کا مطالعہ کرنا ضروری ہے - یہ خیال کہ ادب کی تمام بلند پایہ اور اہم کتابوں کو غور و فکر سے بالاستیعاب پڑھنا ضروری ہے قطعاً ناقابل عمل ہے - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُڈیسی یا اس قسم کی اور بہت سی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا لازمی ہے اور بالفرض اگر ہم ایسا نہ کر سکتے ہوں تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ان کے مضامین اور مطالب سے قطعاً ناواقف رہ جائیں ؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑے تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے - میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مختصر سے مختصر خلاصوں کے توسط سے دنیا کی عہد آفرین کتابوں کے مضامین اور خصوصیات سے واقفیت حاصل کرنا اس امر سے کہیں زیادہ بہتر اور مناسب ہے کہ ہم ان سے بالکل نا واقف رہ جائیں - زندگی بہت مختصر ہے اور اس مختصر سی زندگی میں ہمیں سیکڑوں کام انجام دینے پڑتے ہیں اس لئے ہماری فرصت کا زمانہ اور بھی زیادہ قلیل ہے ظاہر ہے کہ اس مختصر زندگی اور مختصر زمانۂ فرصت میں ہم دنیا کے عظیم الشان ادب سے بہت تھوڑی حد تک واقف ہو سکتے ہیں - لیکن فطری طور پر ہمارے دل میں مشاہیر شعرا کے خیالات اور ان کے شاہکاروں سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے

اس فطری شوق کو نا مناسب قرار دینے کی کوشش کرنا محض فضول اور بیکار ہے اور اور اس سے زیادہ مہمل اور فضول بات یہ ہوگی کہ ہم مختلف نقادوں کے کئے ہوئے خلاصوں اور شرحوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کریں - کیونکہ موجودہ حالات میں اس قسم کی کتابوں کی ضرورت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا - مثلاً ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ والٹیر اٹھارویں صدی کے بلند پایہ اہل قلم میں سے ہے - وہ نہ صرف انفرادی طور پر بڑا درجہ رکھتا ہے بلکہ تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی شخصیت غیر معمولی اہمیت کی مالک ہے - ایسے عظیم المرتبت انسان کے متعلق یہ یقینی ہے کہ چند خاص سوالات پیدا ہوں - اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اس کے مقاصد کس قسم کے تھے ؟ اس کے طریقے اور اس کی کامیابیاں کیسی ہیں ؟ تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے اس کی تصانیف کیا درجہ رکھتی ہیں؟ کیا وہ غیر فانی شاعر ہے اگر وہ غیر فانی شاعر ہے تو کیوں ہے ؟ اس قسم کے سوالات فطری طور پر ہمارے دلوں میں پیدا ہوں گے اور ہم اس بات کے خواہاں ہوں گے کہ ان کا کم از کم کوئی عام اور سرسری جواب ہمیں مل جائے - لیکن والٹیر کی جملہ مطبوعات کی تعداد دوسو ساٹھ سے بھی کچھ زیادہ ہے - اس نے غزلیں لکھیں رزمیہ نظمیں لکھیں ڈرامہ نگاری کی ' تاریخیں اور سوانح عمریاں ترتیب دیں ' فلسفیانہ قصص اور فلسفیانہ مقالے شائع کئے - ایک معمولی ناظر کے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ والٹیر کی ان کثیر التعداد تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرے اور اس کی خصوصیت اور اہمیت کا بطور خود پتہ چلائے - اگر لارنسارلی کی قابل تعریف کتاب جو صرف چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے موجود نہ ہوتی تو غالباً والٹیر کی شخصیت ایک سر بہ مہر حقیقت ہی رہ جاتی جس سے واقفیت حاصل کرنا عام ناظرین کے لئے تقریباً ناممکن ہوجاتا - مذکورۂ بالا کتاب کی موجودگی میں وہ یقیناً والٹیر کی فطری استعداد ذاتی خصوصیات ' غیر معمولی ذکاوت اور قابل رشک

مفہومیت غرض کہ اس کے جملہ محاسن سے بہت اچھی طرح واقف ہوسکتے ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر وہ مصنف مذکور کی جملہ تصانیف کا سرسری مطالعہ بھی کرلیں تب بھی ان کی معلومات اس کے متعلق اتنی زیادہ صاف اور واضح نہیں ہو سکتیں جتنی کہ انہیں ساولی کی مذکورۂ بالا کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوسکتی ہیں —

علاوہ ازیں اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ دوسرے درجہ کے مصنفین کی ہزار ہا تصانیف بھی کچھ نہ کچھ ہماری توجہ کی ضرور مستحق ہوتی ہیں - میا تھیو آرنلڈ نے کہا اچھی بات کہی ہے ، خدا داد استعداد فطری رکھنے والے لوگ اکثر اوقات ایسی کارآمد باتیں کہہ گذرتے ہیں جو زندگی کی خفتہ طاقتوں کو بیدار کرنے میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں - یہ لوگ اکثر و بیشتر ہمارے لئے دنیا کی عظیم‌الشان اور بزرگ ہستیوں سے بھی کہیں زیادہ فیض رساں ہوتے ہیں - ہمارے لئے یہ نہایت مناسب ہے کہ ہم ایسے لوگوں کی تصانیف سے بھی آگاہی حاصل کریں اور اس " روح یا عطر " سے جو ان کتابوں میں پوشیدہ ہوتا ہے کیف اندوز ہوں "- لیکن اس قسم کے مصنفین کی ان گنت کتابوں کا مطالعہ کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے - اس لئے ایسے نقادوں کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس " روح یا عطر " کو کھینچ کر ہم تک پہنچا ئیں تاکہ ہم آسانی سے اس سے لذت یاب ہوسکیں - ایسے نقادوں کے کام اگرچہ بادی النظر میں کچھ زیادہ اہم اور وقیع نہیں معلوم ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر معمولی قدر و قیمت اور اہمیت رکھتے ہیں - انہی کی وجہ سے ہم بہت ساری ایسی معرک عمل اور کارآمد باتوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں جو ہماری زندگی پر آگے چل کر بڑا اثر ڈالنے والی ثابت ہوتی ہیں —

اس امر پر زور دینا کہ ہمیں کتابوں اور مصنفین سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے

کسی بیرونی واسطے سے ہرگز کام نہیں لینا چاہئے بالکل فضول اور مہمل ہے۔ لیکن اس اصول کو بھی فراموش کردینا حددرجہ نامناسب ہے کہ ہمارا اصلی مقصد ادب کا مطالعہ ہے اور کوئی تنقید خواہ وہ کتنی ہی معقول اور پسندیدہ کیوں نہ ہو ادب کی جانشین نہیں ہوسکتی اور ہمیں کسی وقت بھی اپنی توجہ کو محض تنقید پر مرکوز نہ کرنا چاہئے —

اگر ادب کے مطالعہ کا حقیقی اور اصلی مقصد طالب علم اور مصنف کے درمیان گہرے ذاتی تعلقات کو ترقی دینا قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارا یہ طرز عمل کہ ہم اکثر اوقات ایسی کتابوں پر اکتفا کرتے ہیں جو دوسری کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہیں کسی طرح قابل ستائش نہیں ہوسکتا۔ کسی بلند پایہ کتاب کی خوبیوں کی اور اس کے حیات بخش اثرات کا صحیح اندازہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہم خود اس کتاب کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں۔ دوسری کتابیں جو اس خاص کتاب کے متعلق لکھی گئی ہوں ہمیں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں کرسکتیں۔ اس موقع پر ایک مشہور امریکی پروفیسر کا ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پروفیسر سے ایک شوقین طالب علم نے دوران گفتگو میں کہا کہ ,, ٹائمن آف اِیتھلز کے متعلق کسی بہترین کتاب کا نام مجھے بتائیے کیوں کہ میں کتاب مذکور پر ایک مضمون لکھنے والا ہوں "۔ پروفیسر نے اس کے جواب میں نہایت سنجیدگی سے ارشاد فرمایا ,, میرے دوست ٹائمن آف اِیتھلز کے متعلق بہترین کتاب خود ٹائمن آف اِیتھلز ہے "۔ یہ ایک ایسا نقطۂ نظر تھا جس سے طالب علم مذکور قطعاً ناواقف تھا اور افسوس کی بات ہے کہ ہم میں سے اکثر کی واقفیت اس خاص معاملہ میں اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کتاب کی کوئی شرح، تفسیر یا تنقید اس کتاب کی ہرگز جانشین

نہیں ہو سکتی - ہمارے لئے مناسب امر یہ ہے کہ اگر کسی خاص کتاب کے متعلق ہم کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو اس کو بلا واسطہ غور و فکر سے پڑھیں - یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اس کے مضامین اور مطالب پر حاوی ہوسکتے ہیں - جو محنت و مشقت کہ ہمیں اس طریقہ کو اختیار کرنے سے اُٹھانی پڑے گی اس کے شاندار نتائج بہت جلد ظاہر ہونے لگیں گے اور ہمیں ایک روحانی اطمینان حاصل ہوجائے گا - بر خلاف اس کے اگر ہم خارجی واسطوں پر اعتماد کریں تو اس سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوگا - علاوہ ازیں اگر ہم ادب کا مطالعہ اس کی شرحوں اور تفسیروں کے توسط سے کیا کریں تو ایک خاص قسم کا خطرہ ہمیں پیش آئے گا جس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا از بس ضروری ہے - وہ یہ کہ ہم بلا چوں و چرا کسی نقاد کی توضیح یا تشریح کو تسلیم کرنے لگیں گے اور اس کے نقطۂ نظر کو جانچنے اور اسے عقل سلیم کی کسوٹی پر کسنے کی ہمیں مطلق پروا نہ رہے گی - اس خطرہ سے خبردار رہنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ نقاد کی اہمیت اور عظمت کے تناسب سے قوی ہوتا جاتا ہے - اگر وہ حقیقی معنوں میں بڑا نقاد ہے تو اس امر کا قوی اندیشہ ہے کہ اس کا نقطۂ نظر ہمارے دل ودماغ پر مستولی ہوجائے اور ہم اس کی غیر معمولی قابلیت اور ذکاوت کے سامنے ہتیار ڈال دیں - اگر کہیں ایسا ہوجائے تو اس کے نتائج ہمارے لئے بہت افسوس ناک ہوں گے - یعنی ہمارا ذاتی نقطہ نظر قطعاً غائب ہوجائے گا اور ہمارے غور و فکر کا مرکز ہمارا دماغ نہیں رہے گا بلکہ مذکورہ بالا نقاد کا دماغ ہوجائے گا وہ ہم سے جس طرح چاہے گا کام لے گا اور ہم اس کے احکام کی تعمیل میں کبھی پس و پیش نہ کریں گے - تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کسی خاص کتاب میں ہم کو صرف وہی محاسن یا معائب نظر آئیں گے جن کی طرف اس نے اپنے کسی مضمون میں اشارہ کیا ہو اور ذاتی طور پر ہم اس کتاب کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم نہ کرسکیں گے یہ ایک

خطرناک امر ہے جس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہر شخص پر واجب ہے - کیونکہ اس صورت میں نقاد بجائے اس کے کہ ہمارا رہبر اور رہنما ثابت ہو اس کا وجود ہمارے لئے ایک آہنی دیوار بن جاتا ہے یعنی وہ مصنف سے ذاتی واقفیت اور ہمدردی پیدا کرنے میں ہمارا مزاحم ہوتا ہے —

تنقید کے فوائد

اگرچہ تنقید کی خرابیاں اور مضرتیں بہت زیادہ ہیں جن سے ہمیں واقف اور آگاہ رہنا نہایت ضروری ہے لیکن اس کے فوائد اور خوبیاں بھی بے شمار ہیں اور ہم ایک لمحے کے لئے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے - فی تنقید کی خوبیوں سے انکار کرنا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا کہ ہمارا اس امر کو تسلیم کرنا کہ دنیا میں کوئی شخص ہم سے زیادہ عقلمند نہیں ہوسکتا ہے اور یہ کہ ہمیں کسی ذہین اور تیاک شخص کی کاوشوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے - تنقید کا اصلی مقصد دلوں میں روشنی پیدا کرنا اور انہیں تحریک دینا ہے جس طرح ایک بڑا شاعر ہمیں زندگی کے اہم مسائل اور عمیق معانی سے روشناس کرانا چاہتا ہے بالکل اسی طرح نقاد بھی اس بڑے شاعر کے گہرے مطالب اور بلند خیالات سے ہمیں واقف کرنے کی کوشش کرتا ہے - حقیقی نقاد ایسا شخص ہوتا ہے جو قابلیت، ذکاوت اور وسعت معلومات میں ہم پر ہر طرح فوقیت رکھتا ہے اور جس میں گہرے اور عمیق مطالب کو سمجھنے کی ایک خدا داد استعداد ہوتی ہے - یہ کہنا کہ ایسا شخص ادب کے حقیقی محاسن اور عمیق معانی کو سمجھنے میں ہم پر کسی قسم کی فوقیت نہیں رکھ سکتا بلا شبہ حد درجہ تنگ نظری اور تعصب پر دلالت کرتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ ایسا نقاد ہمارے سامنے اکثر اوقات ایک بالکل نیا اور انوکھا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے جس کی بدولت ہم نئے نئے مطالب اور معانی سے آگاہ ہوتے ہیں - بعض اوقات وہ ہمارا رہنما بن جاتا ہے اور ہمیں ایسے وسیع اور دلفریب میدانوں کی طرف لے جاتا ہے جن سے ہم

ناواقف ہوتے ہیں بعض مرتبہ وہ ہمارا دوست اور ساتھی ہوتا ہے اور ایسی اچھا
کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے جن سے ہم کسی نہ کسی حد تک واقف تو
ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقی اہمیت ہمارے لئے ایک سربہ مہر مکتوب کی طرح
ہوتی ہے ۔ وہ ہم کو کسی خاص کتاب کو بار بار پڑھنے کی ہدایت کرتا ہے تاکہ ہم اس
کے ان محاسن اور نکات سے واقف ہوجائیں جن کو ہم نے سرسری مطالعہ میں بالکل
نظرانداز کردیا تھا ۔ وہ ہمارے خیالات کی اصلاح کرتا ہے اور ہمیں اپنے " فیصلوں
پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ ایک [اچھا نقاد جیسا کہ ایمرسن نے کہا ہے " نہ
صرف یہ کہ ہمارے لئے معلومات مہیا کرتا ہے بلکہ وہ ہمیں وجدانیات سے بھی
کیف اندوز کرتا ہے " غرضکہ اگر ہم ہوشیاری اور مستعدی سے اس کی تنقیدوں
کا مطالعہ کریں تو خواہ ہم اس سے موافقت کریں یا مخالفت دونوں صورتوں میں
یہ امر یقینی ہے کہ اس سے ہماری بصیرت اور قابلیت میں ضرور اضافہ ہوگا —

موسیو ریمو

از

جناب ابوالکلام بدرالدین صاحب ,, بدر " متعلم - ایم - بی (عثمانیہ)

سرزمین دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے موسیو ریمو کی شخصیت آج بھی بڑی دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہے - انتہائی فتنہ و فساد اور طوائف الملوکی کے زمانے میں حکومت نظام کے ساتھ اس کی غیر متزلزل وفاداری ایک ایسا واقعہ ہے جس کی یاد محبان دکن کے دلوں سے کبھی نہیں مٹ سکتی - حقیقت یہ ہے کہ ان تمام غیر ملکی فوجی عہدے داروں میں جنہوں نے نوک شمشیر سے ملک کی خدمات انجام دی ہیں موسیو کو سب سے زیادہ شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی - چنانچہ اس کا مقبرہ جو سنٹرل جیل سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے آج بھی مرجع خاص و عام ہے --

ذیل کی نظم میں محترمی ,,بدر" صاحب نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک محب دکن کے دل میں موسیو کے متعلق موجزن ہوتے ہیں —

,,مجلہ"

شیر فرانس ریمو غربت پہ مرنے والے اے قوم پر نچھاور جاں اپنی کرنے والے

فرامین اشوک

از

جناب سید علی صاحب

اشوک کی تاریخی اہمیت محتاج بیان نہیں ' وہ دنیا کے زبردست حکمرانوں اور نوع انسان کے سچے خادموں میں شمار ہوتا ہے اس کی حیات کے مطالعہ کا سب سے معتبر و مستند ذریعہ اس کے فرامین ہیں - یہ فرامین اس کی سیرت پر کماحقہ روشنی ڈالتے ہیں - ۱۹۰۹ع میں وی اے اسمتھ نے جو تاریخ ہند کے مشہور عالم سمجھے جاتے ہیں ان فرامین کا عام فہم ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا انگریزی ترجمہ کے نسخے بہت کمیاب ہیں فرامین کی اہمیت پر نظر کرکے جناب سید علی صاحب نے ان کو اردو میں منتقل کیا ہے - اردو ترجمہ میں بھی وہی التزام رکھا گیا ہے جو انگریزی ترجمہ میں ہے یعنی کم و بیش لفظی ترجمہ ہے جو ادبیات عالیہ کے لئے بڑی حد تک ضروری سمجھا جاتا ہے - امید ہے کہ ناظرین کرام اسے دلچسپ پائیں گے - اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان میں بعض ایسے فرامین نہیں ہیں جو ممالک محروسہ سرکار عالی وغیرہ میں حال میں دستیاب ہوئے ہیں —

سجلہ

فرامین اشوک

از

جناب سید علی صاحب

اشوک کی تاریخی اہمیت محتاج بیان نہیں ' وہ دنیا کے زبردست حکمرانوں اور نوع انسان کے سچے خادموں میں شمار ہوتا ہے اس کی حیات کے مطالعہ کا سب سے معتبر و مستند ذریعہ اس کے فرامین ہیں - یہ فرامین اس کی سیرت پر کماحقہ روشنی ڈالتے ہیں - ۱۹۰۹ع میں وی اے اسمتھ نے جو تاریخ ہند کے مشہور عالم سمجھے جاتے ہیں ان فرامین کا عام فہم ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا انگریزی ترجمہ کے نسخے بہت کمیاب ہیں فرامین کی اہمیت پر نظر کرکے جناب سید علی صاحب نے ان کو اردو میں منتقل کیا ہے - اردو ترجمہ میں بھی وہی التزام رکھا گیا ہے جو انگریزی ترجمہ میں ہے یعنی دم و بہش لفظی ترجمہ ہے جو ادبیات عالیہ کے لئے بڑی حد تک ضروری سمجھا جاتا ہے - اُمید ہے کہ ناظرین کرام اسے دلچسپ پائیں گے - اس سلسلہ میں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ ان میں بعض ایسے فرامین نہیں ہیں جو ممالک محروسہ سرکار عالی وغیرہ میں حال میں دستیاب ہوئے ہیں —

مجلہ

مقدمہ

دنیا میں بہت سے ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے جنگ و جدل سے ہاتھہ روکا اورصلح و اشتی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ملیں گے جنھوں نے حرب و پیکار سے یک قلم منہ موڑ لیا ہو اور اپنی حکومت کو ایک آن میں بدل کر عالم گیر اتحاد اور وسیع محبت کے پھیلانے کے لئے تا دم آخر سخت جد و جہد کی ہو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جب ظلمت و جہالت اور بربریت سے تمام عالم تیرہ و تار ہے ہند میں ایک ایسا حکمراں منظر پر آتا ہے جو جدال و قتال اور خونریزی و غارتگری کی کالی گھٹاؤں کو چھانٹ کر امن و امان اور صلح و اشتی کی روشنی پھیلا دیتا ہے —

امن و امان کا یہ ہادی، مگدہ دیس کا والی اشوک تھا جس کا مقابلہ بعض مورخین اکبر اعظم اور فرانس کے شہنشاہ شارلمین سے کرتے ہیں —

اس موازنہ میں کوئی مناسبت نہیں۔ اشوک ان دونوں سے کہیں برتر و بالا ہے اس کی حکومت کی بنیاد نہایت بلند اور نیک اُصولوں پر تھی اور اس کی زندگی قول و فعل کے اعتبار سے بڑی پاکیزہ، ارفع و اعلیٰ —

اشوک اس ممتاز و معروف خاندان کا رکن تھا جس کی بنا چندرگپت نے ڈالی تھی۔ چندرگپت جو ایک معمولی سپاہی تھا مگر اپنی خدا داد قابلیت، زورِ بازو اور اپنے وزیر باتدبیر کوٹلیا کی مدد سے بہت جلد مگدہ کے تخت پر قابض ہوگیا۔ یہ واقعہ سنہ ۳۲۱ ق م کا ہے جب سکندر ہندوستان سے بامراد واپس ہو رہا تھا۔ چندرگپت نے اپنی فوجی قابلیت اور انتظامی لیاقت سے بہت جلد ایک کامیاب فوج فراہم کرلی۔ شمالی ہند کی دوسری ریاستوں پر پے درپے حملے کرنے شروع کئے۔ نہایت سرعت سے بہت ہی قلیل عرصہ میں وہ پورے شمالی ہند کا مالک بن بیٹھا اور ان وسیع مفتوحہ ممالک

کو اپنے وزیر کی مدد سے ایک مستحکم و مضبوط مرکزی حکومت کے تحت لایا جس کا صدر مقام پاٹلی پترا تھا —

اس واقعہ کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے کہ ایک شخص اپنی قابلیت اور قوت بازو کو کام میں لاکر بے مایگی اور پستی سے نکلے اور اسی قدر بلندی کو پہنچ جائے بلا شبہ یہ زبردست کارنامہ ہے اور چندر گپت اپنی شان و عظمت اور وسیع فتوحات اور ایک مرکزی حکومت اور امن و امان کے قیام کے سبب دنیا کے زبردست شہنشاہوں میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن موریا کی عظمت اسی پر منحصر نہیں ہے اس خاندان کے امتیاز و تفخر اور عظمت و شان کا راز چندر گپت کے پوتے اشوک کی نیک مساعی میں چھپا ہوا ہے —

اشوک کی سر بلندی کا انحصار اس کی طرز حکومت یا وسیع سلطنت کے نظم و نسق پر نہیں ہے - جہاں تک ہماری محدود معلومات کی دسترس ہے اشوک نے اپنے عہد میں طرز حکومت اور آئین سلطنت کے اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی حالانکہ اس نے بہت سے فرامین و احکامت جاری کئے لیکن اس کا ملک کے نظم و نسق پر کوئی بین اور گہرا اثر نہیں پڑا ان احکام و فرامین کے نفاذ و اجرا کا مدعا یہ نہیں تھا کہ طرز حکومت میں کوئی تبدیلی ہو - ان کا سب سے بڑا اور اصلی مقصد یہ تھا کہ بدھ مت کے اخلاقی قانون کی اشاعت ہو —

چندر گپت اور اس کے وزیر اعظم نے حکومت کو جن اصولوں پر قایم کیا تھا وہ پورے ۱۵۰ سال کی طویل مدت تک برابر قایم رہے یعنے چندر گپت، بندوسار اور اشوک کے عہد حکومت تک ان میں ذرا بھی تغیر نہ ہونے پایا اور اشوک کی نئی مذہبی اصلاحات کا ان پر کوئی گہرا اثر نہ پڑنے پونے پایا —

اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ ملک کے نظم و نسق پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ اشوک کے فرامین و احکام صاف طور پر سمجھ میں آئیں - موریوں

کی طرز حکومت مطلق العنان ملوکیت پر مبنی تھی بادشاہ کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے مگر ساتھ ہی جیسا کہ تاریخ سے صاف روشن ہے بادشاہ پر ان اختیارات کے استعمال میں چند حد بندیاں بھی عاید کی گئی تھیں جن سے بادشاہ کی مطلق العنانیت میں نمایاں کمی ہوجاتی تھی کوٹلیا کی گراں قدر تصنیف "ارتھشاستر" سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کابینہ بھی مقرر تھی جو شہنشاہ کے اختیارات کو روک تھام کرتی تھی گو اس کابینہ سے بڑی حد تک روک تھام ہوتی تھی تاہم تاریخ میں کافی شہادتیں موجود ہیں جن سے بادشاہ کے مطلق العنان اور مقتدر اعلیٰ ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا تھا - اس غیر محدود اختیار اور اقتدار اعلیٰ کے باوجود اس کے پاس ایک اور زبردست قوت بھی تھی - وہ ایک فوج تھی - اسی فوج کے بل پر چندر گپت نے پورے شمالی ہند کو فتح کیا اور اپنی قیادت و بادشاہت کا سکہ تمام ملک پر جمادیا اسی فوج کے برتے پر اشوک نے کالنگا کا استیصال کیا جس میں اس قدر خونریزی اور غارتگری ہوئی کہ اشوک سخت پشیمان ہوا - اسی فوج کی بدولت اشوک کا اثر اور عظمت بہت جلد تمام ہندوستان میں نافذ ہوگئی اور اسی کی مدد سے اشوک نے گرفانگی نیک کام انجام دیے - اپنے فرامین و احکام جاری فرمائے اور اپنے خیالات و خواہشات غیر اقوام پر نافذ کرائیں اور سب سے اہم کارنامہ جو انجام دیا وہ یہ ہے کہ بدھ مت کو تمام ہندوستان اور غیر ممالک میں پھیلایا - مختصر یہ کہ اشوک نے اسی فوج کی بدولت اپنے ہر مقصد اور ہر کوشش میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی -

مہوریوں کی سلطنت کی وسعت کا صحیح اندازہ فرامین اشوک کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے - اشوک کے فرامین اور کتبے پورے ہندوستان میں کوہ ہمالیہ سے مدراس تک پائے جاتے ہیں، جو ممالک اشوک کی قلمرو سے باہر تھے وہاں بھی اشوک نے اپنے سفیر اور مبلغ بھیجے تھے —

اشوک کی سلطنت چار صوبوں پر مشتمل تھی جن کے صدر مقام ٹیکسلا - اوجین، توسالی اور سورنگری تھے اور ان پر چار حاکم مقرر تھے جو عموماً شاہی

خاندان کے افراد ہوتے تھے۔ ان حاکم شہزادوں کے ماتحت متعدد عہدہ دار مقرر تھے جو "راجوکا" "پراڈیسک" اور "مہامتر" کے نام سے موسوم تھے۔ ان عہدہ داروں پر بادشاہ کی ذاتی نگرانی تھی۔ خفیہ پولیس کا بھی ایک محکمہ قایم کیا گیا تھا سرکاری کارندوں اور جاسوسوں کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ کی خبر بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی۔ غرض کہ موریوں کے اس سیاسی نظم و نسق اور مدبرانہ حکومت نے ان کی اس وسیع و عریض مملکت کو نوے سال کی طویل مدت تک برقرار رکھا۔ تاریخ ہند میں موریوں کے آئین حکومت بہت اہم ہیں۔ جن پر متعلم کو بطور خاص توجہ کرنی چاہئے۔

موریا خاندان کے سلسلے میں صرف اشوک کی شخصیت بہت زیادہ جاذب نظر ہے تاریخ میں اسی پر زیادہ نگاہ پڑتی ہے۔ اس کی خوبیوں نے موریا خاندان کی دوسری اہم اور قابل توجہ باتوں کو چھپا دیا ہے اشوک کی عظمت و سربلندی کا انحصار اس کے وسیع و عریض سلطنت کے فرمانروا ہونے پر نہیں ہے ہوں تو اس حیثیت سے وہ دنیا کے زبردست شہنشاہوں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی عظمت کا نمایاں اور روشن تر پہلو اس کی اخلاقی تعلیم ہے وہ ایک مقتدر و طاقتور شہنشاہ بھی تھا اور زبردست اخلاقی معلم بھی اس نے قابلیت، زور، اثر اور جد و جہد سے ایک مذہبی فرقہ (بدھمت) کو دنیا کے عالمگیر مذاہب کے زمرے میں شامل کیا جو ابتدا میں تقریباً اپنی محدود زندگی کھو بیٹھا تھا اسی لحاظ سے اشوک کی شخصیت کا طالب دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس کے فرامین سمجھنے کے لئے اس کے حالات سے واقف ہونا بھی لازم ہے —

اکثر مورخین کا یہ رجحان رہا ہے کہ وہ اشوک کے حالات زندگی کے لئے لنکا کی ان روایات پر اکتفا کرتے ہیں جو اشوک کی وفات کے صدیوں بعد ضبط تحریر میں لائے گئے تھے ان روایتوں کا اعتبار ہی کیا جن کو صدیوں کی عقیدت مبالغہ اور

طرح طرح کی موشگافیوں نے ایک فرضی داستان بنادیا ہے - ان کی صداقت و صحت پر بجا طور پر شبہ کیا جاسکتا ہے - اشوک کی سوانح حیات کے لئے یہ ایک پراگندہ اور غیر معتبر ذریعہ ہے - ان پر اعتماد کرنا اشوک کی عظمت و سربلندی کی توہین کرنا ہے —

اب لوگوں کو یہ خیال ہوچلا ہے کہ اشوک کی حیات پر ان فرامین اور کتبوں سے بخوبی روشنی پڑ سکتی ہے جن کی صداقت مسلم و معتبر ہے —

اشوک کے سوانح حیات کے ان مصدق و معتبر ماخذات کے موجود ہوتے ہوئے محض حکایتوں اور روایتوں پر بھروسہ کرنا صریح غلطی ہے - یہ فرامین اشوک کے خود نوشتہ سوانح اور اس کی دلی خواہشات اور رجحانات کا بہترین آئینہ ہیں - اس نے ان خیالات کو اپنے سیاسی زور و اثر سے نوع انسان کے ایک زبردست طبقہ پر نافذ کرانے میں ان فرامین سے بڑا کام لیا ہے

لازم ہے کہ اشوک کے حالات زندگی پر بطور خاص غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے متعلق کیا کہتا ہے - یہ خیالات اس کے دماغ میں کس طرح پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ کس طرح پھلے پھولے اور اپنی زندگی کے کارناموں کے متعلق اس کی کیا رائے ہے - یہ بات بھی محتاج توجہ ہے کہ وہ کس طرح راہ صداقت پر گامزن ہوا اور جو قدم اس نے اٹھایا بنی نوع انسان کی اخلاقی ترقی و بہبودی کے راستہ سے ہٹنے نہ پایا —

اشوک سنہ ۲۷۳ ق - میں سریر آرا ہوا مگر ابھیشکا کی رسم چار سال تک وقوع میں نہ آنے پائی - اس رسم کی رو سے عنان سلطنت ہاتھ میں دی جاتی تھی اور امور مملکت سپرد ہوتے تھے - اشوک کے لئے غالباً یہ چار سال کا عرصہ تخت نشینی کے جھگڑوں اور تصفیوں میں گزرا ہے کیونکہ وہ باپ کا سب سے بڑا بیٹا نہ تھا - مگر بہت ہی نوعمری میں اپنی قابلیت و لیاقت سے اپنے والد کو قائل کردیا تھا -

مشہور روایت ہے کہ وہ اپنی شاہزادگی کے زمانے میں ٹیکسلا اور اوجین کا حاکم بھی رہ چکا تھا - اور اس عرصے میں اس نے نہایت قابلیت و تدبر سے امور سلطنت انجام دئیے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اشوک کے والد نے اس کو ولی عہد مقرر کیا تھا - غرض اس کی ابھیشکا سنہ ۲۶۹ ق م میں ہوئی اور اس نے سنہ ۲۳۳ ق م میں انتقال کیا —

اشوک کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے اپنی تخت نشینی کے وقت ننانوے بھائیوں کا خون کیا ہے یہ امر قطعاً ناممکن الوقوع اور غیر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اس کی تردید خود اشوک کی زندگی اور اس کے کارنامے کرتے ہیں - جس شخص نے ہر جاندار کے ذبح سے احتراز کیا ہو اور اپنی رعایا پر بھی ممنوع قرار دیا ہو - اس سے اس قسم کی خونخواری اور بہیمیت بلکل قرین قیاس نہیں اشوک نے اپنے فرامین میں جگہ جگہ اپنے بہن بھائیوں کا ذکر کیا ہے اور ہر طرح ان کی بہبودی و خوش حالی کی دلی تمنا ظاہر کی ہے - یہ ایک بے بنیاد اور غیر معتبر روایت ہے جس کی صداقت کا کوئی مسلم ثبوت نہیں - بہت ممکن ہے کہ یہ بیہودہ روایت بدھ بھکشیوں کی اختراع ہو جو بدھ مت کی تعلیم کے اثر کو بتانے کے لئے گھڑ لی گئی ہو یہ اس قسم کی ایک خود غرضی معلوم ہوتی ہے —

اشوک کے دور حکومت میں صرف ایک جنگ کا ذکر ہے اس نے اپنی ابھیشکا کے نویں سال (سنہ ۲۶۱ ق م) کالنگا پر چڑھائی کی اور فتح حاصل کی - مگر اس جنگ نے اشوک کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا - اس سے اس کی طرز حیات اور کردار میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہوگیا جس سے اس کی سلطنت اور دیگر ممالک پر بھی نہایت گہرا اثر پڑا - اس معرکہ میں اشوک کی عبرت بین آنکھ نے موت و مصیبت کے جو نظارے کئے اور جس خون ریزی غارت گری اور قتال و جدال کا مشاہدہ کیا ہے - ان کا اشوک کے اندرونی جذبات پر نہایت بدن اثر پڑا ہے - اس کے دل نے گوارا نہیں کیا کہ آئندہ ایسے دلدوز واقعات پیش آئیں -

غرض یہ اس کی آخری جنگ تھی - جس میں اس نے حرب و پیکار نہ کرنے کی قسم کھا لی —

مگر اس میں شبہ ہے کہ آیا یہ معرکہ اشوک کی پہلی جنگ ہے یا اس سے قبل بھی اس نے کوئی جنگ کی تھی-

اشوک کے فرامین میں تو اس جنگ کے علاوہ اور جنگ کا کوئی ذکر نہیں - یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس کی زندگی میں اس قدر فوری انقلاب کیسے پیدا ہو - اس غیر معمولی تغیر کا پیدا ہونا بغیر کسی نہ کسی بنیاد کے ناممکن ہے اس کی زندگی میں یہ جو فوری اور اچانک انقلاب پیدا ہوگیا - اس کی بنیاد بہت قدیم اور مضبوط ہوگی - اس کے دل میں جنگ کے عذاب اور بلاؤں کے دور کرنے کا خیال عرصہ سے جڑ پکڑ رہا ہوگا - بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنی گزشتہ زندگی میں جنگ کی سخت مصیبتوں کا خوب مشاہدہ کیا ہو، ہولناک اور خون ریز واقعات کو دیکھا ہو اور اس کے نتائج کو خوب محسوس کیا ہو اس کو صرف ایک مناسب موقع کا انتظار تھا - اس جنگ کے واقعات نے اس کے دردمند دل کے ٹکڑے اڑادیے وہ جنگ کے خاتمہ پر تل گیا اس جنگ سے اس کے دل پر جو گزری اور اس کے جذبات اور احساسات کیا تھے ہمیں اس کا کافی اندازہ چٹان کے فرمان نشان ۱۳ سے ہوسکتا ہے

اس سلسلہ میں لازم ہے کہ اشوک کے فرامین کا مطلب اور مدعا اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے :-

یہ فرامین اشوک کو ایک ایسے شخص کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس نے بھکشو کے زہد و ریاضت اور بادشاہ کے تدبر و فراست دو شیر و شکر کی طرح ملانے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں اشوک نے نمایاں کامیابی حاصل کی - اس کی جد و جہد اور کوشش و سعی کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان صداقت اور نیکی کا مرکز بنے اور اس کے باشندوں میں راستی و راستی و صداقت کے غیر فانی خواص

پیدا ہوں، ایک عالمگیر مذہب پھیل جائے جو تمام باشندوں کے لئے ہو۔ وہ حکومت کو خدا کا کارندہ سمجھتا تھا جس کا کام یہ تھا کہ صداقت کی طرف لوگوں کی رہنمائی و رہبری کرے اور دھرم کے سیدھے راستے کو اختیار کرنے کی ترغیب دے وہ دل سے چاہتا تھا کہ ہر شخص ذاتی طور پر اپنی نجات کا جویا رہے اور اپنے اعمال کا ثمرہ پانے کے لئے تیار ہو —

"ریاضت کا پھل نہ صرف بڑے آدمی کے لئے ممکن الحصول ہے بلکہ ہر وہ فرومایہ شخص جو ریاضت اختیار کرنے کو پسند کرے لا محدود نعمت ایزدی حاصل کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس قانون کی اشاعت ہوئی ہے :

"ہر کہہ و مہہ اس مقصد کے لئے ریاضت اختیار کرے"

حکومت رعایا کے لئے خضر راہ ہے۔ وہ اس کو صراط مستقیم پر گام زن ہونے کی ترغیب دیتی ہے، اور راستی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ حکومت کے فرائض بس اسی حد تک ہیں وہ اپنے فرائض ادا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص کو چاہئے کہ وہ ذاتی طور پر جد و جہد کرے اور راہ راست پر قدم زن ہو —

عزت و تعظیم، رحمدلی، صداقت و نیکی، ہمدردی اور اسی قبیل کی دیگر خوبیاں تھیں جن کے نفاذ و اشاعت اور تہذیب و ترقی کا اشوک ہر وقت جویا رہا ہے اور بے قدری، نفرت، ظلم، تنگ دلی، کذب، تعصب، دشمنی اور اسی نوع کی دوسری برائیوں کی بیخ کنی پر وہ ہر آن کمر بستہ رہا ہے —

اشوک کی تعلیمات محض عملی اور اخلاقی اصولوں کا مجموعہ تھیں یہ نہ تو کسی مذہبی خیال پر مبنی تھیں اور نہ کسی فلسفیانہ نظریہ پر اس کی تعلیمات کی بنیاد محض گوتم بدھ کے الفاظ پر تھی، جن کا خود اس نے اعلان کیا ہے:-

"جو کچھ کہ معزز حضرات، واجب التعظیم بدھ نے فرمایا ہے، خوب فرمایا ہے"

اشوک نے متعدد جگہ دوسری دنیا اور حیات بعدالموت کا بھی ذکر کیا ہے وہ دھرم کے اختیار کرنے کی ترغیب اس طرح دیا کرتا تھا کہ اس سے دو گونہ فائدہ ہے۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ کی خوشنودی اور مہربانی نصیب ہوگی اور دوسرے آئندہ زندگی میں بہشت اور نعم ایزدی حاصل ہوں گی۔ ان دل خوش کن امیدوں سے اس نے اپنی رعایا کو راہ صداقت دکھائی، دھرم کی طرف راغب کیا اور دھرم کی اشاعت کی

اشوک نے بدھ مت کی اشاعت و تبلیغ میں جو کام انجام دیے ہیں ان کا ایشیا اور یورپ کے تمدن و تہذیب پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اشوک ہندوستان کا پہلا مصلح و مبلغ بادشاہ ہے، جس کا دل تعصب سے پاک تھا۔ قبل مسیح کے اس تاریک بلکہ مسیح کے صدیوں بعد بھی کوئی ایسا شہنشاہ نہیں گذرا ہے جس کا آئینۂ دل تعصب و جانب داری کی کدورت سے پاک ہو۔ صرف اشوک ہی ایک ایسا شہنشاہ ہے جو دنیا کے زبردست شہنشاہوں پر اس خصوص میں امتیاز رکھتا ہے، وہ نہایت پاک دل اور روشن دماغ فرمان روا گذرا ہے، تعصب کوتاہ نظری اور تنگ دلی کی آلائشوں سے اس کا دل و دماغ بالکل پاک تھا۔ اس روشن زمانے میں تبلیغ اور تعصب لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں لیکن اشوک اس عام قاعدہ کی استثنا ہے اس میں تبلیغ کا انتہائی جوش تھا لیکن تعصب کا نام نہ تھا—

اشوک کی اس بے تعصب تبلیغی جد و جہد نے دو زبردست کام انجام دیے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو ایک نیم جان فرقہ نے حیات تازہ حاصل کی اور اس لایق ہوگیا کہ دنیا کے عالم گیر مذاہب میں شمار کیا جائے اور دوسری طرف اس کی تبلیغی سفارتوں سے دنیا کے تمدن و تہذیب میں زبردست انقلاب پیدا ہوگیا۔ وہ زمانہ ظلمت و جاہلیت کا تھا جب علم کی روشنی دنیا میں عام طور پر نہیں پھیلی تھی۔ اس میں شبہ نہیں یونان و روما علم و تہذیب کی منزلیں طے کرچکے تھے لیکن اکثر ممالک ایسے تھے جو وحشت، بربریت، جہالت اور باطل پرستی کے شکار تھے۔

ہندوستان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تہذیب و تمدن کے نور سے محروم تھا۔ وہاں علم تھا' ممتاز تہذیب تھی' لیکن ان کا دائرۂ عمل محدود تھا تحصیل علم کے پورے حقوق صرف ایک دو طبقوں کو حاصل تھے اور بقیہ طبقے علم حاصل کرنے کے مستحق نہ تھے۔ گویا خدا نے علم کی بیش بہا نعمت صرف برھمنوں اور چند اعلیٰ طبقوں کے لئے مخصوص کردی تھی' اور نیچ اور متوسط اقوام کو اس سے محروم کردیا تھا۔ غرض اس تفریق اور خود غرضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے دل و دماغ بےنور رہے' اور وہ سخت بیجا اور بیہودہ رسوم کی پابندی اور اوہام پرستی میں گرفتار ہوگئے —

اس ظلمت' جہالت اور پستی کے دور میں ضرورت تھی کہ کوئی ہادی و مصلح اٹھتا اور ظلمت کو نور' جہالت کو علم اور پستی کو بلندی سے بدل دیتا۔ اس کو ایک لطیفۂ غیبی سمجھنا چاہئے کہ اشوک جیسا مصلح اور اخلاقی معلم اٹھا اور اس نے یہ خدمت بڑی خوبی سے انجام دی اس نے حتی الوسع تبلیغ و اصلاح کے کام انجام دیے جس میں اس کو اپنے عام فہم فرامین کی بدولت بڑی نمایاں کامیابی نصیب ہوئی —

حق یہ ہے کہ اشوک نے نوع انسان کے لئے کئی جتن کئے' یہ اس کا بہت بڑا زبردست احسان ہے جس کو دنیا کبھی نہیں فراموش کرے گی۔ اس کے فرامین اس کے کارناموں کی لذت بخش یاد تازہ کرتے رہیں گے اور اشوک کے نام کو رہتی دنیا تک برقرار رکھیں گے —

فرامین کے رسم الخط' زبان' اور طرز تحریر' مقامات جہاں کتبے پائے جاتے ہیں اور ان کی تقسیم پر ایک مختصر بحث کے بعد ہم اس مقدمے کو ختم کریں گے۔

چھوٹی چٹانوں کے فرامین :-

یہ فرامین سب سے پہلے زمانے کے سمجھے جاتے ہیں جو شاید ۲۵۸ اور ۲۵۷ ق م کے درمیان جاری کئے گئے تھے - اور ان مقامات پر پائے جاتے ہیں -

(۱) بیرات ' جو ریاست جے پور' راجپوتانے میں واقع ہے —

(۲) روپ ناتھ جو ضلع جبلپور' صوبہ متوسط میں واقع ہے -

(۳) سہس رام جو ضلع شاہ آباد' جنوبی بہار میں واقع ہے —

(۴) ریاست میسور میں سدا پور کے قریب اس فرمان کے تین کتبے پائے جاتے ہیں —

بھابھرا کا فرمان

بیرات' ریاست جے پور میں واقع ہے - سنہ ۲۵۸ ق م میں لکھا گیا

چٹان کے چودہ فرامین

یہ کتبے سات مقامات پر پائے جاتے ہیں اور سنہ ۲۵۷ ق م میں لکھے گئے ہیں -

(۱) شاہ باز گڑھ جو ملک یوسف زئی' میں پشاور سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے —

(۲) مان سہرا - جو ضلع ہزارا' شمالی مغربی سرحد واقع ہے —

(۳) کالسی' یوپی - ضلع دہرادون واقع ہے -

(۴) سوپارہ' ضلع تھانہ' بمبئی -

(۵) گرنار' ریاست کاٹھیاواڑ جونا گڑھ —

(۶) دھاولی' ضلع پوری - اوریسہ —

(۷) جوگاڈہ' ضلع گنجام' مدراس —

کالنگا کے فرامین

دو فرامین ہیں اور مقامات دھاولی اور جوگاڈہ پر پائے جاتے ہیں —

ستون کے سات فرامین :-

۲۴۳ اور ۲۴۴ ق م کے درمیان لکھے گئے - ساتواں فرمان دھلی تو پرا کے ستون پر کندہ ہے - دوسرے چھ فرامین چھ متفرق جگہ پائے جاتے ہیں —

(۱) دھلی تو پرا - (ضلع انبالہ ' پنجاب سے دھلی لایا گیا)

(۲) دھلی (میرٹھ سے لایا گیا)

(۳) الہ آباد - (کوسمبی سے لایا گیا)

(۴) توریا آراج ' ضلع چمپارن شمالی بہار

(۵) توریا نندن گڑھ - جو ضلع چمپارن سے پندرہ میل پر واقع ہے

(۶) رام پوروا ' جو ضلع چمپارن کے قریب واقع ہے

چھوٹے ستون کے فرامین غالباً ۲۵۲ اور ۲۳۲ ق م کے درمیان جاری کئے گئے ان میں دو فرمان یعنی کوسمبی اور دیوی کے فرامین الہ آباد کے ستون پر کندہ ہیں - اور سانچی کا فرمان مقام سانچی ' ریاست بھوپال میں ایک ستون پر کندہ ہے —

سرناتھ کا فرمان ' مقام سرناتھ ' بنارس کے قریب ایک ستون پر کندہ ہے —

ترائی کے کتبوں سے ایک کتبہ ' ضلع بستی یوپی شمال میں نیپال کے ترائی میں ایک ستون پر کندہ ہے - دوسرا کتبہ اُمن دی پر واقع ہے - اشوک نے جن غاروں کو عطا کیا تھا وہ بار ابر کے پہاڑوں میں ضلع گیا ' جنوبی بہار میں واقع ہیں اشوک کے پوتے دسرتھ کے عطیے بھی بار ابر کے ایک میل پر واقع ہیں —

اکثر کتبے ایسے ہیں جو پراکرت کی کسی نہ کسی شکل میں لکھے گئے ہیں - ہندوستان میں تین ادبی زبانیں رائج تھیں ' سنسکرت ' پراکرت اور پالی - ان تین زبانوں سے متعدد دیسی زبانیں نکلی ہیں

کتبوں کے رسم الخط کے متعلق اس قدر معلوم کرلینا ضروری ہے - کہ وہ کتبے

جو شمالی مغربی سرحد پر مان سہرا اور شاہ بازگڑھ میں پائے جاتے ہیں وہ کھروشتی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں - کھروشتی رسم الخط ایران سے لے کر ہندوستان تک میں رواج پا گیا تھا اور ایرانی رسم الخط سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا - ان کے علاوہ بقیہ جتنے کتبے ہیں وہ سب برہمی رسم الخط کی کسی نہ کسی شکل میں لکھے گئے ہیں —

مترجمین کا اعتراض ہے کہ ان فرامین کی زبان اور انشاء شستہ اور پاکیزہ نہیں - ان کی یہ رائے ہے کہ یہ فرامین دلالت کرتے ہیں کہ اس زمانہ کی انشا پردازی خام ، غیر شستہ اور ابتدائی حالت میں تھی - انہوں نے اس دور کے انشاپردازوں کو محض نوآموز خام مشق اور غیر تعلیم یافتہ قرار دیا ہے —

مگر فرامین کے ایک سرسری مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی انشا پردازی پر ان کی یہ رائے اور تنقید قرین انصاف و صحت نہیں ہے - ان فرامین کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی انشا پردازی محض خام ابتدائی حالت میں نہیں تھی بلکہ اس میں سادگی زبان ، اور سلاست بیان ہے - جو انشا پردازی کی روح ہے - انشا پردازی کی کامیابی کا راز طرز بیان کے سلیس اور بے ساختہ ہونے میں مضمر ہے - اس سے مضمون میں زور اور اثر پیدا ہوجاتا ہے - مبہم تشبیہوں استعاروں اور غیر ضروری صنعتوں سے مطلب پر پردہ پڑجاتا ہے اور مضمون ادا ہونے سے قطعاً قاصر ہو جاتا ہے —

اشوک کے فرامین ان رسمی اور مصنوعی جکڑ بندوں سے آزاد ہیں - ان میں سلاست ، سادگی اور بے ساختہ پن کی لازوال خوبیاں ہیں —

ان فرامین میں بعض جملے بار بار دہرائے گئے ہیں - اشوک نے اس تکرار کی وجہ ایک فرمان میں بتائی ہے وہ لکھتا ہے :—

" بعض فقروں کو ان کے مبحث کی شیرینی کے سبب سے بار ہا دہرایا گیا ہے اسی توقع میں کہ شاید لوگ ان پر عمل کریں "

تاہم کہیں کہیں ان جملوں کی مسلسل تکرار کانوں پر گراں گزرتی ہے مگر ہمیں چاہئے کہ اس زمانے کی انشاپردازی پر نظر رکھیں اور پورا انصاف کریں - اگر ہم موجودہ معیار سے اس کو جانچیں تو یہ سراسر غلطی اور ستم ظریفی ہے —

چھوٹی چٹانوں کے فرامین

فرمان (نشان ۱)

(روپ ناتھ کا متن)

ریاضت کا پھل

حضور اقدس کا فرمان ہے :—

ڈھائی سال سے زاید عرصہ تک میں مذہب کا ایک نام نہاد پیرو تھا - اور کبھی جوش و ولولہ سے عمل نہیں کرتا تھا - لیکن اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ میں درویشوں کے زمرہ میں داخل ہوا ہوں - اور بہت پر جوش ریاضت میں مصروف ہوا ہوں - اسی زمانے میں وہ دیوتا جو تمام ہندوستان میں بر حق مانے جاتے تھے ناحق اور جھوٹے ثابت کئے گئے —

کیوں کہ یہ ریاضت کا ثمرہ ہے - اس کو نہ صرف بڑا آدمی حاصل کرسکتا ہے بلکہ ہر معمولی اور فرومایہ شخص جوسرگرم ریاضت ہے یہ نعمت ایزدی با فراط حاصل کرسکتا ہے - اور اس لئے یہ فرمان (ساونی) جاری ہوا ہے :- " ہر کہ و مہ ریاضت میں مشغول ہو " میرے پڑوسیوں کو بھی چاہئے کہ وہ یہ سبق حاصل کریں اور خدا کرے کہ یہ ریاضت تا دیر جاری رہے —

اور یہ مقصد بار آور ہوگا - ہاں ضرور خوب پھولے گا - کم سے کم ڈیوڑھی ترقی تو کریگا - چٹانوں پر یہ مقصد لکھا جانا چاہئے - نزدیک اور جہاں کہیں پتھر کے ستون ہاں اس پر یہ مقصد کندہ کیا جانا چاہئے - اور جہاں تک کہ آپ کی عملداری ہے - اس کتبہ کے مضمون کی اشاعت ہر جگہ کرنی چاہئے - یہ اعلان " مسافر " کی تصنیف سے ہے - سلاکی قیام کال میں ۲۵۶ تھدیلھاں —

ستون کے سات فرامین :-

۲۴۳ اور ۲۴۴ ق م کے درمیان لکھے گئے - ساتواں فرمان دھلی تو پرا کے ستون پر کندہ ہے - دوسرے چھ فرامین چھ متفرق جگہ پائے جاتے ہیں —

(۱) دھلی تو پرا - (ضلع انبالہ ' پنجاب سے دھلی لایا گیا)

(۲) دھلی (میرٹھ سے لایا گیا)

(۳) الہ آباد - (کوسمبی سے لایا گیا)

(۴) توریا آراج ' ضلع چمپارن شمالی بہار

(۵) توریا نندن گڑھ - جو ضلع چمپارن سے پندرہ میل پر واقع ہے

(۶) رام پوروا ' جو ضلع چمپارن کے قریب واقع ہے

چھوٹے ستون کے فرامین غالباً ۲۵۲ اور ۲۳۲ ق م کے درمیان جاری کئے گئے ان میں دو فرمان یعنی کوسمبی اور دیوں کے فرامین الہ آباد کے ستون پر کندہ ہیں - اور سانچی کا فرمان مقام سانچی ' ریاست بھوپال میں ایک ستون پر کندہ ہے —

سرناتھ کا فرمان ' مقام سرناتھ ' بنارس کے قریب ایک ستون پر کندہ ہے —

ترائی کے کتبوں سے ایک کتبہ ' ضلع بستی یوپی شمال میں نیپال کے ترائی میں ایک ستون پر کندہ ہے - دوسرا کتبہ اُمن دی پر واقع ہے - اشوک نے جن غاروں کو عطا کیا تھا وہ بار ابر کے پہاڑوں میں ضلع گیا ' جنوبی بہار میں واقع ہیں اشوک کے پوتے دسرتھ کے عطیے بھی بار ابر کے ایک میل پر واقع ہیں —

اکثر کتبے ایسے ہیں جو پراکرت کی کسی نہ کسی شکل میں لکھے گئے ہیں - ہندوستان میں تین اہم زبانیں رائج تھیں ' سنسکرت ' پراکرت اور پالی - ان تین زبانوں سے متعدد دیسی زبانیں نکلی ہیں

کتبوں کے رسم الخط کے متعلق اس مختصر مطالعہ کرلینا ضروری ہے - کندہ کتبے

جو شمالی مغربی سرحد پر مان سہرا اور شاہ بازگڑھ میں پائے جاتے ہیں وہ کھروشتی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں - کھروشتی رسم الخط ایران سے لے کر ہندوستان تک میں رواج پا گیا تھا اور ایرانی رسم الخط سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا - ان کے علاوہ بقیہ جتنے کتبے ہیں وہ سب برھمی رسم الخط کی کسی نہ کسی شکل میں لکھے گئے ہیں —

مترجمین کا اعتراض ہے کہ ان فرامین کی زبان اور انشاء شستہ اور پاکیزہ نہیں - اس کی یہ رائے ہے کہ یہ فرامین دلالت کرتے ہیں کہ اس زمانہ کی انشا پردازی خام ' غیر شستہ اور ابتدائی حالت میں تھی - انہوں نے اس دور کے انشاپردازوں کو محض نوآموز خام مشق اور نیم تعلیم یافتہ قرار دیا ہے —

مگر فرامین کے ایک سرسری مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی انشا پردازی پر ان کی یہ رائے اور تنقید قرین انصاف و صحت نہیں ہے - ان فرامین کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی انشا پردازی محض خام ابتدائی حالت میں نہیں تھی بلکہ اس میں سادگی زبان ' اور سلاست بیان ہے - جو انشا پردازی کی روح ہے - انشا پردازی کی کامیابی کا راز طرز بیان کے سلیس اور بے ساختہ ہونے میں مضمر ہے - اس سے مضمون میں زور اور اثر پیدا ہوجاتا ہے - مبہم تشبیہوں استعاروں اور غیر ضروری صنعتوں سے مطلب پر پردہ پڑجاتا ہے اور مضمون ادا ہونے سے قطعاً قاصر ہو جاتا ہے —

اشوک کے فرامین ان رسمی اور مصنوعی جکڑ بندوں سے آزاد ہیں - ان میں سلاست ' سادگی اور بے ساختہ پن کی لازوال خوبیاں ہیں —

ان فرامین میں بعض جملے بار بار دہرائے گئے ہیں - اشوک نے اس تکرار کی وجہ ایک فرمان میں بتائی ہے وہ لکھتا ہے :—

" بعض فقروں کو ان کے مبحث کی شورینی کے سبب سے بار ہا دہرایا گیا ہے اسی توقع میں کہ شاید لوگ ان پر عمل کریں "

تاہم کہیں کہیں ان جملوں کی مسلسل تکرار کانوں پر گراں گزرتی ہے مگر ہمیں چاہئے کہ اس زمانے کی انشاپردازی پر نظر رکھیں اور پورا انصاف کریں - اگر ہم موجودہ معیار سے اس کو جانچیں تو یہ سراسر غلطی اور ستم ظریفی ہے —

چھوٹی چٹانوں کے فوامین

فرمان (نشان ۱)

(روپ ناتھ کا متن)

ریاضت کا پھل

حضور اقدس کا فرمان ہے :—

ڈھائی سال سے زایدہ عرصہ تک میں مذھب کا ایک نام نہاد پھرو تھا - اور کبھی جوش و ولولہ سے عمل نہیں کرتا تھا - لیکن اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ میں درویشوں کے زمرہ میں داخل ہواہوں - اور بہت پر جوش ریاضت میں مصروف ہوا ہوں - اسی زمانے میں وہ دیوتا جو تمام ہندوستان میں بر حق مانے جاتے تھے ناحق اور جھوٹے ثابت کئے گئے —

کیوں کہ یہ ریاضت کا ثمرہ ہے - اس کو نہ صرف بڑا آدمی حاصل کرسکتا ہے بلکہ ہر معمولی اور فرومایہ شخص جوسرگرم ریاضت ہے یہ نعمت ایزدی با فراط حاصل کرسکتا ہے - اور اس لئے یہ فرمان (صاوني) جاری ہوا ہے :- " ہر کہ و مہ ریاضت میں مشغول ہو " میرے پڑوسیوں کو بھی چاہئے کہ وہ یہ سبق حاصل کریں اور خدا کرے کہ یہ ریاضت تا دیر جاری رہے —

اور یہ مقصد بار آور ہوگا - ہاں ضرور خوب پھولے گا - کم سے کم ڈیوڑھی ترقی تو کریگا - چٹانوں پر یہ مقصد لکھا جانا چاہئے - نزدیک اور جہاں کہیں پتھر کے ستون ملیں اس پر یہ مقصد کندہ کیا جانا چاہئے - اور جہاں تک کہ آپ کی عملداری ہے - اس کتبہ کے مضمون کی اشاعت ہر جگہ کرنی چاہئے - یہ اعلان " مسافر " کی تصنیف سے ہے - سنانکی قیام گاہ میں ۲۵۶ آبدیلیاں —

وهی فرمان - (برما گری کا متن)

(گذشته کتبه ملاحظه هو)

وهی مضمون

مهر یار و عهده داران سور نگری کے حکم سے عهده داران اسلا کور نشانات کے ساتهه مخاطب کئے جاتے هیں —

مزید خطابات حسب ذیل هیں —

حضور اقدس کی هدایات یه هیں :—

ڈهائی سال سے زائد عرصے تک میں مذهب کا ایک نام نهاد پیرو تها اور بغیر جوش ریاضت کرتا تها - لیکن ایک سال سے زیاده هوا هے که حقیقت میں میں بهکشو آشرم میں داخل هوا هوں - اور اسی وقت سے ریاضت میں مشغول هوں

اس زمانه میں وه لوگ جو تمام هندوستان میں سچے سمجهے جاتے تهے - اپنے دیوتاؤں کے ساتهه جهوٹے ٹهیرائے گئے —

کیونکه یه ریاضت کا ثمره هے - یه نه صرف بڑے آدمی کے لئے ممکن الحصول هے بلکه هر معمولی شخص بهی اگر وه پسند کرے تو غیر محدود نعمت ایزدی حاصل کرسکتا هے —

اس مقصد کے لئے یه فرمان شایع هوا هے —

,, هر کهه و مهه اس مقصد کے لئے ریاضت کرے ''

میرے پڑوسیوں کو بهی چاهئے که وه یه سبق سیکهیں اور خداکرے که یه ریاضت تادیر جاری رهے - اور یه مقصد ثمر آور هوگا هاں ' خوب پهلے پهولے گا -

اور مندرجهٔ بالا فرمان کو مسافر نے اعلان کیا هے (۲۵۶) وقت) —

چهوٹی چٹانوں کے فرامین

فرمان نشان ۱

قانون فرایض کا خلاصہ :-

حضور اقدس کا یہ فرمان ہے :-

ماں باپ کی سننا چاہئے - اسی طرح جاندار مخلوق کی قدر و قیمت اچھی طرح قایم کی جانی چاہئے - حق گوئی کی جاے - یہ دھرم کی خوبیاں ہیں جن کو کام میں لانا چاہئے - اسی طرح شاگردوں سے استاد کی تعظیم ادا ہونی چاہئے - احبا کے ساتھہ مناسب خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہئے —

یہ (دھرم کا) قدیم جوہر ہے - یہ زمانہ کی درازی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور آدمیوں کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے —

(نوشتۂ پادا - کاتب)

بھا برا کا فرمان

مقدس کتاب سے انوک کے چنیتے پسندیدہ جملے -

شہر یار لطف آثار مکدہ ' مندر کو کور نشات کے ساتھہ مخاطب کرتا ہے اور اس کے ارکان کے اقبال و صحت کا آرزو مند ہے آپ جانتے ہیں : معزز حضرات ' بدہ مقدس قوانین اور مندر میں عقیدہ رکھنے کی تعظیم میرے پاس کس قدر وسیع ہے جو کچھہ معزز صاحبو ' واجب التقدیس بدہ نے کہا ہے وہ سب خوب کہا گیا ہے -

تاہم معزز حضرات اگر مجھے کوئی خاص قول جتلانے کا حق ہے تو میں نصیحت کرنے کی جسارت کرتا ہوں ,, غرض کہ خیر و صلاح کا یہ قانون تادیر جاری رہے گا ''

معزز صاحبو ! دھرم کے یہ مضامین (جاننا چاہئے) , ونایا کی عظمت ' , آریوں کی مافوق الفطرت قوتیں ' , آئندہ واقعات کا خوف ' , صومعہ نشین کا گیت ' , جوئی کی زندگی کا مکالمہ ' , او پتشیا کے سوالات اور مہاتما بدہ کا وہ خطبہ جو رہولا کو دیا گیا تھا - اور جس کا آغاز دروغ گوئی کے مضمون سے ہوا تھا -

دھرم کے یہ مضامین معزز صاحبو میں چاہتا ہوں کہ بھکشو اور بھکشنی ان کو

سنے اور دھیان کرے - اور اسی طرح تمام دنیا ہار سرہ وزن کو یہی کرنا چاہئے -

اسی سبب سے معزز صاحبو میں یہ لکھوا رہا ہوں تا کہ لوگوں میری دلی خواہشوں کا علم ہوجاے —

چتانون کے فرامین

فرمان - نشان - (۱)

حیوانی زندگی کی حرمت —

یہ مقدس کتبہ حضور اقدس و اعلیٰ کے حکم سے لکھا گیا ہے

یہاں (ہارلحکومت میں) کوئی جانور ذبح نہیں کیا جا سکتا اور نہ تیوہار کی مجلسیں منعقد ہو سکتی ہیں - اس لئے کہ بادشاہ بزرگ و معتبر تیوہار کی مجلسوں میں بہت سی خرابیاں دیکھتے ہیں - اگر چہ - حضور اقدس و اعلیٰ کی نظروں میں بعض مقامات پر تیوار کی مجلسیں لائق ستایش ہیں —

پچھلے زمانے میں حضور اقدس و اعلیٰ کے مطبخ میں ہر روز لاکھوں جاندار مخلوق خوش ذائقہ و لذیذ اطعمہ کے لئے ذبح کئے جاتے تھے - لیکن اب جب کہ یہ مقدس کتبہ لکھا جارہا ہے لذیذ طعام کے لئے (روزانہ) صرف تین جاندار یعنی دو مور اور ایک ہرن ذبح کئے جاتے ہیں - اس پر بھی ہرن روزانہ نہیں - آئندہ یہ تین جاندار بھی ذبح نہیں کئے جایں گے —

فرمان نشان (۲)

انسان اور حیوان کے لئے سرمایۂ تسکین و راحت

حضور اعلیٰ و اقدس کی قلمرو میں ہر جگہ اور ہمسائوں میں جیسے چولا پانڈیا - سیتا پترا - کرالا پترا - لنکا - انتی اوکس شاہ یونان - اور انتی اوکس کے قرب و جوار کے بادشاہوں میں ہر جگہ حضور اعلیٰ و اقدس نے دو قسم کے معالجاتی انتظامات آدمیوں کے لئے اور معالجاتی انتظامات جانوروں کے لئے . طبی نباتات بھی - انسانوں

کے طبی (فائدہ) جانوروں کے طبی (فائدہ) کے لئے - جہاں کہیں ان کی کمی تھی لائے گئے اور لگائے گئے جڑیں بھی اور پھل جہاں کہیں ان کی کمی تھی لائے گئے اور لگائے گئے دونوں - انسان اور حیوان کے آرام کے لئے سڑکوں پر کنویں کھدائے گئے اور درخت لگائے گئے —

چٹان کا فرمان نشان (۳)

پنج سالہ دورہ —

حضور اعلی و اقدس کا یہ فرمان ہے :—

آبپیشیکا کے بارہ سال بعد میں نے یہ حکم صادر کیا :—

میری عملداری میں ہرجگہ (ماتحت) (عہدہ دار اور نظما اور اہل کاران اضلاع) ہر پانچویں سال دورہ پر نکلیں اور دوسرے فرائض بھی بجالائیں - بجالانے کے علاوہ ایک خاص مقصد کو پورا کریں یعنے دھرم کی اشاعت - ایک لائق ستائش کام ہے ماں باپ کا کہا ماننا —

دوستوں ' جان پہچان والوں ' عزیزوں ' برہمنوں اور سادھوؤں کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں - قابل تحسین کام ہے - ایک لائق تحسین کام ہے ذی حیات مخلوق کی خونریزی سے احتراز ایک قابل ستائش کام ہے کم خرچ کرنا اور کم جمع کرنا (اہل خانقاہ کے) فرقے بھی مقاصد اور حسابات دونوں کا شمار کر نیکے لئے (یا استدلال اور خاص ہدایات کی مطابق میں عہدہ دار مقرر کریں)—

چٹان کا فرمان - نشان (۴)

دھرم پر عمل

زمانہ ماسلف میں دراز مدت تک - کئی صدیوں تک جاندار مخلوق کا ذبیحہ ' ذی حیات مخلوق پر ظلم ' عزیزوں کی بے وقعتی ' برہمنوں اور درویشوں

کی بے حرمتی ' ترقی کرگئے تھے لیکن اب چونکہ حضور اعلیٰ و اقدس دھرم پر عمل پیرا ھیں (تو) بجاے طبل جنگ کے شور کے دھرم کے طبل کی آواز گونج رہی ھے اور جلوس کی گاڑیوں ' ھاتھیوں ' روشنیوں کے آسمانی مناظر لوگوں کے اگے وقف تماشا کئے جاتے ھیں —

جو کچھہ گذشتہ صدیوں میں وقوع میں نہیں آیا ھے عصر حاضر میں حضوراقدس و اعلیٰ کے دھرم کی اشاعت کرنے کی سبب سے جاندار مخلوق کے ذبح کا سدباب ذی حیات مخلوق پر ظالم کی روک تھام' عزیزوں کی عزت ' برھمنوں کی فرما بردار سادھوؤں کی عزت ' ماں باپ کی فرما برداری ' بزرگوں کی فرما برداری- سب ترقی کررھے ھیں—

غرض اس طرح سے اور دوسرے کئی طریقوں سے دھرم کی تعمیل اور حضور اعلیٰ و اقدس دھرم کو اور ترقی دیں گے —

حضور اعلیٰ و اقدس کے صاحب زادے - پوتے اور پرپوتے اختتام گردش تک اس عمل کو ترقی دیں گے اور طاعت و اخلاق پر قائم رہ کر دھرم کی اشاعت کریں گے —

کیونکہ تمام کارناموں میں یہی بہترین ھے - دھرم کی اشاعت و اعلان بہ اخلاق آدمی کے لئے نہیں ھے - اس باب میں ترقی قابل تحسین ھے تنزل قابل تحسین نہیں ھے —

اس مقصد سے یہ عبارت تحریر کی گئی ھے تاکہ انسان اس باب میں ترقی کے لئے سعی کرے اور تنزل کا شکار نہ ھوجاے —

حضور اعلیٰ و اقدس کے حکم سے ان کے ابھیشیکا کے بارہ برس بعد یہ تحریر کیا گیا

چٹان کا فرمان (نشان ۵)

دھرم مہا-تر

حضور اعلیٰ و اقدس کا یہ فرمان ھے

کار خیر ایک نہایت دشوار چیز ہے اب مجھ سے بہت سے نیک کام کئے گئے ہیں وہ جو کہ ایک نیک کام انجام دیتا ہے - بہت مشکل کام انجام دیتا ہے - میرے بیٹے پوتے اور ان کے بعد کی میری نسل [نے لوگ] اختتام گردش تک اسی راستے پر چلیں وہ خوب کریں گے - اگر کسی باب میں کسی نے اس حکم سے غفلت برتی تو اس نے برا کیا - اس لئے کہ گناہ ایک آسان کام ہے —

تمام گزرے ہوئے زمانوں میں عہدے دار جو دھرم کے مہامتر سمجھے جاتے ہیں کبھی مقرر نہیں کئے گئے تھے - لیکن اب میں نے اپنی ابھیشیکا کے تیرہ سال بعد دھرم کے مہامتر مقرر کئے ہیں —

ہر ذات اور ہر فرقے کے لوگوں میں یہ (مہا متر) دھرم کے نفاذ و قیام میں دھرم کی ترقی ' رعیت کی بہبودی و خوشحالی کے بڑھانے میں سرگرم ہیں - اور یونا ' کمبوجا ' گندھر ' راشٹریکا ' پیٹینکا اور دوسری ان قوموں کی [فلاح وخوشحالی میں مشغول ہیں] جو میری (قلمرو کے) حدود پر واقع ہیں —

آقا و غلام ' برھمن ' امیر و غریب اور سن رسیدہ کی فلاح وبہبود کو بڑھانے میں مشغول ہیں- اور رعایا کے راستے سے خار و خس صاف کرنے میں (مشغول ہیں) وہ بے انصافی کی قید اور سزا کے روکنے - زکاوتوں کے دور کرنے ' خلاصی دینے اور ایسے حالات کی دیکھ بھال میں مشغول ہیں جہاں ایک تنہا شخص بڑا خاندان رکھتا ہے یا مصیبت سے چور ہوگیا ہے - یا کمر سن ہوگیا ہے —

یہاں ' پاٹلی پترا اور تمام صوبوں کے شہروں میں وہ (دھرم مہا متر) میرے بھائیوں ' بہنوں اور دوسرے عزیزوں کے نظم و نسق کی نگرانی میں مصروف ہیں میرے وفادار دارالسلطنت میں یہ دھرم مہا متر سری رعایا میں سے ان کے ساتھ مصروف ہیں جو دھرم کے فدائی ' دھرم پر قائم اور خیرات کے خوگر ہیں —

اس مقصد کے لئے اس مقدس کتبے کو تحریر کیا گیا ہے کہ تادیر قائم رہے

اور میری رعایا اس کے مطابق عمل کرے —

چتّن کا فرمان نشان - ۶

کاروبار کی مستعد انجام ۵ ھی

حضور اعلیٰ و اقدس کا یہ فرمان ہے :—

گزشتہ (دراز) زمانوں میں کاروبار کو (وقت پر) انجام نہیں دیا جاتا تھا اور اطلاعات ہر وقت نہیں پہنچائی جاتی تھیں - لیکن اب میں نے یہ انتظام کردیا ہے - کہ ہر وقت اور ہر جگہ ' خواہ میں تناول طعام میں مشغول ہوں ' حرم سرا میں ہوں ' خواب گاہ میں ہوں ' خلوت گاہ میں ہوں- سواری میں اور خواہ خانہ باغ میں ' سرکاری خبر رسانوں کو چاہئے کہ لوگوں کے کار و بار کے متعلق مجھکو اطلاع کیا کریں -

اور اگر اتفاق سے میں خود زبانی حکم دوں کہ تحفہ دیا جاے یا فرمان کی تعمیل کی جاے یا کوئی ضروری کام عہدہ داروں کے تفویض کیا جاے ' اور اس کاروبار میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جاے یا فرقوں میں کوئی ضرر رساں فعل وقوع میں آے تو میں نے حکم دیدیا ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ فوراً مجھے اطلاع کی جاے کیوں کہ میں اپنی جد و جہد اور کار و بار کی انجام دہی سے ہرگز پورا مطمئن نہیں ہوتا ہوں -

مجھے سب کی فلاح وبہبودی کے لئے کام کرنا چاہئے- اور اس کی بنیاد جد وجہد اور کاروبار کی انجام دہی میں ہے کیوں کہ عوام کی بہبودی کے حفاظت کے لئے اس سے زیادہ موثر و مفید کوئی چیز نہیں ہے - اور آخر میں کس لئے محنت کرتا ہوں اس کے سواے اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ مجھہ پر ذی حیات مخلوق کا جو فرض ہے اس کو ادا کرسکوں اور یہ کہ یہاں میں چند کو خوش کردوں تو ممکن ہے کہ دوسرے دنیا میں وہ جنت حاصل کرسکیں -

اس مقصد سے میں نے اس مقدس کتبہ کو لکھوایا ہے کہ یہ تادیر قائم رہے اور میرے لڑکے ' پوتے ' اور پڑپوتے رعایا کی بہبودی کے لئے کوشش کریں البتہ بغیر انتہائی ریاضت اور عمل کے یہ ایک دشوار کام ہے —

چٹان کا فرمان - نشان ۷

دھرم کی نامکمل تعمیل

حضور اقدس و اعلیٰ کی یہ خواہش ہے کہ ہر جگہ اور ہر طریقہ کے لوگ [دھرم پر] عمل پیرا ہوسکیں - کیوں کہ وہ سب حواس پر قدرت اور قلب کی پاکیزگی کے خواہش مند ہیں —

انسان ' البتہ ' اپنی خواہشوں میں تنوع اور اپنی پسندیدگی میں تنوع رکھتا ہے —

چند فرقے [دھرم کے فرائض] پورے ادا کرلیں گے اور دوسرے حکم کے صرف ایک حصہ کو بجالائیں گے - ایسے شخص کے لئے بھی جس کے واسطے اندھا دھند فیاضی ناممکن ہے حواس پر قدرت ' پاکیزگیٔ قلب ' شکر گزاری ' استقلال [جیسے جواہر] قطعی لابد ہیں —

چٹان کا فرمان (نشان ۸)

متبرک جاتراؤں

گذشتہ زمانوں میں شہنشاہان اقدس ان نام نہاد تفریحی دوروں پر نکلا کرتے تھے - اس تقریب میں شکار اور اسی قبیل کی دوسری تفریحات سے لطف اُٹھایا جاتا تھا - حضور اعلیٰ و اقدس ' البتہ اپنی ابھیشیکا کے دس برس بعد عقل کے راستہ پر قدم زن ہوے ہیں اس طرح دھرم کی جاتراؤں کی بنیاد پڑی جن میں فیاضی کے ساتھ سادھوؤں اور برہمنوں کی زیارتیں سونے کی نذروں کے ساتھ بزرگوں کی زیارتیں ' اور دھرم کی ہدایت اور دھرم [کے متعلق] بحث و مباحثہ [کے مقصد]

سے ملک و رعایا سے ملاقاتیں کی جاتی ہیں —

الحاصل اس وقت سے حضور اعلیٰ و اقدس کی یہ شادمانیاں گذشتہ کے تفریحات سے بدل گئی ہیں —

چتّان کا فرمان (نشان ۹)

حقیقی رسم

حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ہے :-

کہ لوگ بیماری کے موقعوں پر ' بیٹوں کو شادی پر بیٹیوں کے بیاہ پر اولاد کی ولادت پر ' اور سفر پر وداع ہوتے وقت ' مختلف رسوم بجالاتے ہیں - لیکن ایسے موقعوں پر عورت ذات بے تعداد گوناگوں ادنیٰ اور فضول رسوم انجام دیتی ہے —

رسمیں واقعی بہت کی جاتی ہیں - لیکن اس قسم [کی رسمیں] کوئی پھل نہیں لاتیں [رسم کی] یہقسم' البتہ'دھرم کی رسم بڑا ثمرہ دیتی ہے - اس میں [یہ تمام باتیں] شامل ہیں :—

غلاموں اور نوکروں کے ساتھہ مناسب سلوک ' استادوں کی عزت ' ذی حیات مخلوق سے تلطف ' اور سادھوؤں اور برہمنوں کے ساتھہ فیاضی —

یہ چیزیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں دھرم کی رسمیں کہلاتی ہے —

اس لئے باپ ' بیٹے ' بھائی ' آقا ' دوست [اور] رفیق کو نہیں [بلکہ] ہمسایہ کو بھی چاہئے کہ وہ یہ کہے :- " یہ [رسم] لایق قدر ہے یہی وہ رسم ہے جو بجالائی جاے یہاں تک کہ منزل مقصود تک رسائی ہوجاے —

کس قسم کی رسوم سے منزل مقصود تک رسائی ہوتو ہے ؟ کیوں کہ اس دنیا کی رسوم کے نتیجہ خیز ہونے میں شبہ ہے ' شاید وہ مقصد کو پورا کریں شاید نہ کریں ' اور اس کا اثر صرف اسی دنیا تک ہے —

دھرم کی رسم اس کے برخلاف نہ صرف دنیوی ہے کیوں کہ اگر اس دنیا میں وہ منزل مقصود تک پہنچنے میں ناکام بھی رہے تو دوسری دنیا میں وہ یقیناً دایمی صلہ دیتی ہے —

اگر یہ مقصود دلی حاصل کرلے تو دو قسم کا فائدہ یقینی ہے یعنی اس دنیا میں مقصود دلی [کا حاصل کرنا] اور دوسری دنیا میں دایمی صلہ حاصل کرنا دھرم کی مذکورۂ بالا رسم سے —

چنّان کا فرمان نشان ۱۰

حقیقی شان

حضور اقدس و اعلیٰ اس کے معتقد نہیں ہیں کہ شان یا ناموری زیادہ فائدہ دیتی ہے [اس سے قبل] کہ جب میری رعایافرمان برداری سے دھرم کے قانون کو سنے اور اس کے احکام کو مانے اس مقصد کے لئے حضور اقدس و اعلیٰ شان و ناموری کے خواہاں ہیں - جو کچھ کہ ریاضتیں حضور اعلیٰ و اقدس کرتے ہیں - وہ سب آئندہ زندگی کے لئے ہیں تاکہ ہر ایک خطرہ سے نجات پاے اور یہ خطرہ گناہ ہے —

سواے ریاضت شاقہ کے اور تمام مقاصد سے دست بردار ہوے بغیر ایسی آزادی حاصل کرنا ادنیٰ یا اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لئے حقیقت میں دشوار ہے ' وہ اس پر بھی اعلیٰ طبقہ والے کے لئے دشوار ہے —

چنّان کا فرمان - نشان ۱۱

حقیقی خیرات -

حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ہے —

کوئی اور خیرات دھرم کی خیرات کی سی نہیں ہے - دھرم میں دوستی ' دھرم میں بذل ' دھرم میں رفاقت —

وہ [ان چیزوں پر] مشتمل ہے :—

غلاموں اور نوکروں کے ساتھہ مناسب سلوک ' باپ ماں کا کہا ماننے ' دوستوں' رفیقوں ' عزیزوں ' سادھوؤں ' اور برہمنوں کی تعظیم کرنے اور ذی حیات مخلوق کی حفاظت پر [مشتمل ہے]

اس لئے باپ ' بیٹا ' بھائی ' آقا ' دوست ' رفیق [ہی] نہیں بلکہ ہمسایہ کو بھی کہنا چاہئے :—

" یہ قابل قدر ہے ' اس کو بجالانا چاہئے "

جو کوئی اس طرح عمل کرے وہ اس دنیا کو بھی حاصل کرتا ہے اور آئندہ دنیا میں خیر دایم حاصل کرتا ہے اسی دھرم کی خیرات کے ذریعہ سے —

چٹان کا فرمان - نشان ۱۲

رواداری

حضور اقدس و اعلیٰ تمام فرقے کے لوگوں کی خواہ وہ بھکشو ہوں یا گرہستی ' تحفوں اور تعظیم کی مختلف صورتوں سے عزت کرتے ہیں - حضور اقدس و اعلیٰ نذر و نیاز یا ظاہری تعظیم کی اس قدر پروا نہیں کرتے جس قدر کہ تمام فرقوں میں تزکیۂ نفس خود داری کی [فکر] کرتے ہیں - تزکیۂ نفس اور خودداری کئی صورتیں اختیار کرتی ہے ' لیکن اس کی جڑ زبان کی روک تھام ہے ' یعنے انسان کو چاہئے کہ وہ بے سبب اپنے فرقے کی پوچ نہ کرے یا دوسرے فرقے کی تحقیر نہ کرے - بے قدری محض ذاتی اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے کیوں کہ دوسرے لوگوں کے فرقے بھی کسی نہ کسی سبب سے عزت کے مستحق ہیں —

اس طرح عمل کرنے سے انسان اپنے فرقے کی عزت افزائی کرتا ہے اور ساتھہ ہی دوسرے لوگوں کے فرقہ کی بھی خدمت کرتا ہے - اس کے خلاف عمل کرنے سے انسان اپنے فرقے کو نقصان پہنچاتا ہے - اور اپنے فرقے سے پوری وابستگی رکھنے

کی بنا پر ' اپنے فرقے کی عظمت کو بڑھا کر دکھانے کی نیت سے دوسروں کے فرقوں کی تحقیر کرنے سے ' در حقیقت اس طرز عمل سے وہ خود اپنے فرقہ کو سخت نقصان پہنچاتا ہے —

اس لئے اتحاد و اتفاق لائق قدر ہے یعنے دھرم کو سننا اور شوق سے سننا ' جیسا کہ دوسرے لوگوں نے اس کو مانا ہے ' کیوں کہ حضور اقدس و اعلیٰ کی یہی خواہش ہے کہ تمام فرقے زیادہ درس لیں اور ایک ہی عقیدہ کو مانیں —

اس لئے تمام فرقوں کے پیروں کو [خواہ] وہ کوئی ہوں اطلاع دی جاے کہ حضور اقدس و اعلیٰ نذر و نیاز اور ظاہری عزت کی اتنی قدر نہیں کرتے جتنی کی روحانی ترقی کی قدر اور تمام فرقوں کی توقیر کرتے ہیں —

اسی مقصد کے لئے دھرم مہامتر ' استری مہامتر ' ناظر اور دوسرے عہدہ دار مقرر کئے گئے ہیں —

اور اس کا ثمرہ یہی ہے ——— اپنے فرقہ کی ترقی اور دھرم کی عظمت کا اعجاز —

چتان کا فرمان (نشان ۱۳)

فتح

باشندگان کالنگا حضور اعلیٰ و اقدس کے ہاتھوں ' ان کی ابھیکا حاصل کرنے کے آٹھ سال بعد ' مفتوح ہوے - ڈیڑھ لاکھ نفوس وہاں سے اسیر لاے گئے اور ایک لاکھ قتل کئے گئے اور اس تعداد کے کئی گنا فنا ہو گئے —

استیصال کالنگا کے بعد ہی حضور اقدس و اعلیٰ نے دھرم کی پر جوش حفاظت دھرم سے محبت ' اور اس دھرم کی ہدایتوں کا آغاز کیا - اس طرح حضور اقدس و اعلیٰ کو کالنگا کے مفتوح کر لینے پر تاسف ہوا - کیوں کہ ایسے ملک کا استیصال

جو پہلے فتح نہ ہوا ہو - قتل ' موت ' لوگوں کی اسیری کا موجب ہوتا ہے اور یہ حضور اقدس و اعلیٰ کے لئے انتہائی رنج و افسوس کا باعث ہے —

تاہم حضور اقدس و اعلیٰ کے اس سے زیادہ رنج محسوس کرنے کا ایک اور سبب ہے کیوں کہ ایسے ملک میں برہمن یا سادھو یا مختلف فرقوں کے لوگ یا گھر بار والے جیتے ہیں جن پر بزرگوں کی اطاعت ' ماں باپ کی اطاعت ' اور معلموں اور نوکروں کے ساتھہ دیانت دارانہ شیفتگی کے مناسب سلوک کا فرض عاید کیا گیا ہے - ایسے ملک میں اس قسم کے لوگوں پر ظلم یا قتل یا ان کے محبوبوں سے جدائی (جیسے حبس) گزرتے ہیں یا بد نصیبی ان لوگوں کے دوستوں ' جان پہچان والوں ' رفیقوں ' اور عزیزوں پر نازل ہوتی ہے جو خود غریب محفوظ ہیں اور جن کی اُلفت لازوال ہے - اس طرح ان کے لئے بھی ظلم کی ایک شکل ہے - آدمیوں پر گزرنے والے یہ تمام متعدد واقعات حضور اقدس و اعلیٰ کے لئے رنج کا باعث ہیں کیوں کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ لوگ کسی نہ کسی فرقہ میں عقیدہ یا ایمان نہ رکھتے ہوں —

اس طرح جو لوگ قتل کئے گئے ' یا مارے گئے اسیر کئے گئے ان کے سویں یا ہزارویں حصہ کا بھی اگر یہی حشر ہو تو حضور اقدس و اعلیٰ کے لئے یہ رنج کا باعث ہے - اس کے علاوہ حضور اقدس و اعلیٰ اس غلطی کو برداشت کرلیں گے اگر کسی نے ان کے حق میں کی ہو اور (اگر) وہ آسانی سے برداشت کی جاسکتی ہو - اپنی قلمرو کے کوہستانی باشندوں کو بھی حضور اقدس مہربانی سے دیکھتے ہیں اور ان کی تبدیل مذہب کے خواہاں ہیں کیوں کہ (اگر وہ ایسا نہ کریں) تو حضور اقدس کو پچھتاوا ہوگا - ان کو برائی کے راستوں سے ہٹنے کے لئے کہا گیا ہے تاکہ وہ سزا نہ پائیں کیوں کہ حضور اقدس کی خواہش ہے کہ تمام ذی حیات مخلوق حفظ و امان ' ضبط نفس ' اطمینان قلب اور شادمانی حاصل کرے —

اور حضوراقدس کی رائے میں بڑی افضل ترین فتح ہے —— دھرم کے ذریعہ فتح —— اور حضور اقدس نے یہی (فتح) حاصل کی ہے - خود اپنے قلمرو میں اور ہمسایہ سلطنتوں میں - چھ سو کروڑ تک - جہاں یونانی بادشاہ اینٹی اوکس رہتا ہے اور اسی اینٹی اوئس کے شمال میں جہاں چار بادشاہ رہتے ہیں - جن کے الگ الگ نام یہ ہیں - ٹالمی - اینٹی گونس ' - مگاس اور اسکندر اور جنوب میں چولا ' پانڈیا - اسی طرح سچ لنکا اور یہاں بھی بادشاہ کی قلمرو میں یونا ' کمبوجا میں اور نابھاکا کے (باشندے) نابھاپامتی میں ' بھوجا اور پیٹی نیکا میں اور اندھرا اور پولندا میں —— ہر جگہ لوگوں نے دھرم کی ہدایتوں کی پیروی کی ہے - ایسے ملک میں بھی جہاں حضور اقدس کے پیغامبر پہنچ نہیں سکتے ہیں وہاں بھی لوگ ان رسوم و آئین کو جو دھرم پر منحصر ہیں اور ان کو دھرم کے متعلق ہدایتوں کو سن کر دھرم پر عمل کر رہے ہیں اور عمل کریں گے اور پھر ہر جگہ جہاں اس طرح فتح حاصل کی جائے ہر جگہ مسرت سے بھری ہوئی فتح ہے - ان فتوحات میں جو دھرم کے ذریعہ حاصل کی جائیں مسرت پائی جاتی ہے - البتہ یہ خوشی ایک معمولی بات ہے —

چٹان کا فرمان (نشان ۱۴)

دھرم کے حکموں کے اس مجموعے کو حضور اقدس و اعلیٰ کے حکم سے ایسی شکل میں کیا گیا ہے [جو] کبھی مختصر ہو گئی ' کبھی اوسط لمبائی کی اور کبھی مفصل - کیونکہ ایک ہی چیز ہر جگہ موزوں نہیں ہوتی ہے - کیونکہ میرے ممالک وسیع ہیں ' اور بہت کچھ لکھا گیا ہے - اور آئندہ بھی میں بہت کچھ لکھواؤں گا —

بعض فقروں کو ان کے مبحث کی شیرینی کے سبب سے بارہا دہرایا گیا ہے - اس توقع میں کہ شائد لوگ ان پر عمل کریں - یہ ممکن ہے کہ حکم کے کسی حصے

کے قطع ہونے سے یا اس کے مفہوم کو غلط سمجھنے سے یا کاتب کی غلطی سے کچھ نا مکمل لکھا گیا ہو —

کالنگا کے فرامین

فرمان نشان ۱

سرحدیوں کے لئے فرمان :- سرحدی اقوام کے لئے عہدے داروں کے فرائض -

حضور اقدس کا یہ فرمان ہے :-

[مقام] سمپا پر عہدے داروں کو بادشاہ کے حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا جائے :-

میرے جو کچھ بھی خیالات ہیں میری خواہش ہے کہ وہ عمل پذیر ہوں اور چند ذریعوں سے پورے کئے جائیں - میری رائے میں اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے افضل ذریعہ تم کو میری [یہ] ہدایتیں ہیں " تمام آدمی میرے بچے ہیں" اور جس طرح کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں ہر قسم کی بہبودی و شادمانی حاصل کریں اسی طرح میں آدمیوں کے لئے بھی یہی آرزو رکھتا ہوں —

اگر تم پوچھو " کہ غیر مفتوح سرحدیوں کے متعلق شہنشاہ کا کیا حکم ہے یا (یہ کہ) میں سرحدیوں سے کس صداقت کے اختیار کرنے کی خواہش رکھتا ہوں " جواب یہ ہے کہ بادشاہ چاہتے ہیں کہ ان کو مجھ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے اور ان کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے - ان کو مجھ سے شادمانی لینی چاہئے نہ کہ رنج اس کے علاوہ ان کو یہ صداقت جاننا چاہئے کہ " بادشاہ صبر سے ہماری بات برداشت کرلیں گے جہاں تک وہ برداشت کی جاسکتی ہے " اور یہ کہ " ان کو میری خاطر دھرم کو اختیار کرنا چاہئے اور اس طرح اس دنیا کو اور دوسری دنیا کو پانا چاہئے —

اور اسی مقصد کے لئے میں تم کو ھدایتیں کرتا ھوں - اس طریقے سے میں اپنے فرض سے سبکدوش ھوچکا ھوں جب میں نے تم کو ھدایت کی اور اپنی مرضی اپنا غیر متزلزل عزم اور اپنا وعدہ ظاھر کردیا ھے —

اب اس کے مطابق عمل کرتے ھوے تم کو اپنا کام کرنا چاھئے اور ان لوگوں کو مجھ پر بھروسہ کرنے اور اس صداقت کو جاننے پر آمادہ کرنا چاھئے " بادشاہ ھمارے حق میں باپ سے بڑھ کر ھے ' وہ ھمیں اس سے بڑھ کر محبت کرتا ھے جتنا کہ وہ اپنی ذات سے محبت کرتا ھے - ھم بادشاہ کے لئے اس کے بچوں سے بڑھ کر ھیں " —

تم کو ھدایت کرنے اور اپنی مرضی ' اپنے غیر متزلزل عزم اور وعدے کو ظاھر کر دینے سے (گویا) میں نے مقامی عہدے داروں کو اس کام کے لئے سکھایا ھے - کیونکہ تم اس لایق ھو کہ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ کرنے کے لئے آمادہ کرو - کو اور اس دنیا اور دوسری دونوں میں ان کی بہبودی و شادمانی محفوظ کراسکو - اور ایسا کرنے سے تم جنت پاسکتے ھو اور میرا فرض ھو جو تم پر ھے ادا کرسکتے ھو -

اور اس مقصد سے یہ کتبہ یہاں کندہ کیا گیا ھے تاکہ عہدے دار بلا تامل سرحدیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں جد و جہد کریں اور ان کو دھرم کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں —

چہارماھی موسم کے آغاز پر تشیا کے روز اس کتبہ کو دھرانا چاھئے اور جیسا کہ موقع ھو یہ تشیا کے روز وقفوں میں ایک ھی سامع کے لئے دھرایا جا سکتا ھے - اس طرح عمل کرکے میرے مقاصد کو انجام دینے میں کوشش کرو —

کالنگا کا فرمان - (نشان ۲)

اضلاع والوں کے متعلق فرمان :- عہدہداروں کے فرائض اضلاع والوں کے متعلق حضور اقدس کے حکم سے :—

توسالی کے افسروں کو (جو) ضلع کے ذمہدار ھیں اس طرح مخاطب کیاجائے:—

جو کچھ کہ میرے عقائد ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کی تعمیل ہو اور اثر پذیر کئے جائیں چند ذریعوں سے - اور میری رائے میں اس مقصد کو پورا کرنے کا خاص ذریعہ میرے (وہ) ہدایتیں ہیں (جو میں نے) تم کو (کی ہیں) تاکہ تم نیک لوگوں کی صحبت حاصل کرسکو —

" تمام لوگ میری اولاد ہیں " اور جس طرح کہ میں اپنی اولاد کے لئے چاہتا ہوں کہ وہ اس دنیا اور دوسری میں ہرقسم کے اقبال و خوشی سے بہرور ہوں اسی طرح میں سب لوگوں کے لئے یہی چاہتا ہوں، حالانکہ تم اس حقیقت کو اس کی پوری وسعت تک اخذ نہیں کرتے ہو شائد کوئی متنفس توجہ کرتا ہو، لیکن صرف ایک جزو پر، کل پر نہیں - اب اس پر غور کرو کیونکہ یہ اصول خوب طور پر قائم ہوا ہے —

پھر ایسا واقع ہوتا ہے کہ کوئی متنفس قید ہوتا ہے یا کسی برے سلوک کا مستوجب ہوتا ہے اور (؟) جب یہ واقع ہوتا ہے بغیر کسی واجبی سبب کے تو بہت سے لوگ رنجیدہ ہوتے ہیں - ایسی حالت میں تمہاری خواہش انصاف کرنے کی ہونا چاہئے —

تاہم فطری جبلتوں کے لئے کمیابی ناممکن ہے یعنے، حسد، استقلال کا فقدان ترشروئی، بےصبری، بےشغلی، کاہلی، اور عیش طبعی، تمہاری خواہش ہونی چاہئے کہ ایسی خاصیت تمہارے اندر ہونے پائے - اس تمام معاملہ کو اصل استقلال اور صبر سے اس اصول کے کاربند ہونے میں ہے - بیشتر طالب آدمی حرکت کرنے کے لئے خود کو اٹھا نہیں سکتا ہے لیکن انسان کو چاہئے کہ وہ حرکت کرے، بڑھے اور چلے —

اس طریقہ سے تم کو اپنے فرض کا خیال رکھنا چاہئے تمہیں یہ یاد رکھنے کے لئے کہنا چاہئے : —

میرے احکام پر دھیان دھرو، حضور اقدس کو یہ یہ ہدایتیں ہیں " ان کی

بجاآوری خوب پھل لاتی ہے اور ان کی غیر بجاآوری سخت عذاب ڈھاتی ہے - ان لوگوں کو جو (اس کی بجاآوری میں) ناکام رہتے ہیں نہ تو بہشت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ بادشاہ کی خوشنودی - اس فرض کی ناقص انجام دہی میرا التفات کبھی حاصل نہیں کرسکتے اور میری ہدایات کے بجالانے سے تم بہشت بھی حاصل کر سکتے ہو اور میرا فرض جو تم پر ہے ادا کرسکتے ہو —

یہ فرمان دھرایا جانا چاہئے :—

ہر تشیا کے دن اور وقفوں میں، مناسب موقوں پر، (کم از کم) ایک ہی سامع کے روبرو دھرایا جائے - ایسے افعال کے ذریعہ تم کو میری آرزوئیں پوری کرنے میں جدوجہد کرنی چاہئے —

اس مقصد کے لئے یہ فرمان یہاں کندہ کیا جاتا ہے تاکہ شہر کے ذمہ دار عہدہ دار اہل شہر کو بے سبب قید اور بدسلوکی سے بچانے کے لئے بلاتامل جدوجہد کریں —

اور اس مقصد کے لئے دھرم کی مطابقت میں میں ہر پانچویں سال ایسے عہدہ دار دورہ پر بھیجوں گا جو نرم اور معتدل طبیعت کے (اور) پاکیزگئی حیات کی طرف توجہ کرنے والے ہیں - جو اس مقصد کو پہنچانتے ہوے میری ہدایات کے مطابقت میں عمل کریں گے —

اجین سے شہزادہ اس قبیل کے لوگوں کو اسی مقصد سے بھیجے گا - لیکن تین سال کی حد سے تجاوز نہ کریگا—

ٹکسیلا پر بھی یہی حکم عاید ہوتا ہے —

جب مذکورۂ بالا عہدہ دار دورہ پر نکلیں تب خود اپنے معمولی کاروبار کی طرف غفلت برتے بغیر - وہ اس معاملہ کی طرف بھی توجہ کریں گے اور بادشاہ کی ہدایات کی مطابقت میں عمل کریں گے —

ستون کے فرامین - (نشان ۱)

اصول حکومت

حضور اقدس واعلیٰ کا یہ فرمان ہے : —

میری ابھیشیکا کے ۲۶ سال بعد میں نے اس مقدس فرمان کو لکھوایا ہے دھرم سے گہری محبت اپنی ذات کا امتحان ' سخت اطاعت ' سخت رجا اور شدید جدوجہد کے بغیر اس دنیا اور دوسری دونوں حاصل کرنا دشوار ہے تاہم میری ہدایات کی وجہ سے دھرم کے شوق اور محبت روز بروز بڑھتے ہیں اور بڑھیں گے - میرے کارندوں نے بھی خواہ اعلیٰ ادنیٰ یا متوسط رتبہ کے ہوں خود میری تعلیم کو قبول کیا ہے اور صراط مستقیم پر چل رہے ہیں — کیونکہ متلون مزاج لوگوں کو بھی صراط مستقیم پر چلایا جائے - سلزاوں کے چوکیدار بھی اسی طرح عمل پیرا ہیں —

کیونکہ یہی قانون ہے — دھرم کے ذریعہ حفاظت ' اسی قانون کے ذریعے بندوبست ' اسی قانون کے ذریعے اقبال مندی اور امن و امان' اسی قانون کے ذریعے (حاصل ہوسکتے ہیں) —

ستون کا فرمان (نشان ۲)

شاہی مثال

حضور اقدس واعلیٰ کا یہ فرمان ہے : —

" دھرم کا قانون بہتر ہے "

مگر دھرم کس جگہ پایا جاتا ہے

ان چیزوں میں یعنے فسق و فجور سے پرہیز کرنے' بہت سے نیک کاموں کے کرنے میں ' دردمندی ' فیاضی ' صداقت شعاری ' اور خلوص میں —

روحانی بصیرت کا تحفہ میں نے گوناگوں طریقوں سے دیا ہے دوپایہ پر ' اور چوپایہ پر : پرندوں اور پانی میں رہنے والوں پر میں نے متعدد احسانات کئے

ھیں ' حتیٰ کہ زندگی کی بخشش (میں) بھی ' اور بہت سے دوسرے نیک کام میں نے کئے ھیں --

اس مقصد سے میں نے یہ مقدس فرمان لکھوایا ھے تاکہ لوگ اس کی تعلیمات پر چلیں ' اور یہ کہ یہ تادیر جاری رھے اور وہ جو کہ اس پر چلےگا خوب کرے گا --

ستون کا فرمان - (نشان ۳)

اپنی ذات کا امتحان

حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ھے :

انسان اپنے ھر اچھے کام پر نظر کرتا ھے اور کہتا ھے :—

" میں نے یہ اچھا کام کیا ھے "

(لیکن) کسی طرح اپنے برے کام پر نظر نہیں کرتا اور نہیں کہتا :

" میں نے یہ برا کام کیا ھے "

" یہ کام فسق و فجور ھے "

درحقیقت یہ ضروری خود آزمائی دشوار ھے - تاھم انسان کو اس معاملے پر غور کرنا چاھئے کہ یہ باتیں فسق و فجور کی طرف رھنمائی کرتی ھیں یعنے بھیمیت ' ظلم ستمائی ' غصہ ' غرور ' حسد ' اور کہنا چاھئے کہ —

" ان کے سبب سے کیا مجھے زوال نہیں آئیگا "-

اس کو خاص طور پر سمجھنا چاھئے — یہ ایک دستورالعمل موجودہ دنیا کے لئے فائدہ‌مند ھے اور دوسرا دستورالعمل مجھے آنے والی دنیا کے لئے فائدہ دیتا ھے " --

ستون کا فرمان - (نشان ۴)

فظما کے حقوق و فرائض

حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ھے : --

میری آبھیشیکا کے ۲۶ سال بعد میں نے یہ مقدس فرمان لکھوایا ہے :—

میرے نظما کئی سوھزار لوگوں پر مقرر کئے گئے ھیں —— اور میں نے ان کو اعزازات عطا کرنے اور سزا (دینے) کی آزادی دی تاکہ نظما محفوظ اور نڈر ھوکر اپنے فرائض انجام دیں اور ملک کے لوگوں کو بہبودی و خوشحالی عطا کریں - اور ان کو فائدے پہنچائیں - وہ شادی و غم کے اسباب کو دریافت کریں گے اور دھرم کے (ماتحت) عہدہداروں کے ذریعے سے ملک کے لوگوں کو نصیحت کریں گے تاکہ وہ اس دنیا اور دوسری دنیا کو حاصل کرلیں —

کیونکہ نظما فرمان برداری کرنے کے لئے مشتاق ھیں' اور میرے کارندے میری مرضی اور احکام کی تعمیل کریں گے اور وہ بھی موقع پر نصیحتیں کریں گے جس سے نظما میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے رشک کریں گے ' کیونکہ جس طرح ایک شخص بچے کو ایک ھشیار دایہ کے سپرد کرنے کے بعد سلامتی محسوس کرتا ھے اور خود کہتا ھے کہ —

" یہ ھشیار دایہ میرے بچے کی خوشحالی کےلئے سرگرم ھے "

ٹھیک اسی طرح میرے نظما بھی ملک کے لوگوں کی بہبودی و خوش حالی کے لئے مقرر کئے گئے ھیں ' اس خیال سے کہ وہ نڈر ' محفوظ ' اور خاموش ھوکر اپنے فرائض انجام دیں ' اور اسی وجہ سے میرے نظما کو اعزازوں کے عطا کرنے اور سزا (دینے) کی آزادی دی گئی ھے کیونکہ یہ اسی قدر مطلوب ھے کہ عدالتی ضابطوں میں یکسا نیت رھنی چاھئے اور یکسا نیت سزاوں میں (رھنی چاھئے) اس وقت سے میرا یہ قانون ھے :—

" تقصیر وار لوگوں کو جو موت کی سزا کے تحت قید میں پڑے ھوے ھیں تین روز کی مہلت دی جاتی ھے " اس وقفہ میں چند تقصیروار لوگوں کے اعزا ان کی جان بچانے کی امید میں ' ان کو گہرے دھیان گیان کی دعوت دیں گے یا خود

نذرانے پیش کریں گے ' دوسری دنیا کو حاصل کرنے کے خیال سے روزے رکھیں گے تاکہ مرنے والوں کے مقدس دھیان گیان کو ترقی ہو —

کیونکہ میری یہ خواہش ہے کہ تقصیر وار اپنی قید کے زمانہ میں بھی دوسری دنیا کو حاصل کریں اور یہ کہ لوگوں میں مقدس کاموں کا عمل بڑھے ضبط نفس اور دان پن کے ساتھہ —

ستون کا فرمان (نشان ۵)

جانوروں کے ذبح اور عضو شکنی پر

قیود عاید کرنے والے قواعد

حضور اعلیٰ و اقدس کا یہ فرمان ہے :—

میرے بھکشو ہونے کے ۲۶ سال بعد ذیل کی قسمیں (جانداروں کی) ذبح سے بری کردی گئی ہیں یعنے :—

طوطے ' مینا ' گرتو " برہمنی بطخ " قاز ' نندی موکھا ' گیتاتا ' چمکادر ' چیونٹی مادہ ' سنگ پشت ' " ماہی بے استخوان " ویداویدیا کا ' گنگا پو پوتا کا '(؟) بارہ سنگا ' ہرن ' برہمنی بیل (؟) بندر ' گینڈا ' دیہات کے کبوتر ' چوپائے جو کام میں لائے یا کھائے نہ جاتے ہوں —

بکریاں ' بھیڑیں ' اور سور' یعنے وہ (جانور جن کے) ساتھہ بچے (ہوں یا جن کے) دودھ کے دن ہوں ' ذبح سے بری کئے جاتے ہیں - اور ان کے چھہ مہینے کی عمر تک کے بچے —

مرغوں کو آختہ کرنا نہ کیا جانا چاہئے —

بھوس کو ذی حیات مخلوق کے ساتھہ نہ جلانا چاہئے جنگل کو نہ جلایا جائے اس کا مقصد خواہ شرارت ہو یا بربادی جان ' جاندار کو جاندار نہ کھلانا چاہئے —

تینوں موسموں کے ہر بدر کاسل (کے طلوع) پر اور تشیا کے مہینہ (تسمبر -

جنوری) کے بدر کامل (کے طلوع) پر کیونکہ یہ دن (یہ تین دن) ہر حالت میں یعنے پہلے پندرواڑہ کے ہر چودھویں ، پندرھویں اور آٹھویں اور دوسرے پندر واڑہ کے ہر آغاز کرنے والے دن اور سال کے روزے کے دنوں کے لئے مچھلی ہلاکت سے بری کی گئی ہے اور بیچی نہ جاے گی —

اسی دن ہاتیوں کی حفاظت گاھوں اور مچھلی کے تالابوں میں جانوروں کی دوسری کوئی انواع تباہ نہ کی جائیں - ہر پندرواڑہ کے آٹھویں چودھویں اور پندرھویں دن میں اور تشیا اور پونر وسو کے دنوں میں اور تینوں موسموں کے بدر کامل کے دن اور تہوہار کے دنوں میں بیلوں کو آختہ نہ کیا جاے - بکروں ' بھیڑوں' سوروں اور دوسرے جانوروں کو جو عام طور پر آختہ نہیں کئے جاتے ہیں آختہ نہ کیا جانا چاہئے —

تشیا اور پونر واسو کے دنوں میں ' موسمی بدر کامل کے دنوں میں اور موسمی بدر کامل کے پندرواڑہ کے عرصہ میں گھوڑوں اور بیلوں کا داغ دیا جانا نہ کیا جانا چاہئے —

اس تاریخ سے کہ میری ابھیشیکا کو چھبیس سال ہوئے ہیں ' قیدیوں کی رہائی مجھ سے ۲۵ مرتبہ عمل میں آئی ہے —

ستون کا فرمان (نشان ۶)

ایک مقررہ عقیدہ کی ضرورت —

میری ابھیشیکا کے بارہ سال بعد میں نے یہ مقدس فرمان بنی نوع انسان کی بہبودی و خوش حالی کے لئے لکھوایا ہے - اس نیت سے کہ لوگ اپنے قدیم راستوں کو چھوڑ چھاڑ کے کسی نہ کسی طریقہ سے دھرم میں ترقی حاصل کریں غرض کہ بنی نوع انسان کی بہبودی و خوش حالی پر نظر رکھتے ہوے میں اسی مقصد سے میرے عزیزوں قریب کے لوگوں اور دور دراز کے لوگوں پر اپنی توجہ یکساں صرف کرتا ہوں اگر اتفاق

سے میں کسی کی خوشی کی طرف رہبری کرتا ہوں تو میں اس طرح اپنے انتظامات کرتا ہوں میں تمام فرقوں پر اپنی توجہ کو یکساں صرف کرتا ہوں کیونکہ مجھ سے عزت کی متعدد صورتوں میں تمام جماعتوں کی عزت کی جاتی ہے - تاہم کسی شخص کا اپنے عقیدہ پر ذاتی طور پر ثابت قدم رہنا میری رائے میں افضل شے ہے —

میری ابھیشیکا کے ۲۶ سال بعد یہ مقدس فرمان میں نے لکھوایا ہے —

ستون کا فرمان (نشان ۷)

دھرم کی اشاعت کے لئے بادشاہ کی تدابیر پر تبصرہ —

۱ - حضور اعلیٰ و اقدس کا یہ فرمان ہے:—

گذشتہ زمانوں میں بادشاہوں کی یہ خواہش تھی کہ لوگ دھرم کی ترقی کے ساتھہ ترقی کرلیں - لوگوں نے تاہم دھرم کی ترقی کے ساتھہ واجب تناسب میں ترقی نہیں کی —

۲ - پھر حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ہے —

مجھے یہ خیال گذرا :—

گذشتہ زمانوں میں گذرے ہوے بادشاہوں کی یہ خواہش تھی کہ لوگ دھرم کی ترقی کے ساتھہ واجب تناسب میں ترقی کریں - تاہم لوگوں نے دھرم کی ترقی کے ساتھہ مناسب ترقی نہیں کی پھر لوگ کن ذرایع سے قبول کرنے کے لئے راغب کئے جاسکتے ہیں کن ذرایع سے لوگ دھرم کی ترقی کے ساتھہ واجب تناسب میں ترقی کرسکتے ہیں کن ذرایع سے میں دھرم کی ترقی کے ساتھہ ترقی کرنے کے لئے کم از کم ان میں سے چند کو سرفراز کرسکتا ہوں -

پھر حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ہے :—

مجھے یہ خیال گذرا :—

میں دھرم کے احکام کو شایع کراوں گا اور اسی قانون میں ھدایتوں کے ساتھہ میں ھدایت کروں گا تاکہ لوگ ان کو سنتے ھوے بہت سے (لوگ) ان کو قبول کریں ' اپنے تئیں سرفراز کریں اور دھرم کی ترقی کے ساتھہ قوت سے ترقی کریں —

اسی مقصد سے میرے اس دھرم کے احکام کی دعوت دی گئی اور اس دھرم میں ھدایتیں پھیلائی گئیں تاکہ میرے کارندے (جو) عوام پر مقرر ھیں میری تعلیم کی تشریح و توضیح کریں —

نظما نے بھی جو کئی سو ھزار نفوس پر مقرر ھیں مجھہ سے ھدایتیں حاصل کی ھیں :—

" فلاں فلاں طریقے سے میری تعلیم کی تشریح دھرم کے ماتحت عہدہداروں پر کرو"۔

۴ - حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ھے :—

اس مقصد پر مزید غور کرتے ھوے میں نے دھرم کے ستون ایستادہ کئے ھیں۔ دھرم مہامتر مقرر کئے ھیں ' اور دھرم کے احکام مرتب کئے ھیں -

۵ - حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ھے :—

سڑکوں پر میں نے بڑ کے درخت ' آدمیوں اور جانوروں کو سایہ دینے کے لئے لگاے ھیں - میں نے امرائیاں لگائی ھیں ' ھر آدہ کوس پر میں نے کنویں کھدواے ھیں ' آرام گاھیں تعمیر کرائی ھیں متعدد آبدارخانے جگھہ جگھہ میری بدولت انسان اور حیوان کے استفادہ کے لئے مہیا کئے گئے ھیں تاھم ' یہ عام نہاد استفادہ ایک معمولی بات ھے - بنی نوع انسان اگلے بادشاھوں کے بدولت کئی برکتوں سے ایسی مشرف ھوی ھے جیسی کہ میری بدولت میرے معاملے میں ' تاھم اس نیت سے کہ لوگ دھرم قبول کریں کیونکہ میرا خیال تھا اس لئے یہ کیا گیا —

۶ - حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ہے :—

میرے دھرم مہاستر بھی (بادشاھی) خوشنودی کے ان اغراض سے وابستہ ھیں جو بھکشو اور گرھستی دونوں کو متاثر کرتی ھیں اور تمام جماعتوں سے یکساں وابستہ ھیں - میں نے یہ بھی انتظام کیا ھے کہ وہ بدھ متی فرقہ اور برھمنوں اور اجی ویکوں ' جینی اور در حقیقت متعدد جماعتوں سے وابستہ رھیں' کئی معمولی عہدہ دار اپنی متعلقہ ذمہ داریوں کی نگرانی کریں اور دھرم مہاستر ایسی مخصوص ذمہ داریوں کے المضاعف دوسری جماعتوں کی نگرانی کریں گے -

۷ - حضور اقدس و اعلیٰ کا یہ فرمان ھے :—

یہ اور دوسرے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار شاھی خیرات خود میری اور دیویوں کی (خیرات) تقسیم کرنے پر مامور ھیں اور میرے تمام خاندانوں میں یہ عہدہ دار یہاں (دارالحکومت میں) اور صوبوں میں مختلف طریقوں سے خیرات (؟) کے گونا گوں موقعوں کی طرف اشارہ کرتے ھیں - میں نے یہ بھی انتظام کیا ھے کہ وھی عہدہ دار میرے بیٹوں ' شہزادوں ' دیویوں کے بیٹوں کی خیرات تقسیم کرنے پر مامور کئے جائیں - کیونکہ متبرک کاموں کی ترقی اور قبول (دھرم کا) جن کی طرف اشارہ کیا جاچکا ھے وہ چیزیں ھیں جن سے رحمدلی ' فیاضی' صداقت ' خلوص ' تونی اور بزرگی اس طرح بنی نوع انسان میں ترقی کریں گے

حضور اقدس واعلیٰ کا یہ فرمان ھے :-

جو کچھ بھی لائق تحسین کام میں نے کئے ھیں ان کاموں کو لوگوں نے قبول کیا اور (وہ) ان کی تقلید کریں گے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ انہوں نے ماں باپ کا کہا کیا ھے' استادوں کا کہا کیا ھے ' سن رسیدہ کی عزت ' برھمنوں اور

سادھوؤں، غریب اور پراگندہ حال کے ساتھہ مناسب سلوک اور ہاں غلام اور نوکر کے ساتھہ بھی (مناسب سلوک) جیسی خوبیوں میں ترقی کی ہے اور ترقی کریں گے —

(۹) حضور اعلیٰ و اقدس کا یہ فرمان ہے :—

آدمیوں میں جہاں کہیں ترقی ظاہر ہوگئی ہے ، وہ دو طریقوں سے متاثر ہوئی ہے یعنے مقدس قواعد اور دھیان گیان سے ، ان دو طریقوں میں سے تاہم مقدس قواعد معمولی اہمیت رکھتے ہیں لیکن دھیان افضل ہے تاہم مقدس قواعد میری بدولت بدیں مضمون جاری ہوے ہیں ، کہ فلاں فلاں انواع ذبح سے بری ہیں ، اور دوسرے بہت سے مقدس قواعد ہیں جو میں نے جاری کئے ہیں - لیکن گیان دھیان کا بہتر اثر ، آدمیوں میں دھرم کی ترقی اور جاندار مخلوق کو قتل کرنے اور ذی حیات مخلوق کی قربانی سے زیادہ مکمل احتراز کرنے میں ہے —

اس مقصد سے یہ (فرمان) جاری کیا گیا ہے کہ جب تک سہرو ساہ قائم ہیں میرے بیٹے اور نسل کے (لوگ) اس کو قبول کریں کیونکہ ایسے قبول سے اس دنیا اور دوسری دونوں کا حاصل کرنا یقینی ہے یہ مقدس فرمان میں نے میری ابھیشیکا کے ۲۷ سال بعد لکھوایا ہے —

(۱۰) حضور اقدس و اعلیٰ کا اس کے متعلق یہ فرمان —

جہاں کہیں پتھر کے ستون ، پتھر کی الواح پائی جائیں یہ مقدس فرمان کندہ کیا جانا چاہئے تاکہ وہ تادیر قائم رہے —

چھوٹے ستونوں کے فرامین

سرنات ستوں کا فرمان - (نشان ۱)

مندر میں تفریق پیدا کرنے کی سزا

[پاٹلی پترا میں اور صوبجات میں اعلیٰحضرت کے احکام یہ ہیں] مندر میں

کسی شخص کی وجہ سے تفریق نہ ہونے پائے - لیکن جو کوئی ' بھکشو یا بھکشنی مندر کے اتحاد کو توڑیگا سفید لباس پہننے پر اور ایسی جگہ رہنے پر مجبور کیا جائیگا جو اہل مندر کے لئے مخصوص نہیں ہے - پس یہ آئین بھکشوؤں کی مجلس میں اور بھکشنیوں کی مجلس میں شائع کیا جائے —

حضور اقدس کا یہ فرمان ہے :—

اس فرمان کی ایک نقل تمہارے (؟) دفتر میں استفادہ کے لئے چسپان کی گئی ہے اور اس کی ایک ویسی ہی نقل تم کو عوام کی اطلاع کے لئے چسپان کرنا چاہئے - تاکہ دفیادار لوگ ہر روزہ کے دن آئین شرع سے واقف ہونے کے لئے حاضر ہوں اور روزہ کے دنوں میں ہر عہدہ دار کو اس آئین شرع سے واقف و مانوس ہونے کے لئے روزہ کی عبادت کے وقت حاضر ہونا چاہئے اور جہاں تک کہ تمہاری عملداری ہے تم اس مضمون کے مطابق اس کو ہر جگہ بھیجو اور اس طرح گوداموں میں اور ضلعوں میں اسی مضمون کے مطابق تم کو وہ بھجوانا چاہئے —

فرمان (نشان ۲)

کو سمبی کا فرمان ... ... وہی مضمون

حضور اقدس کو سمبی کے عہدہ داروں کو حسب ذیل ہدایت کرتے ہیں :—

مندر کا راستہ نہ چھوڑنا چاہئے - جو کوئی مندر کے اتحاد کو توڑے خواہ بھکشو ہو یا بھکشنی ' آئندہ سے اس کو سفید لباس پہننے پر اور ایسی جگہ رہنے پر مجبور کیا جائے گا جو اہل مندر کے لئے مخصوص نہیں ہے —

فرمان (نشان ۳)

سانچی کے ستون کا فرمان ... ...وہی مضمون

... . مندر [کاراستہ] بنایا گیا ہے ... ...

جو کوئی مذہب کا اتحاد توڑیگا ' خواہ بھکشو ہو یا بھکشنی سفید لباس پہننے پر اور ایسی جگہ رہنے پر مجبور کیا جائے گا جو اہل مذہب کے لئے مخصوص نہیں ہے - کیونکہ میری خواہش ہے کہ مذہب کا رشتہ تادیر قائم رہے -

فرمان (نشان ۴)

دیوی کا فرمان — دوسری دیوی کے عطیے

حضور اقدس کے حکم سے عہدے داروں کو ہر جگہ حسب ذیل خطاب کیا جائے- جو کچھ بھی عطیے دوسری دیوی نے دئے خواہ وہ امرائی ہو' تغریم گاہ دھرم سالہ' یا کچھ اور' اس دیوی کا کار خیر شمار کیا جائے اس قسم کے تمام معاملات دوسری دیوی کروا کی مادر تیورا [کی تحصیل خوبی کے لئے] ہیں -

متفرق کتبے

ترائی کے ستون کے یادگار کتبے

۱ - رمن دئی کا کتبہ

اشوک کی یادگار' سکیا منی بدھ کے جنم بھوم کی جاترا میں حضور اقدس اپنی ابھیشیکا کے بیس سال بعد بہ نفس نفیس اکر تعظیم بجالائے اور چونکہ " یہاں بدھ پیدا ہوا تھا" " سکھیا منی" (؟) پتھ کا ایک بڑا احاطہ تیار کیا گیا اور پتھر کا ایک ستون استادہ کیا گیا --

چونکہ یہاں ایک واجب التعظیم ہستی نے جنم لیا تھا (اس لئے) قصبہ لمنی (مذہبی) محصولات سے آزاد کیا گیا اور شہنشاہ کو جو آمدنی واجب تھی اس آمدنی کا) آٹھویں حصے کا مستحق گردانا گیا ہے —

۲ - نگلیتوا کا ستون —

اشوک کی یادگار بدھ کو نا کت ماتا کے اسٹوپا کی جاترا میں حضور اقدس و اعلیٰ نے اپنی ابھیشیکا کے ۱۴ سال بعد " بدھ کو ناک ماتا " کے اسٹوپا

کو دوبارہ بڑھایا اور اپنی ابھیشیکا کے بیس سال بعد بہ نفس نفیس آکر تعظیم بجالائے اور ایستادہ کیا (پتھر کا ایک ستون) —

اشوک کے "برابر" غار کے عطیے

۱ - سودامایا "بڑ کے درخت" کا غار —

"بڑ کے درخت" والا غار شہنشاہ لطف آثار نے اپنی ابھیشیکا کے بارہ سال بعد اجی ویکوں کو عطا کیا ہے —

۲ - وسو جھونپڑی یا کھلاٹیکا پہاڑی کا غار —

کھلاٹیکا پہاڑی کا یہ غار اجی ویکوں کو شہنشاہ لطف آثار نے اپنی ابھیشیکا کے بارہ سال بعد عطا کیا ہے —

۳ - کرنا - چوپار یا سوپیا کا غار —

شہنشاہ لطف آثار نے ابھیشیکا کے افیس سال بعد (؟) کھلاٹیکا پہاڑی میں، سوپیا کا غار (؟) عطا کیا اس وقت تک جب تک کہ مہر و ماہ قائم رہیں —

دشرتھہ کے ناگارجنی کے غار کے عطیے

اجی ویکوں کو سکونتی غاروں کا عطیہ

۱ - "وھی یوکا" کا غار —

دشرتھہ حضور اقدس نے اپنی تخت نشینی کے بعد فوراً واجب التعظیم اجی ویکوں کو قیام گاہ کے طور پر اس وقت تک جب تک کہ مہر و ماہ قائم رہیں - نامزد کیا ہے —

۲ - گوپیکا کا غار -

نام کے سوا (ہر بات میں) غار نمبر ۱ کے مانند ہے -

۳ - ویدا تھیکا کا غار -

نام کے سوا ہر بات میں غار نشان ۱ اور ۲ کے مانند ہے —

شرح

چھوٹی چٹان کا فرمان نشان :

روپ ناتھ کا متن :- یہ فرمان چھ جگھہ پایا جاتا ھے تین شمال میسور میں سدا پور کے قریب چٹانوں پر کندہ ھیں ، باقی تین شمال ھند میں صوبہ جات متوسط ، راجپوتانہ اور بہار میں پائے جاتے ھیں —

روپ ناتھ :- یہ مقام ضلع جبل پور ، صوبہ جات متوسط میں واقع ھے یہاں کی نقل شمالی ھند کی دیگر نقلوں سے صاف اور مکمل ھے - اس فرمان کی دوسری نقلیں راجپوتانہ میں اور جنوبی بہار ضلع شاہ آباد میں بمقام سہسرام پائی جاتی ھیں -

اس فرمان میں چند مبہم اور نا مکمل الفاظ اور جملے پائے جاتے ھیں جو معرکۃالارا اور اختلاف رائے کا باعث ھیں -

" ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ تک " اس کا مفہوم واضح نہ ھوسکا - آخری جملہ بھی غیر مکمل اور ایک معمہ ھے - جس کا صحیح حل نہ ھوسکا -

۲۵۶ :- ان ھندسوں سے کسی تاریخ کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ھے - اس سے مراد یہ ھے کہ ایک سال سے کچھہ زاید عرصہ میں اشوک نے جوش تبلیغ میں اس قدر سرعت اور ذوق سے دورے کئے کہ اس کو ۲۵۶ مرتبہ اپنی قیام گاہ کو تبدیل کرنا پڑا یعنی اشوک نے ۲۵۶ " دواسا " کئے اور اس لئے اشوک نے " دیوتھا " کا لقب اختیار کیا جس کے معنی " مسافر " کے ھیں -

برھمہ گری کا متن :- وھی فرمان -

ریاست میسور میں اس فرمان کی تین نقلیں پائی جاتی ھیں - یہ تینوں نقلیں بمقام " سدا پورا " چٹانوں پر کندہ ھیں - ان تینوں میں صرف ایک نقل بالکل محفوظ رہ گئی ھے جو برھمہ گری کے مقام سے پائی جاتی ھے - اس فرمان

میں "اسپلا" ایک گمنام مقام کے عہدہ داروں کو "سورنگری" کے شہر یار اور عہدہ داروں کی طرف سے خطاب کیا گیا ہے - سورنگری اس زمانہ میں جنوبی ہند کا مرکزی شہر تھا ہندوستان بھر میں :- دیومالا کی رو سے 'جمبد ویپا" سے مراد ہندوستان بھی ہے - اس کے علاوہ دیگر ممالک بھی شامل ہیں

چوٹی چٹان کا فرمان نشان ۲

اشوک نے کہیں کہیں اپنے شایع کردہ فرامین کا خلاصہ ایک ہی فرمان کی شکل میں شایع کیا ہے - ان میں سے یہ فرمان بھی ہے - ان خلاصوں کا مطلب بالکل ایک ہے - مگر فرق اتنا ہے کہ ان کی طرز تحریر بالکل جداگانہ ہے - اس فرمان کی تحریر میں اسی قبیل کے دیگر فرامین کی بہ نسبت کچھ فرق پایا جاتا ہے - بہت ممکن ہے کہ یہ فرمان جنوبی ہند ہی میں بمقام سورنگری - وہاں کے وائسرائے کے دفتر میں لکھا گیا ہو- اس فرمان کے ذیل میں جو دستخط پائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس فرمان کا کاتب دونوں رسم الخط "برھمی" اور "کھروشتی" سے واقف تھا - اور شاید وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنی قابلیت کا اظہار کرے غرض اس نے "نوشتۂ پاتا" کو برھمی رسم الخط میں لکھا ہے اور لفظ "کاتب" کھروشتی رسم الخط میں -

بھابرا کا فرمان

یہ کتبہ بمقام بیرات واقع ہے یہ نہایت ہی قدیم شہر ہے اور ریاست جےپور' راجپوتانہ میں واقع ہے اور شہر جے پور سے ۴۲ اور متورا سے ۱۰۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے —

اس فرمان میں سر ناتھہ کے ستون کے فرمان کی طرح شہنشاہ نے مگدھ کے صدر کی حیثیت سے مجلس کو خطاب کیا ہے - اس مگدھ یا آشوک کو سنسکرت میں "سنگھا" کہتے ہیں - اس فرمان میں شاہی القاب میں کچھ تبدیلی پائی جاتی

ہے یعنی پیا داس راجہ مگدھ یا حضور لطف آثار بادشاہ مگدھ ۔

چٹان کا فرمان ۱

بزم طرب :——— مجالس رقص و سرود اس بزم کو ' سماجا '' کہتے ہیں یہ سماجی مجلسیں کسی اونچی پہاڑی پر منعقد ہوا کرتی تھیں اور ان میں خوشی کے بےتکلف جشن منائے جاتے تھے ' رقص و سرود سے محفل گرم ہوتی تھی ان دعوتوں میں گوشت اور شراب کے دور بھی چلتے تھے ' اس قسم کی محفلوں سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں اس لئے اشوک نے ان کو موقوف کرا دیا اور ان کی جگہ مذہبی بحث کے لئے جلسے منعقد ہونے لگے —

چٹان کا فرمان ۲

چولا : ——— اس ملک کو " چولا منڈلم " بھی کہتے تھے اور اس ملک کی شمالی سرحد " دریائے پنارنگ " ہے اور جنوبی سرحد " دریائے ولارو " تک ۔ یعنی یہ ملک شمال میں "نیلور" سے جنوب میں "پوتوکوٹا" تک پھیلا ہوا ہے ۔ مغرب میں اس کی سرحد "کورگ" تک تھی ۔ غرض اس ملک میں مدراس اور دیگر انگریزی اضلاع اور میسور شامل تھے ۔

اوریور :——— یعنی قدیم ترچناپلی اس ملک کا سب سے قدیم شہر تھا ۔

پانڈیا :——— اس ملک میں اضلاع تناولی اور مدرا شامل تھے اس کا دارالحکومت کوڈکنی تھا ۔

کرالا پترا :——— تاریخ میں چیرا کے نام سے بھی مشہور ہے اس ملک میں ضلع ملابار' ریاست کوچین' اور ٹراونکور شامل تھے ۔

لنکا :——— قدیم اور اصلی متن میں اس کو "تامرا پرنی" کا نام دیا گیا ہے زبان انگریزی کے مشہور شاعر 'ملٹن' نے اپنی ایک تصنیف میں اس جزیرے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے " ملک ہند کا جزیرہ "

"تاپرو بین" —

انٹی اوکس :——— فرماں روائے یونان تھا سنہ ۲۴۷ ق م میں انتقال کیا - یہ بادشاہ "سیلیوکس" کا پوتا تھا جو چندر گپتا' اشوک کے جد اور بانئی خاندان سوریا کا ہم عصر تھا - "سیلیوکس" سکندر اعظم کے نقش قدم پر چلا اور ہندوستان پر چڑھائی کی مگر چندر گپت کے ہاتھوں اس نے شکست فاش کھائی اور اس کو صلح کرنی پڑی -

یونا :- اس سے وہ ممالک مراد تھے جو ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر واقع تھے -

سیتا پترا :- یہ ملک "تلوا" کی سلطنت سمجھا جاتا ہے اس ملک کا قدیم شہر منگلور ہے -

چٹان کا فرمان ۳

ابھیشیکا :——— ہندوستان میں تخت نشینی کے وقت بہت سی رسمیں ادا کی جاتی تھیں جن میں یہ بھی ایک اہم ترین رسم مانی جاتی تھی' برہمن گرو اپنے ہاتھ سے' ہونے والے راجہ پر مقدس پانی چھڑکتا تھا - اس سے گویا یہ مقصد تھا کہ اس وقت سے راجہ پر سلطنت کے تمام امور کی انجام دہی لازمی ہوگئی -

ناظم :——— اس عہدے دار کو "راجوکا" بھی کہتے تھے - اس کے ماتحت دوسرے عہدے دار بھی ہوتے تھے جن کا نام "پرادیسک" تھا -

چٹان کا فرمان ۵

کمبوجا :——— یہ ملک تبت کے باشندے تھے -

گندھرا :——— یہ ملک گندھرا کے رہنے والے تھے یہ ملک پشاور کے اطراف میں واقع تھا -

راشٹریکا :——— مہاراشٹر کے باشندے تھے جو مغربی گھاٹ میں واقع ہے -

پٹی ٹیکا پرتشٹھان :- جو موجودہ زمانے میں پٹن کے نام سے مشہور ہے ضلع اورنگ آباد میں واقع ہے اور دریائے گوداوری کے کنارے آباد ہے پٹن کے اطراف و اکناف میں جو قوم آباد تھی اس کو پیٹھی ٹیکا کہتے تھے —

چٹان کا فرمان ۶

سرکاری مخبر : شہنشاہان سوریا کے عہد میں محکمۂ خفیہ کو بہت عروج دیا گیا تھا - ایک خفیہ پولیس مقرر کی گئی تھی جس کا یہ کام تھا کہ سلطنت کے کے ہر ملازم اور وائسراے کے حرکات و سکنات پر خفیہ طور پر نظر رکھے اور ملک کی رعایا پر بھی غور کرے اور شہنشاہ کو ذرا ذراسی بات سے اطلاع دے - اس کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کو ہر وقت اپنی رعایا کی طرف سے ڈر لگا رہتا تھا - حالانکہ اس خفیہ محکمے سے حکومت کو یہ فائدہ تھا کہ ذرا ذراسی بات سے واقفیت ہوجاتی تھی مگر اس انتظام سے ایک شدید نقصان بھی تھا - یعنے بادشاہ اور رعایا یا شاہی ملازم کے درمیان کسی قسم کا بھروسہ باقی نہ رہا - بادشاہ کو اپنی رعایا سے بیجا کھٹکا لگا رہتا تھا اور رعایا کی آزادی جاتی رہتی تھی - غرض اشوک کے انتقال کے بعد سوریا سلطنت کے فوری انقراض کی یہ بھی ایک وجہ تھی -

چٹان کا فرمان ۷

بھکتی :- خاص لگاؤ یا محبت جو کوئی شخص اپنے ہی مذہب یا فرقہ سے رکھتا ہو -

چٹان کا فرمان ۸

بحث و مباحثہ :- ہندوستان کے اکثر بادشاہوں کا رواج رہا ہے کہ جب کسی جنگ یا معرکہ سے فراغت اور آزادی حاصل ہو تو اپنے دربار میں بحث و مباحثہ کی بزم منعقد کرتے - جن میں ہر قوم و ملت کے جید علماء مدعو کئے جاتے تاکہ ہر ایک اپنے مذہب کی خوبیوں کو بیان کرے اور مذہب و فلسفہ پر عالمانہ بحث کرے اور

اظہار خیالات کرے غرض اشوک نے بھی یہی کیا۔ وہ اپنے دوروں کے وقفوں میں اس قسم کی بزم منعقد کرتا تھا جس میں بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا اور تحفے تحائف بھی تقسیم ہوتے تھے۔ اشوک کے بعد مہاراجہ ہرش نے بھی اشوک کی تقلید کی ماضئی قریب میں اکبر بھی اسی لئے مشہور ہے کہ وہ مذہبی مکالمے سے لطف حاصل کرتا تھا۔

چٹان کا فرمان نشان ۱۰

فسق و فجور :۔ اپن یم۔

پن یم :۔ اس کا ضد ہے اور اس کے معنے نیکی اور شرافت کے ہیں۔

چٹان کا فرمان نشان ۱۲

لاھو کا : قدر کو گھٹانا، بے عزتی۔

باھو کا :۔ عزت و تعظیم۔

عورتوں کے لئے مہامتر یا محتسب :۔ ان محتسب کا یہ فرض تھا کہ عورتوں کے اخلاق و عادات پر نظر رکھیں اور ان کے حرکات و سکنات کا خیال رکھیں کہ وہ اخلاق و تہذیب سے ہاتھہ دھو نہ بیٹھیں۔

چٹان کا فرمان نشان ۱۳

کالنگا :۔ اس سلطنت کی وسعت، اوریہ کے ساحل پر، شمال میں دریاے مہا ندی سے جنوب میں دریاے گوداوری تک ہے۔

ٹالمی فی دو لفس :۔ فرمان رواے مصر تھا، اور سنہ ۲۸۵ سے سنہ ۲۴۷ ق م تک حکومت کی۔

اینی ٹی گونس :۔ فرمان رواے مقدونیہ تھا، اور ۲۷۸ سے ۲۳۹ ق م تک حکومت کی۔

مقاس :۔ فرماں رواے سیرین جو مصر کے مغرب پر واقع ہے۔

اسکندر :- فرمان روائے اِپیرس اور اینٹی گونس کا حریف -

نابھپ پنتی :- اس نام کے ملک کا کوئی نام و نشان نہیں ہے -

بھوجا :- غالباً وھی قبیلہ تھا جو آج کل اسی نام سے اِلچ پور' برار میں واقع ہے -

اندھرا :- یہ ملک دریائے گوداوری اور کرشنا کے درمیان واقع ہے -

پولندا :- غالباً یہ کوئی پہاڑی قوم ہے جو دریائے نربدا کی وادی میں مقیم تھی -

کالنگا کے فرامین :

سرحدیوں کے برتاؤ کے لئے اشوک نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس میں اس نے " توسالی ' جنوبی مفتوح ممالک کے مرکزی حکومت کے وائسرائے اور عہدہداروں کو خطاب کیا ہے - یہ کتبہ " دھاؤلی " کے مقام پر پایا جاتا ہے - غالباً توسالی بھی اسی مقام پر واقع تھا --

اسی مقام پر اور ایک فرمان بھی پایا جاتا ہے جو توسالی کے ذمہدار ملازمان سرکار کو مخاطب کیا گیا ہے :-- یہ ایک گم نام مقام ہے جو غالباً ضلع گنجام میں " جوگادا " کے قریب واقع تھا --

شہنشاہ کے کارندے یا نائب :-- یہ وھی سرکاری مخبر تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ان ملازموں کو سنسکرت میں ' پتی ویدا کا " کہتے ھیں —

ستون کا فرمان (نشان ۴) :——

عہدہدار جو ' راجوکا " کے لقب سے مشہور تھے ' ان کو موجودہ زمانہ کے کمشنر کے پورے اختیارات حاصل تھے - ان کے ماتحت " پرادیسک " مقرر تھے ' ان کے اختیارات زمانۂ حال کے صوبہ دار کے مساوی تھے یہ دونوں عہدہدار ' سرکاری مخبر پتی ویداکا ' کے زیر معائنہ تھے اور ان کی حرکات و و سکنات کی ذرا ذرا

سی خبر بادشاہ کو مل جایا کرتی تھی —

ستون کا فرمان (نشان ۵) :——

برھمنی بطخ :— یہ لال رنگ کے قاز تھے - اس پرندے کو سنسکرت شاعری میں " چکراوکا " کہتے ھیں اور ھندي ادب میں " چکوا چکوی " اور عموماً ادب و شاعري میں اس پرندہ کو از دواجی خلوص و محبت اور نسوانی وفاداری سے تشبیھہ دی جاتی ھے - مادہ سنگ پشت :— اس کو سنسکرت میں " دودی " کہتے ھیں اور یہ شہوت انگیز دوا کے لئے استعمال کیا جاتا ھے —

برھمنی بیل :— اکثر ھندوؤں میں رواج ھے کہ بعض بیلوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ھے ' ان سے نہ کوئی کام لیا جاتا ھے نہ ان پر قید ھوتی ھے ' ان بیلوں کو برھمنی بیل کہتے ھیں—

ھاتھیوں کی قیام گاھیں :— غالباً ھاتھیوں کے گرفتار کرنے کا کوئی طریقہ تھا کیوں کہ اس زمانے میں ھاتھیوں کے زندہ شکار کا بادشاھوں کو شوق تھا —

مچھلی کے حرض :— ان حوضوں میں عوام کو مچھلی کے شکار کی اجازت تھی

تشیا اور پونرواسو :— ھندوستان کے قدیم باشندوں نے سال کو تین - موسموں میں تقسیم کیا یعنی - گرما ' باران ' اور سرما ' ھر ایک موسم چار مہینوں پر مشتمل تھا - اور ھر مہینے میں چار " اپوستھا " یا روزے آتے تھے - یہ روزے گویا - عیسائیوں کے Sabath کے مانند تھے کیونکہ ان ایام میں کسی قسم کا کام نہ کرنا چاھئے تھا تمام مشاغل سے دست بردار ھوجانا چاھئے تھا اور یہ دن آرام عبادت کے لئے مخصوص تھے —

تشیا اور پونرواسو :— دو ستارں Constellation) کے نام ھیں' ان موقعوں پر بھی کسی قسم کا کام نہ کیا جاتا تھا —

دھرم مہامتر یعنے دھرم کے محتسب ' ان ملازموں کا یہ فرض تھا کہ دھرم

کی اشاعت اور تبلیغ میں سرگرم رہیں ان کے ماتحت " دھرم یکتا " تھے جن کے بھی فرائض اسی قسم کے تھے —

ستون کا فرمان (فشان ۶)

ہر آدہ کوس کے فاصلہ پر :—— ان الفاظ پر مورخوں نے تنقید کی ہے اور مختلف رائے دی ہے ' بعض کا خیال ہے کہ آدہ کوس کے فاصلہ پر ایک کنواں کھودنا یا سرائے تیار کرنا ' آسان کام نہیں تھا اور ایک حد تک اس زمانے میں ناممکن الوقوع تھا ' ان مورخوں نے یہ رائے دی ہے کہ آدہ کوس کے بجائے " اٹھہ " کوس ترجمہ ہو ' مگر اکثر نقادوں نے اس رائے کو غلط ثابت کیا ہے ' وسنت اسمتھ نے اس واقعہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ چندرگپت کے عہد میں آدہ کوس یا ایک میل کے فاصلہ پر ایک پتھر نصب کیا گیا تھا ' بہت ممکن ہے کہ اشوک نے انہیں پتھر کے قریب یعنے آدہ کوس کے فاصلہ پر کنوئیں کھدوائے ہوں —

شہنشاہ کی خاص رانیوں کو دیوی کا لقب عطا کیا گیا تھا ' اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ کے حرم سرا میں اور بہت سی عورتیں بھی مقیم تھیں ' صرف شاہی خاندان کی رانیوں کو یہ لقب عطا تھا تاکہ رانیوں میں اور دیگر عورتوں میں امتیاز رہے ان دیویوں کے لڑکوں کو " دیوی کمار " کا لقب تھا —

چھوٹے ستون کا فرمان (فشان ۱) :—

ضلع کو اس زمانے میں " وشایا " کہتے تھے ' پرگنہ بھی کہتے ہیں ہر "وشایا" پر ایک عہدہ دار ' " وشایاپتی " مقرر تھا —

چھوٹے ستون کا فرمان (۲)

دوسری دیوی کا نام " کرو واکی " تھا ' یہ دیوی شہزادہ " تیوارو " کی ماں تھی —

دسرتھہ :— اشوک کا پوتا تھا اور اشوک کے بعد تخت نشین ہوا :—

ترائی کے کتبے :—

ترائی میں دو کتبے پائے جاتے ہیں ' ان میں سے ایک کتبہ ایک ستون پر کندہ ہے جو مقام رومن‌دئی ایک مندر میں واقع ہے - یہ مندر نیپال کی ترائی میں ' " قصبۂ پڈیریا " کے قریب اور انگریزی ضلع " بستی " سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے --

" رومن‌دئی " کا قدیم نام " لمبنی " تھا اور روایتاً " مشہور ہے کہ اس جگہ " مہاتمابدہ ' ساکھیہ منی " پیدا ہوا - ساکھیہ کا مرکز " کپل وستو " تھا ' جو لمبنی کے قریب واقع تھا ' یہ کپل وستو آجکل " تلا راکوٹ کے نام سے مشہور ہے -- ترائی کا ستون (نشان ۲) :- بالکل شکستہ حالت میں ایک تالاب کے کنارے پایا گیا ' یہ تالاب " رومن‌دئی " سے تیرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے --

" بدہ کو ناکامانا " کا استوپا :——

بدہ متیوں کا اعتقاد ہے اور یہ امر ایک حد تک تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ گوتم بدہ کے قبل بھی بہت سے بدہ پیدا ہوے تھے جنھوں نے اس زمانے کے مذہب کی ابتر حالت دیکھکر ملک کے مذہب و اخلاق کے اصلاح کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی ' " بدہ کو ناکا مانا " بھی ان ہی بدھوں سے ایک تھا ' جس نے ملک کے گرے ہوے مذہب اور اخلاق کی اصلاح کرنے کی جدوجہد کی تھی " اشوک ' چونکہ " صلح کل " یا مذہبی آزادی کا قائل تھا وہ ہر مذہب و ملت کی تعظم کیا کرتا تھا اور ہر مذہبی معلم کا قدردان تھا ' اس لئے اس نے اس بدہ کے شکستہ استوپ کی‌دوبارہ تعمیر کروائی اور ایک وقت خود یہ نفس نفیس حاضر ہوکر جاتراکی اور تعظیم بجالایا' اس کی یادگار میں اشوک نے ایک ستون ایستادہ کیا —

اجی ویکا :—

یہ اس زمانہ کے متعدد فرقوں سے ایک تھا ' ان کے مذہب کے اصول دوسرے

مذہبوں سے بالکل جدا گانہ تھے ' حالانکہ یہ جین مذہب سے کچھ ملتا جلتا تھا ' اس مذہب کے پیرو ہر وقت برہنہ رہا کرتے تھے اور بالکل تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے یہ نہایت ہی سخت ریاضت اور عبادت کے عادی تھے اور اکثر پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتے تھے ' اس قابل التعظیم فرقہ کو اشوک اور اس کے پوتے ' دسرتھ ' نے متعدد غار عطا کئے —

خطبۂ صدارت تعلیمی کانفرنس حیدرآباد

از

(عالیجناب محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ

[ذیل کا گراں قدر خطبۂ صدارت عالیجناب صدر صاحب کلیہ نے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دسویں سالانہ اجلاس منعقدۂ ۷ تیر سنہ ۳۹ ف میں بہ مقام ٹاؤن حال (باغ عامہ) پڑھا تھا - ہم مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس کے ممنون ہیں کہ ان کی عنایت سے یہ مجلہ میں شائع ہو رہا ہے] —

' مجلہ '

جناب صدر نشین صاحب استقبالیہ کمیٹی ' و حاضرین جلسہ ! -

میں ایک دن شام کو چند ہی روز قبل سالانہ امتحانوں کے کام سے تھکا ماندہ نظام کلب گیا تو میرے دوست مولوی سید خورشید علی صاحب اعزازی معتمد کانفرنس نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تعلیمی کانفرنس حیدر آباد کے دسویں اجلاس کی صدارت میرے تفویض ہوئی ہے اور میں جلد اس کے لئے تیار ہو جاؤں پروفیسر میگ ناتھ شاہا Meg Nath shah جو عثمانیہ یونیورسٹی کے علمی امتحانات طبیعات کے میرے ساتھ شریک ممتحن منتخب ہوے تھے انھیں دنوں آنے والے

تھے - تعلیمی سال کا آخری زمانہ ایم - ایس - سی کے عملی امتحانات کی تیاری میں توقع کررہا تھا کہ ان سے فارغ ہوجاؤں تو ذرا فرصت کے ساتھہ آرام تو کیا لوں کسی دوسرے علمی کام میں مصروف ہو جاؤں - معتمد صاحب کی اس فرمایش نے مجھہ کو حیران و ششدر کردیا - کانفرنس کی صدارت کا اعزاز میرے لئے باعث تشکرو ممنونیت تھا لیکن پریشانی تھی کہ خطبہ کی تیاری اور ضروری مواد کی فراہمی کے لئے وقت کہاں سے لاؤں - معتمد صاحب موصوف نے مواد کی فراہمی میں مدد دینے کا وعدہ فرمایا تو مجھے اس عزت کے قبول کرنے کی ہمت ہوئی —

حضرات میں آپ کا نہایت درجہ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھہ کو اس جلسہ کی صدارت پر مامور فرمایا مجھہ سے پہلے جن بلند مرتبہ نام آور عالی شان ہستیوں نے یہ کام انجام دیا ہے ان کے مقابلہ میں جب اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو آپ کی یہ کرم فرمائی میرے لئے باعث فخر ہوجاتی ہے - میں امید کرتا ہوں کہ میری اس خطبہ میں جو فرو گزاشتیں ہوں گی ان کو از راہ کرم تنگی وقت کے خیال سے معاف فرمائیں گے —

معزز حاضرین ! - میں اس خطبہ میں تعلیم کا کوئی جدید نظریہ یا سائنٹفک اصول نہیں بیان کروں گا - کسی خاص مسئلہ پر مفصل بحث نہیں کروں گا - اس کا نہ تو موقع ہے اور نہ اس کے لئے اتنا وقت مل سکتا ہے میں آپ کی خدمت میں پہلے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ تعلیمی حالت کا ایک خاکہ کھینچ کر بتانا چاہتا ہوں اور ضروریات حالیہ کے پیش نظر ملک کی ترقی و بہبود سے متعلق میرے ذاتی تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو تجاویز مناسب معلوم ہوتے ہیں ان کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں —

تعلیمات کے مسائل بہت ہیں اور ان پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے - ایسے اشخاص بھی جنھوں نے مسلسل سررشتۂ تعلیمات ہی میں اپنی

پوری مدت ملازمت صرف کی ہو تعلیم کے مختلف شعبوں پر حاوی نہیں ہوسکتے یہ اسپیشلیزیشن یعنے تخصیص کا زمانہ ہے ' ہر شعبہ میں اسپیشلیسٹ کی ضرورت ہے - کوئی ایک شخص ایسا نہیں مل سکتا جو تعلیم کے تمام شعبوں سے اچھی طرح واقف ہو - میری عمر کا بیشتر حصہ اس ملک کی محض اعلیٰ تعلیم اور اس کے مسائل حل کرنے کی کوشش میں صرف ہوا ہے - تعلیم کے دیگر مسائل کے متعلق میری رائے اور میرے معلومات اپنے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہیں —

جیسا کہ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ ء کے خطبہ صدارت میں میرے محترم دوست نواب مرزا یار جنگ بہادر نے فرمایا ہے ' ممالک محروسہ سرکار عالی میں اسٹیٹ ایجوکیشن اور سرکار کی طرف سے براہ راست تعلیم کا انتظام تقریباً اسی وقت سے آغاز ہوا ہے جب سے کہ گورنمنٹ ہند نے اپنے آپ کو باشندگان ہند کی تعلیم کا علی الاعلان ذمہ دار گردانا - اس وقت سے اب تک تقریباً پچھتر سال ہونے کو آئے خواہ برٹش انڈیا میں یا ممالک محروسہ میں ترقی ہی ترقی ہوتی رہی مہذب ممالک میں تعلیم کی ترقی نہ ہو تو کیا تنزل ہوگا ؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ ترقی کس رفتار سے ہورہی ہے - کیا تعلیم کے مختلف شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح اس کی اصلاح ہوسکتی ہے —

واضح ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی کی رفتار برطانوی ہند کی رفتار سے سست تر رہی ہے اس کے اسباب بڑی واضح ہیں دیسی ریاستوں کو وہ سہولتیں اور ذرائع عمل حاصل نہیں جو سرکار عظمت مدار کو حاصل ہیں برٹش انڈیا کی تعلیمی رفتار کے ساتھ توازن و تقابل حیدرآباد کی تعلیمی رفتار کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے مبنی بر انصاف نہ ہوگا - یا تو برٹش انڈیا کے مختلف صوبجات کی تعلیمی حالت سے فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے یا ان کے اوسط سے - میری رائے میں یہ ایک بے کار آدمی کا کام ہے - ایسے اعداد و شمار کو جس شکل میں ڈھالنا چاہیں ڈھال سکتے ہیں لیکن اس سے فائدہ کچھ نہیں —

ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ برٹش انڈیا کے بہترین صوبے سے ہمارے اس حصۂ ملک کی تعلیمی حالت یقیناً پست تر ہے - اور ان کی ترقی کی رفتاروں میں بھی طبعی طور پر اسی قسم کی نسبت پائی جاتی ہے اس سے ہمارے مدبرین یا عہدے داران سرشتۂ تعلیم پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا اس لئے کہ جب تک ملک کے تمام حالات پر غور نہ کیا جائے مدراہ تعلیم موانعات اور دقتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا شاید زیادہ منصفانہ طریقہ یہ ہوگا کہ اس وقت ہماری گزشتہ بیس سال پہلے کی تعلیمی حالت سے موجودہ حالت کا اندازہ کریں - اس مدت کا اکثر و بیشتر حصہ ہمارے آقائے ولی نعمت ہز اگزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں بہادر جی - سی - ایس - آئی سلطان العلوم کی فرمانروائی کا ہے - اس مجمع میں غالباً ایسے متعدد لوگ ہوں گے جنھوں نے عہد عثمانی کے آغاز سے پہلے حیدرآباد کی درسگاہوں میں تعلیم ختم کی ہوگی اور جو اعلیٰ تر یافتی تعلیم کے خواہشمند رہے ہونگے - لیکن ادھر اُدھر تک و دو کرنے کے بعد ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اس مقصد کے لئے بیرون ممالک محروسہ جانا ناگزیر تھا - جو ذی استطاعت تھے اور شوق بھی کافی رکھتے تھے انھوں نے تو مدراس ' پونا بمبئی یا علی گڑھ وغیرہ جاکر اپنی آرزوئیں پوری کرلی ہونگی بقیہ لوگوں نے صرف حسرت ہی حسرت میں عمر رائگاں کی ہوگی - میں آپ کے حافظے پر اس وقت کے درسگاہوں کی تعداد اور ان کی تفصیل وغیرہ کی فہرستیں پڑھ کر اعداد و شمار کا بار ڈالنا اور تکلیف دینا نہیں چاہتا - چند سرسری مگر مناسب حال واقعات بیان کردوں گا - مشرقی علوم کے لئے اس وقت دارالعلوم کا دروازہ کھلا تھا مغربی علوم کے لیکن سائنس کو اس سے خارج کرکے) نظام کالج کی بلند عمارت موجود تھی مگر اس میں داخل ہونے کا راستہ مدراس یونیورسٹی کے تعلق کی وجہ سے بہت دشوار گزار اور تھکاوٹ تھا —

قانون کے شیدائی شب کو لا کلاس کی سیر کیا کرتے تھے مغربی طب کے خواہشمند میڈیکل اسکول کی معدودے چند نشستوں پر متمکن ہونے اس کے مختصر کورس کو پورا کرنے کے لئے ذی اثر حضرات سے سفارشی خطوط مانگتے پھرتے تھے - انجینیرنگ کے طلب گاروں کا بھی تقریباً یہی حال تھا - آرٹس اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم میں بھی ایسی ہی رکاوٹیں حائل تھیں - سائنس رو دھوکر انٹر میڈیٹ تک تو کرا لیتے تھے لیکن آگے جانے کا راستہ بند تھا عملی تعلیم کے لئے سامان مل سکتا تھا تو عمارت کا سوال جماعتوں کے افتتاح کو خارج از بحث کردیتا تھا - قدیم طرز پر جنھوں نے عملی مشق بغیر مضامین سائنس میں ڈگریاں حاصل کرلی تھیں وہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھے اور دوسرے بد نصیب ان کو نگاہ حسرت سے دیکھا کرتے تھے - بی - اے کے لئے پڑھنا اور اس کی ڈگری کا حاصل کرنا اسی صورت میں ممکن تھا - کہ مدراس یا کسی اور جگہ چلے جاتے اور وہاں بھی برائے نام کسی پروفیسر سے کچھ مدد لے کر دو تین کتابیں رٹ لیتے اور یم - اے بن کر واپس آتے —

ریسرچ یا علمی تحقیقات کا نام بھی ہندکی جامعات میں کبھی نہیں سنا جاتا تھا البتہ کتب نویسی اور خصوصاً نصاب کی کتابوں پر نوٹس لکھنا فارغ التحصیل شخصوں کے لئے ایک مفید کار آمد کام سمجھا گیا تھا اور ہمارے ملک کے حضرات بھی کبھی کبھی اس جولان گاہ میں قدم رکھتے تھے —

ذرا اب حالیہ صورت کو دیکھئے - جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا دستر خوان ملک کے معمولی حیثیت اور اوسط قابلیت والے لڑکے کے لئے بھی بچھادیا ہے - ملک کا ہر فرد بشر جس نے ملک میں نشو و نما پائی ہے اور اس لئے زبان اردو سے واقف ہے ادنیٰ سے ادنیٰ مضامین میں ایم - اے اور ایم ایس سی کی حقیقی معنوں میں تعلیم پاتا اور ڈگری حاصل کر سکتا ہے - یہی سہولتیں طب انجنیری اور ایجوکیشن کے پیشوں کی تعلیم میں بھی مہیا ہوچکی ہیں - عثمانیہ

سنٹرل ٹکنل انسٹیٹیوٹ کے عالی شان مستقبل سے کون شخص ہے جو آشنا نہیں - زراعت صنعت و حرفت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کارروائی جاری ہے اور اُمید ہے کہ چند سال کے بعد ہمیں ان مضامین میں بھی برٹش اقتدیا کی محتاجی نہ رہے گی —

اس بیان سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حیرت انگیز ترقی پر نازاں ہوکر اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر متمکن ہو بیٹھیں کہ بہت کچھ ہو رہا ہے صرف وقت کا سوال ہے - کافی مدت میں ہم تعلیم کے نقطۂ نظر سے کمال کو پہنچ جائیں گے - کمال تو کسی صورت میں ممکن نہیں - یہ ریاضی کی وہ لامتناہی مقدار (Infinity) ہے جس کے صرف قریب تر ہونا ممکن ہے لیکن جس کو پہنچ جانا ناممکن ہے - ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا ہماری رفتار ہماری متمدن زندگی کے لئے کافی تیز ہے - ہم جو روپیہ صرف کر رہے ہیں اس کی تقسیم تعلیم کے مختلف شعبوں پر ان کی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے صحیح اُصول پر ہو رہی ہے یا نہیں- میں نے اب تک صرف اعلیٰ تعلیم اور کچھ فنی تعلیم کا حال بیان کیا - دیگر شعبہ جات تعلیم کے متعلق بھی کیا ہماری ترقی کوئی حقیقت رکھتی ہے یا نہیں سہولت کی خاطر تعلیم کو متذکرۂ ذیل حصوں یا شعبوں میں تقسیم کرلیں تو بیجا نہ ہوگا :-

(۱) ابتدائی تعلیم جس کے دو حصے کئے جاسکتے ہیں ' ایک حصہ دیہی رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا اور دوسرا شہری رقبہ کی ابتدائی تعلیم کا -

(۲) وسطانی تعلیم -

(۳) فوقانی تعلیم -

(۴) جسمانی تعلیم یا فزیکل ٹریننگ -

(۵) تعلیم اناث -

(۶) اعلیٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم -

(۷) تکنکل تعلیم جو دست کاری پر زیادہ زور دے —

(۸) پروفیشنل یا فنی تعلیم مثلاً طب - انجنیرنگ - زراعت - صنعت - تجارت - قانون - وغیرہ -

(۹) ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات علمیہ -

(۱۰) معمر اشخاص کی تعلیم (ایڈلٹ ایجوکیشن) Adult Education -

(۱۱) معذورین کی تعلیم - جیسے اندھوں بہروں اور گونگوں کی -

سنہ ۳۸ ف کی رپورٹ سے جو زیر ترتیب ہے میرے دوست فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات نے مجھ از راہ کرم جو اطلاع بہم پہنچائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار عالی نے ؛ پبلک ایجوکیشن کی اہمیت کے کماحقہ سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے - بلکہ بعض ابواب پر سرکار کا فیاضانہ صرفہ دیگر ممالک کے لئے قابل تقلید سمجھا جاسکتا ہے - لیکن یہ بھی واضح ہے کہ ابتدائی تعلیم تکنیکل تعلیم ' تعلیم نسواں اور ریسرچ پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے —

ہمارا موجودہ طریقہ تعلیم زیادہ تر برٹش انڈیا کے طریقہ تعلیم کی تقلید ہے لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ دن عنقریب آنیوالا ہے جب کہ یہ قدیم طریقہ ایک بڑی حد تک بدل دیا جائے گا اور محض کتابی یا زبانی تعلیم کے عوض طلبہ کو ملک اور خود ان کی ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم دلائی جائے گی جس سے کسب معاش و روزگار میں انھیں حالیہ تکالیف و پریشانیاں برداشت کرنی نہ پڑیں گی —

اگر میں متذکرہ بالا ۱۱ ابواب پر تفصیل سے بحث کرنا چاہوں تو اس کے لئے کئی لکچروں کی ضرورت ہوگی - نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس اتنا وقت ' یا آپ حضرات کو اتنی فرصت ہے کہ اس پر صرف ہو- صرف چند

ابواب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر کے آپ صاحبوں سے استدعا کروں گا کہ ان پر غور فرمائیں --

متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ملک کے تمام باشندوں کو لکھنا پڑھنا آنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ معاش زندگی کے لئے کھانا پینا جو پوشاک نوشت و خواند سے واقف نہیں وہ متمدن نہیں ہوسکتی - پس ابتدائی تعلیم کا لزوم ایک لازمی نتیجہ ٹھیرا - اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے سے ان کو تہذیب سکھادی جاتی ہے - سرکار کا فریضہ اس معاملے میں صرف اسی قدر ہے اور بس- میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ابتدائی تعلیم بالکلیہ ناقص اور آگے چلکر اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے بہترطریقہ یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم عام نہ کی جائے لیکن اضلاع کے لئے یہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو کہ لوگ اپنے بائی پیشوں کو ترک کرکے ملازمت کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کریں اور دیہات کو ویران و برباد نہ چھوڑدیں - اسی طرح شہری رقبوں میں بھی ابتدائی تعلیم اگر طالبہ کو صنعت و دست کاری سے نافر بنا کر صرف پیشہ ملازمت سرکاری یا وکالت ہی کو معزز پیشہ تصور کراتی ہے تو اس سے بھی احتراز کیا جانا چاہئے --

ممالک متروسہ میں سب سے زیادہ عام جو پیشہ ہے وہ پیشۂ زراعت ہے - دیہات کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں زراعت کی تعلیم بطور جزو اعظم شریک کی جانی چاہئے تاکہ لڑکے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لینے کے بعد اپنے آبائی پیشۂ زراعت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور دھوکے میں پڑ کر طلب علم یا ملازمت کی خاطر شہروں میں بھٹکتے نہ پھریں جس سے نہ تو خود انھیں کو کوئی اطمینان کی زندگی میسر ہو سکتی ہے اور نہ ان کے والدین یا سرپرستوں کو اولاد کی پرورش وتعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے - ابتدائی تعلیم اگر زراعت کا شوق دلائے اور اس کے متعلق صحیح اور مفید معلومات مہیا کرائے تو اس سے بہتر کوئی تعلیم ہمارے ملک کے فلاح و بہبود اور نوع انسان

کی خوشحالی کے لئے نہیں سونچی جاسکتی - ایسی دیہی تعلیم کے ساتھہ اضلاع میں کافی ٹیکنیکل مدارس کا کھولنا بھی ضروری ہوگا - زراعت محض بیج بونا اور کھیتوں کو پانی پہنچانا نہیں ہے - اس کے لئے آلات کی بھی ضرورت ہے وہ آلات ایسے ہونے چاہئیں کہ آسانی سے کم قیمت پر بروقت مہیا ہوسکیں ورنہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود' کی سی کیفیت پیدا ہوجائے گی - جب تک ملک میں میکنیکل انجینرنگ عالمگیر نہوجائے آلات کا اس طرح بہم پہنچانا ناممکن ہے - عرصہ دراز تک جانوروں گائے بیل وغیرہ سے ہمیں کام لینا پڑے گا اور ان کی نگہداشت بغیر حفظان صحت اور ویٹنری سرجن کے دشوار ہے پس دیہات میں ٹیکنیکل اور ویٹنری مدارس کا زیادہ تعداد میں کھولا جانا بھی لازمی ہے-

زراعتی تعلیم کے متعلق مجھکو فنی تعلیم کے ساتھہ بھی کچھہ کہنا ہوگا - شہری رقبوں کی تعلیم میں زیادہ تر شہر کی ضروریات کا لحاظ کیا جانا چاہئے اس رقبہ کے لوگوں کی نظر زیادہ تر ملازمت اور تجارت و صنعت و حرفت کی طرف لگی رہتی ہے - عام تعلیم تو قدیم یا موجودہ طریقہ سے حاصل ہوجاتی ہے لیکن وسطانی اور فوقانیہ مدارس میں اگر کمرشیل کلاسیں ' ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دلائی جائے اور مناسب صنعت و حرفت کے مدارس کھولے جائیں تو شہروں میں بے روزگاری کا سوال زیادہ تشویش اور تکلیف کا باعث نہوگا --

میں نہایت غور و ہراس کے ساتھہ چند سال سے دیکھہ رہا ہوں کہ ملک کے جوانوں اور خصوصاً طلبہ کی صحت جسمانی گھٹتی جارہی ہے - شہر کے لڑکے اور لڑکیاں خاص طور پر کمزور ہوتے جارہے ہیں - یہ مسئلہ حفظان صحت اور معیشت کے عام مسائل کے ساتھہ وابستہ ہے - تمام ملک میں ملیریا طاعون اور دق پھیلا ہوا ہے - ہماری سکونت اور بود و باش کے مقامات غیر سائنٹفک طریقہ پر منتخب ہوے ہیں ہمارے مکانات مغدوش اور سچ پوچھو تو بمصداق --

"حیدرآباد نگینہ - اندر مٹی اوپر چونا"

انسانوں کے بود و باش کے لئے اتنے موزوں نہیں ہیں جیسے کہ چوہوں گھوسوں اور متعدی امراض کے جراثیم کی پرورش کے لئے موزوں ہیں - میں اپنے دولتمند بزرگوں اور صاحب ثروت امراء سے معافی چاہ کر عرض کروں گا کہ ماحول کا اثر ان کے مکانات کو بھی جراثیم سے مصئون و مبرا نہیں رکھ چھوڑا ہے - حفظان صحت کی معمولی سی معمولی واقفیت بھی اس سقم کو دور کردیگی - آرائش بلدہ کی اسکیم سرعت کے ساتھ جاری ہے - توقع کی جاتی ہے کہ غربا کے رہائش کا مسئلہ بھی خاطر خواہ طریقے پر حل ہو جائے گا - یہ امور سرشتۂ تعلیم کے دائرے سے باہر ہیں - سرشتہ تعلیم طلبہ کے اقامت خانوں اور طلبہ کی ورزش جسمانی کی طرف توجہ کر سکتا ہے - اقامت خانوں کی زندگی اخلاقی اصول کے تابع ہمدرد اساتذہ کے زیر نگرانی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا - اس کے ساتھ ساتھ اگر ورزش جسمانی کا بھی اچھا انتظام کیاجائے تو ملک کے آئندہ شہری (Citizen) اپنی تندرستی کی وجہ سے زیادہ صحیح الدماغ خوش خلق اور کارفرما و کارگر ثابت ہوں گے - بوائز اسکاوٹس موومنٹ ٹریٹوریل کور کا قیام اور طلبہ مدارس کی عام جسمانی تربیت کے لئے ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ تجربہ کار شخص کا تقرر جو حال ہی میں عمل میں آیا ہے ہمیں امید دلاتا ہے کہ طلبہ کی صحت جسمانی میں معتدبہ ترقی ہوجائے گی - یونیورسٹی کے طلبہ کا سالانہ طبی معائنہ بھی منظور ہوچکا ہے - اگر مدارس کی عمارتیں سائنٹیفک اصول کے بموجب بن جائیں گی تو طلبہ کی اکثر و بیشتر جسمانی کمزوریاں مثلاً بینائی کا قصور خیشومی نقائص وغیرہ بڑی حد تک دور ہوجائیں گے —

طلبہ کو فطرتاً ورزش جسمانی کی طرف میلان طبع ہوتا ہے - اکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ اقامتی جامعات میں سب سے بڑی تربیت کتابی علوم سے بدرجہا بڑھکر

کھیل اور ورزش جسمانی اور معاشرتی زندگی ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے ہمارے بڑے مدارس میں بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں - اس فطری شوق کی ایک مثال شفیع احمد صاحب سابق طالب علم کالج جامعہ عثمانیہ کو پیراکی کی کامیابی ہے - جیسا کہ اکثر حاضرین مجلس کو معلوم ہے اسی فطری جذبے نے شفیع احمد صاحب کو رودبار انگلستان کے عبور کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا ہے - خدا سے دعا ہے کہ وہ اس عالی شان عزم میں کامیاب ہو جائیں —

ٹیکنکل تعلیم پر میں نے اس سے پہلے بھی کچھ کہا ہے - کسب معاش کے نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت واضح ہے - لیکن یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ٹیکنیکل تعلیم کی کامیابی کے لئے اول تو ملک میں صنعت وحرفت کا وسیع پیمانے پر موجود ہونا لازمی ہے کارخانے کے مالکوں کو ایسے ہونہار کارآموز (apprentice) کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہئے جو وہاں جاکر نوکری کرنا چاہتے ہوں - امیدواروں کو بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے مدرسے یا جامعہ کی سند ان کو اگر کسی چیز کا اہل بناتی ہے تو محض کارخانوں میں داخل ہوکر کام سیکھنے کا اہل بناتی ہے - اصل کام وہ کارخانوں ہی میں سیکھیں گے اگر یہ اسپرٹ رہو تو ملک میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ فروغ ہوگا - لیکن انڈسٹری یا صنعت میں کسی ملک کا حقیقی معنوں میں ترقی کرنا محض اسی قسم کے تدابیر سے حاصل نہیں ہوسکتا اس کے لئے بعض معیشتی Economic اور بین الاقوامی مسائل کا حل ہونا بھی ضروری ہے - برطانوی ہند کے معیشتی ماہر اور علی الخصوص کمیسٹ اس طرف توجہ کررہے ہیں - مجھے اپنی طرز زندگی اور مصروفیتوں کی وجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا - سردست میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان حضرات کو جو اس مسئلے کے دامن اپنے تئیں مشغول بتاتے ہیں تحقیقات کر لینے دیں اس کے بعد ہم ان کے نتائج پر تنقید کرسکیں گے ہمارے ملک کی ترقی کا دارمدار

زیادہ تر زراعت پر ہے ہمیں چاہئے کہ سردست زراعت کے مسائل پر غور کریں اور ان کا حل ڈھونڈیں -

جو کچھ بھی تیکنکل تعلیم ہم دے سکتے ہیں اس کو کامیاب بنانے کے لئے طلبہ کو بالطبع دست کاری کی طرف مائل اور اس سے مانوس بنانا سرشتۂ تعلیم کا بڑا فریضہ سمجھا جاسکتا ہے - اس کے لئے ابتدا ہی سے طلبہ کو دست کاری کا عادی بنانا ضروری ہے - پس مناسب ہوگا کہ دست کاری کو تعلیم کے نصاب میں شامل کردیا جائے - سائنس چونکہ ایک عملی علم ہے اس کو بھی ابتدا ہی سے نصاب تعلیم میں شریک کرنا لازمی ہوگا - جتنے بھی سائنٹفک مضامین ہیں ان سبھوں کی بنیاد طبعیات کیمیا حیاتیات اور ریاضی پر قائم ہے - پس ان مضامین کی طرف خاص توجہ کی جانی چاہئے اور اعلیٰ تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ترقی و ترویج کا انتظام ہونا چاہئے -

اعلیٰ تعلیم ایک ایسی شے ہے کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش بلکہ تکوین ہوتی ہے - الحمدللہ ہمارے ملک میں بتوسط جامعہ عثمانیہ و نظام کالج کافی توجہ کی جارہی ہے - دس بارہ سال کے اندر جامعہ عثمانیہ میں ایم اے و ایم ایس سی تک کی جماعتیں کھل گئی ہیں - ایل ایل بی کی تعلیم بھی اچھے اصول پر جاری ہے - جامعہ کی موزوں عمارت نہ ہونے سے ہمیں اس تعلیم سے وہ حیرت انگیز فائدہ حاصل نہیں ہورہا ہے جس کی ہمیں توقع ہے - بارجود ان رکاوٹوں کے ہم نے جو کام شروع کردیا ہے اس کی اہمیت کو ممالک غیر نے بھی تسلیم کر لیا ہے - بلا لحاظ تعلق مجھے جامعہ عثمانیہ کے متعلق زیادہ کہنا نہیں چاہئے - صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ حیدرآباد میں جامعہ کا قیام ایک فطری امر تھا اور اسی طرح اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا بھی ہمارے ملک کے لئے ایک فطری بات تھی - گزشتہ جلسۂ تقسیم انعامات کالج کے موقع پر میں نے بیان کردیا ہے کہ اردو زبان

میں تعلیم حقیقی باشندگان ملک کے تمام افراد کو بلحاظ قوم و ملت انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلانے سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہورہی ہے - میں یہاں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ملک کی دوسری زبانوں مثلاً تلنگی مرہٹی اور کنڑی کی بھی خاطر خواہ خدمت کی جارہی ہے - ان زبانوں میں ایم - اے تک کی تعلیم دی جاتی لیکن ان کے پروفیسروں نے زمانہ کا رنگ اور ہندو طلبہ کا طبعی رجحان دیکھ کر یہی مشورہ دیا کہ بجائے ورنیکیولر زبانوں میں ایم - اے کی جماعتیں کھولنے کے ریسرچ کی تعلیم دلائی جائے - چنانچہ حال میں ۷۵ - ۷۵ روپیہ کے تین وظائف ان زبانوں کی ریسرچ کے لئے منظور ہوئے ہیں اور یہ کام آئندہ شہریور سے شروع کردیا جائے گا - سائنس میں ایم - ایس سی کے ساتھ ریسرچ بھی شریک کردی گئی ہے - تاریخ کے ایم - اے میں پہلے ہی سے مقالہ نویسی داخل تھی اب اردو میں بھی اس کو لازمی کردیا جانا تجویز ہوا ہے —

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے بیان کیا تھا کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش ہوتی ہے - اس بارے میں میں ذرا زیادہ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں —

کسی قوم یا ملک کا وقار اس کے اعلیٰ ترین افراد ہی سے ہوتا ہے - وہ کون ہیں؟ ملک کے مدبر و عمائد سلطنت جو اپنی قابلیت وفا شعاری ہمدردی اور کارگزاری سے ملک کا نام روشن کرتے ہیں - امراء و سرمایہ‌دار جو اپنے فضل و کرم جود و سخا اور ملک کی خدمت گزاری سے رعایا اور حاجتمندوں کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں - ان کے سوا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو زمانہ دراز سے دنیا پر اپنا اثر ڈالتا چلا آرہا ہے - اس طبقہ میں مذہب و ملت کے پیشوا اور علماء و فضلاء شریک ہیں - زمانہ حال کی مادیت پرستی نے افسوس ہے پیشوایان مذہب و ملت کو خارج از بحث کردانا - اس لئے میں ان کا ذکر اس جگہ مناسب نہیں

سمجھتا - سچی بات تو یہ ھے کہ علماء و فضلاء ھی اس زمرہ میں شریک ھوسکتے ھیں- اس لئے میں علماء و فضلاء ھی کے متعلق بحث کروں گا - پہلے زمانہ میں خانگی تعلیم سے یا کسی مشہور و معروف اُستاد کی خدمت سے لوگ علم و فضل کے بلندترین درجوں تک پہنچ سکتے تھے - اب مادی علم اس قدر ترقی کرگیا ھے کہ بغیر اعلیٰ پیمانہ پر باقاعدہ اور مسلسل کوشش کرنے کے ملک کا کوئی فرد حقیقی معنوں میں عالم و فاضل نہیں بن سکتا - روحانیت کا دروازہ بند ھونے کو ھے صرف مادیت میں ترقی اور حیرت انگیز ترقی ھورھی ھے - خواہ فنون کے شعبہ میں ھو یا سائنس کے شعبہ میں نام آوری حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ریسرچ کی سخت ضرورت ھے - ایسی تحقیق صرف بڑے پایہ کے کتب خانوں اور تجربہ خانوں ھی سے ممکن ھے - قابل سے قابل شخص ان کتب خانوں اور تجربہ خانوں کے بغیر گمنام رہ جاتا ھے اور اوسط ذھانت کا انسان بھی ان میں کام کرکے کبھی کبھی بڑے اھم اور نمایاں ایجادات و انکشافات سے دنیا کو مسخر کرلیتا ھے - کتب خانوں اور تجربہ خانوں پر سرکار یا قوم کی طرف سے جتنا بھی روپیہ صرف ھو فائدہ سے خالی نہیں - ان میں کام کرنے والوں کو اطمینان قلبی نصیب ھونا چاھئے - اگر ایسی پروفیسریاں قائم کردی جائیں اور اُن پر ملک کے قابل ترین اشخاص مامور کئے جائیں تو ممالک محروسہ میں بھی اسی پایہ کی ایجادات و انکشافات دیکھنے میں آسکیں گی جیسے کہ برطانوی ھند کے بعض حصوں میں اب نمایاں ھورھی ھیں اور جن کا چرچا چار دانگ عالم میں ھورھا ھے - سر رابندرناتھ ٹیگور میگھناتھ اور سرسی وی رامن وغیرہ کی وجہ سے علمی دنیا میں ھند کو ان دنوں جو شہرت نصیب ھوئی ھے وہ بیس سال قبل لوگوں کے وھم و گمان سے بھی باھر تھی - کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے سربرآوردہ ماھران علوم و فنون میں حیدر آباد کے منتخب افراد کا نام داخل نہ ھو - ایسے کام کرنے والے یہاں ڈھونڈھنے سے دستیاب ھوسکتے ھیں - ان کو موقع دیا جانا چاھئے

ایک بار جب وہ اطمینان کے ساتھہ کام پر لگ جائیں گے تو ان کے زیر اثر ملک کے ہونہار طبقہ سے بھی ایک بڑی جماعت ایسے محققین کی پیدا ہونے لگےگی - میں نے کو ڈائی کنال کی رصدگاہ شمسی (Kodaikanal Solar Physics Observatory) میں ریسرچ کی اجازت ہمارے طالب علموں کے لئے حاصل کرلی ہے - پروفیسر ساہا (Saha) نے ہمارے ایک ایم ایس سی کے طالبعلم کو الہآباد کی فزکس لیبورے ٹری میں طیف نمائی (Spectroscopy) پر کام کرنے کی اجازت نہیں بلکہ دعوت دی ہے نظام کالج کے ایک ہونہار گریجویٹ نے پروفیسر رامن (Sir C. V. Raman.) کے تجربہ خانہ میں قابل تعریف کام کرنا شروع کردیا ہے - یہاں میں جامعہ عثمانیہ کے ان لائق طلبہ کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے یورپ کی جامعات میں قابل تحسین کامیابی حاصل کی ہے اور کر رہے ہیں - اس لئے کہ متعدد موقعوں پر میں نے تفصیل کے ساتھہ ان کا ذکر کردیا ہے - اگر ہم ہمارے تجربہ خانوں کو ترقی دے کر اطمینان کے ساتھہ اعلیٰ تحقیقات کا کام شروع کردیں توہمارے طلبہ کو باہر جانے کی ضرورت نہوگی اور تحقیقات میں، جو کچھہ کامیابی حاصل ہوگی اس کا صلہ ہمارے ملک ہی کو ملے گا --

اب میں تعلیم نسواں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ بات اظہرمن الشمس ہے کہ اگرچہ گزشتہ چند سال سے ہم نے اناث کی اعلیٰ تعلیم پر کافی روپیہ صرف کرنا شروع کردیا ہے اور مستورات کو یورپ بھیج کر تعلیم دلائی جارہی ہے لیکن یہ حقیقت مجموعی تعلیم نسواں پر اس سے بہت زیادہ روپیہ اور توجہ صرف کرنے کی شدید ضرورت ہے عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ روزمرہ کی معمولی اور ان کی ضروریات کے مناسب تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے -تعلیم یافتہ شخص کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو بلکہ طبقہ کی ہوں یاپست طبقہ کی نہ صرف لکھنے پڑھنے کی بلکہ اچھے اور اونچے معیار تک کی تعلیم دلانا کس لئے

ضروری ہے - اگر ہند مہذب دنیا کی نظروں میں عزت کا مقام چاہتا ہے تو اسے بہت جلد اپنے اناث کو تعلیم یافتہ بنادیناچاہئے - لیکن اس بات کا بھی لحاظ ضروری ہے کہ لڑکیوں کو اُن کے مفید مطلب اور کار آمد تعلیم دلائی جائے - لڑکیوں کے لئے لڑکوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہی غیر موزوں ہے جیسے کہ فوجی ملازمت - اگر مطمح نظر یہی ہے کہ لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح میٹریکیولیٹ - انٹر میڈیٹ پاس یا بی اے ایم اے بن کر تعلیم گاہوں سے نکلیں تو میں بلا تامل اپنے آپ کے ایسے ماہران فن تعلیم کے زمرہ سے علاحیدہ کر لوں گا جن کا یہ مطمح نظر ہے - اس مسئلہ کے متعلق بارہا اناث کی تعلیم کے سرپرستوں اور مہتمیوں سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا میں نے جب دریافت کیا کہ انگلستان کے مدارس اعلیٰ تربیت نسواں کے اصول پر تعلیم کیوں نہیں دی جاتی تو یہی جواب ملا کہ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم لڑکیاں ایسے مدرسوں میں شریک ہوں گی اور سرکاری یا یونیورسٹی کی سند کی رشوت بغیر اکثر و بیشتر ماں باپ اپنی بچیوں کو مدرسہ بھیجنا عبث سمجھتے ہیں - میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد یہ غلط خیال پبلک کے دلوں سے دور ہوجائے گا اور تعلیم کے اصل منشاء و مقصد کی طرف وہ مائل ہو جائیں گے —

یہ سرکاری اور یونیورسٹی کی سندیں ہی ہیں جو غالباً اناث کو بھی انہیں نصاب تعلیم کا پابند کراتی ہیں جو مردوں کے لئے تجویز ہوے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ شاید (Karve) مسٹر کاروے کی بنائی ہوئی مستورات کی جامعہ نے حصول سند کے شوق کو مفید مطلب نصاب کے ساتھہ ایک حدتک نباہ دیا ہے لیکن بہ نظر غایر اگر دیکھا جائے تو الا اس صورت کے جب کہ عورت کو ضرورت یا شوق کی خاطر نوکری اختیار کرنا پڑتا ہے حصول سند کی خواہش ہے - اور اگر درس گاہ میں صحیح اصول پر - باقاعدہ طریقہ سے اناث کی ضروریات ہی سے متعلق

نصاب تجویز کر کے تعلیم دینا شروع کریں تو میرا خیال ہے کہ بیشتر والدین اپنی بچیوں کو مدرسہ بھیجنا پسند کریں گے اور تعلیم یافتہ اناث کی تعداد میں معتدبہ ترقی ہوگی - ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں غالباً اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی خوش رہیں گی اور شادی کے بعد بھی شوہر و زن میں بخوبی اتفاق رہے گا - اگر کوئی غیر معمولی ذہانت والی یا تعلیم کی دلدادہ لڑکی محض اکتساب علم کی خاطر یونیورسٹی کا کورس اختیار کرنا چاہتی ہے تو یہ ایک دوسری ہی بات ہے ایسی لڑکی کو جس قدر بھی اس کے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مدد دی جائے اچھا ہے - ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ملک سے ایسی چند لڑکیاں نکلیں گی اور اپنے ماں باپ اور وطن کا نام روشن کریں گی —

اگر اناث کو سینا پرونا کشیدہ کاڑھنا اور کھانا پکانا سیکھ لینے کے بعد حفظان صحت دومسٹک اکانومی کمسٹری بیالوجی یا طب خصوصاً Midwifery (دایہ گی) اور Nursing (تیمار داری) کا شوق دلایا جائے تو وہ ملک اور قوم کے لئے نہ صرف مفید بلکہ مایہ ناز بھی ہوں گی - آخر الذکر شعبوں میں ہندوستانی عورتوں اور علی الخصوص مسلمان عورتوں کی اس قدر قلت ہے کہ ان کے لئے سرکار اور پبلک کی جانب سے خاص طور پر کوشش کی جانے کی ضرورت ہے —

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ پردہ مانع تعلیم اناث ہے اور جب تک یہ نہ اُٹھ جائے گا ہندوستان میں تعلیم یافتہ عورتیں عنقا ہی عنقا رہیں گی - پردہ کی حقیقت یا اس کی ضرورت و غیر ضرورت کا سوال معاشرتی ہے خالصاً تعلیمی نہیں - لہذا میں اس کے حسن و قبح پر اس محفل میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا - لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ پردہ کا عذر بتا کر جو لوگ تعلیم اناث سے غفلت کرتے ہیں اور اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ پہلے پردہ اٹھاویں بعد کو

عورتوں کی تعلیم شروع کریں تو اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کے گھروں کا پردہ تو غالباً اٹھ جائے گا لیکن ان میں تعلیم داخل نہیں ہوگی —

ان پردہ نشین شادی شدہ مستورات کی تعلیم کے لئے جو اپنے گھر کے کار و بار اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے مدرسہ جا کر علم حاصل کر نہیں سکتیں مسز ٹاسکر نے ایک اسکیم تجویز کی ہے جو محلوں یا خاندانوں کے اتحادی عمل پر مبنی ہے - جب یہ اسکیم مکمل صورت اختیار کرکے حیدرآباد Womens' Conference انجمن خواتین دکن کی منظوری حاصل کرے گی تو امید ہے کہ اس سے بہت خاندان استفادہ کر سکیں گے - کیا عجب ہے کہ اپنے خطبے میں محترمہ مسز رستم جی صاحبہ اس پر بھی بحث کریں گی —

تعلیم اناث کے اور کئی مسائل حل طلب ہیں - مثلاً یہ کہ آیا چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقررہ عمر تک مدارس میں ایک ساتھ تعلیم دلانا مناسب ہے یا نہیں - یا یہ کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دینا اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ اپنی مادری زبان حساب وغیرہ کی - یہ مسائل بہت دل چسپ ہیں اور ان پر خالصاً تعلیمی نقطۂ نظر سے اچھی بحث کی جاسکتی ہے - لیکن چونکہ خوش قسمتی سے محترمہ مسز رستم جی صاحبہ موضوع تعلیم نسواں پر تقریر کرنے والی ہیں لہذا میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کو اب ختم کردوں —

اب میں مختصر طور پر یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تعلیم کی اسپرٹ کیا ہونی چاہئے - مجھے یہ کہنے میں مطلقاً تامل نہیں ہے کہ وہ تعلیم جو اخلاق کی نگہداشت نہ کرے عبث اور بے سود ہے انسان میں اخلاق حمیدہ جب تک نہ پیدا ہوں وہ بہائم سے علیحدہ نہیں سمجھا جاسکتا - مختلف زمانوں اور تمدنوں میں اخلاق کی تعلیم مختلف طریقوں پر رہی ہے - لیکن ہر صورت میں اس کا کوئی نصاب نہیں رہا ہے - یہ زیادہ اساتذہ کے اخلاق اور ان کے اخلاق پر مبنی رہا ہے -

قدیم زمانے میں شاگرد استاد کو اپنے ہر کاروبار میں پیشوا اور ہادی سمجھتے تھے اور اساتذہ کو بھی اپنے شاگردوں سے ایسی محبت اور انست تھی جیسے کہ اپنی اولاد کے ساتھ - یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں تعلیم مفت دی جاتی تھی یا اساتذہ کا معاوضہ اوقاف یا اسٹیٹ کی دیگر پوشیدہ امدادوں کے ذریعہ سے کچھ ایسے غیر محسوس طریقہ پر ادا ہوتا تھا کہ تعلیم مفت میں تصور ہوتی تھی - زمانہ کی رفتار کے ساتھ اس طرز تعلیم میں بھی تبدیل کی ضرورت پیش آئی - وجودہ تنخواہ یاب اساتذہ کا کم از کم ایشیائی ممالک میں وہ احترام نہ رہا جو پرانے عہد کے اساتذہ کو نصیب تھا لوگ یہ سمجھنے لگے کہ استاد کو اگر ہماری فیس سے روپیہ نہیں ملتا ہے تو کم از کم سرکار سے تو ضرور معاوضہ ادا ہوتا ہے - پس ہم پر احسان ہی کیا - معمولی تعلیم کی حد تک تو ایسے یا ان سے مختلف خیالات کا اثر ہی کیا ہوسکتا ہے- جب اعلی تعلیم و تحقیقات عالیہ کا سوال پیدا ہوا تو اساتذہ نے یہ محسوس کیا کہ ان ابواب میں طلبہ کی رہنمائی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا معاوضہ روپیہ پیسہ سے کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا - اگر کوئی معاوضہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف شاگرد کی عقیدت فرمان برداری اور سعادت مندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے - طلبہ نے بھی اس کو تسلیم کرلیا اور جن جامعات میں آئے دن نئی نئی تحقیقات و انکشافات کی بارش برس رہی ہے وہاں استاد و شاگرد میں ویسے ہی تعلقات پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں دیکھے جاتے تھے —

کیا خوب ہوتا کہ ہر درجہ کی تعلیم میں اسی قسم کا تعلق برقرار رہتا زمانہ گزشتہ کی اس خوبی کو مکرر حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کو زیادہ ایثار سے کام لینا ہوگا اور شاگردوں کو زیادہ سعادت مندی اور اطاعت گزاری اختیار کرنی ہوگی - جو کامیاب استاد ہیں وہ اب بھی پیشۂ تعلیم کو حصول زر کی خاطر نہیں اختیار کرتے ہیں بلکہ محض علم کی محبت میں اختیار کرتے ہیں - جو جاہ طلب ہیں

وہ اس میدان میں زیادہ دن رہنے نہیں پاتے - وہ یا تو اپنا پیشہ ہی بدل دیتے ہیں یا زمانہ انہیں ایثار سکھا دیتا ہے - یہ تو اساتذہ سے متعلق واقعات ہیں - طلبہ بھی جب تک سعادتمندی نہیں اختیار کرتے انہیں عام نہیں نصیب ہوتا اور اگر نصیب بھی ہوا تو اس کے مفاد سے وہ محروم رہتے ہیں —

پس میں اساتذہ و طلبہ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ نوع انسان کے ارتقاء و فلاح و بہبود کی خاطر وہ زمانہ ماسبق کے ان مبارک اخلاق و اطوار کو اپنا نصب العین بنا لیں جس سے معلم و متعلم دونوں کی عزت افزائی ہوتی تھی اور دونوں کو بیروں از قیاس فائدہ پہنچتا تھا —

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں استاد ہیں وہ اپنے ہونہار شاگردوں کے مفاد کے لئے تمام دنیا سے بگاڑ کر لینا بھی پسند کرتے ہیں ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ شفقت استاد کی بدولت کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی یکتائے روزگار بن گئے ان کی دنیا اور عاقبت دونوں اچھے ہو گئے - پس استاد کا احترام اور اس کے ساتھ وفاشعاری شاگرد کے لئے ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے جو مذہبی حکم کو اہمیت رکھتا ہے —

معمر لوگوں کی تعلیم یا ایڈلٹ ایجوکیشن پر ایک زمانہ سے زور دیا جارہا ہے - کوئی وجہ نہیں کہ ایسے موقع الحال لوگ جو بدقسمتی سے اوائل عمر میں اچھی تعلیم نہ پاسکے عمر بھر ایسے ہی ناقص التعلیم رہیں - ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کا تمدن زیادہ تر تعلیم ہی پر قائم ہے اور تعلیم عمر اور دیگر قیود سے مستغنی ہے - معمر شخص کے لئے امتحانات کامیاب کرنا یا ڈگریاں لینا اگر ممکن نہیں تو محض علم کی خاطر تحصیل علم چنداں مشکل نہیں - انسان کی قوت ارادی فضا اور وقت دونوں پر غالب آسکتی ہے —

علم کے ایسے طلبگار کتب خانوں اور نائٹ کلاسوں اور پاپولر اکسٹنشن

اکھروں سے خاطرخواہ استفادہ کرسکتے ہیں - پس امید کی جاتی ہے کہ سرکار یا دولت مند پبلک کی طرف سے ایسے انسٹیٹیوشن زیادہ تعداد میں اور سرعت کے ساتھہ قائم ہوتے جایں گے - پبلک کتب خانوں کا اثر ملک کی خواندگی پر انتہا درجہ کی اہمیت رکھتا ہے - بڑی خوشی کی بات ہے بلدہ و مضافات میں ہمارے ملک میں بھی ایسے کتب خانے بڑی تعداد میں قائم ہونے لگے ہیں - اگر ایسے کتب خانوں کے سرپرست یا مہتمم محض اشاعت تعلیم ہی اپنا نصب العین رکھیں اور سیاسی یا سازشی آلائشوں سے ان کو پاک صاف بنائیں تو ملک علم کی تنویر سے منور ہو جائے گا اور فرقہ بندی کے جھگڑے آپ سے آپ رفع ہو جایں گے —

اشاعت تعلیم میں صاحب ثروت امرا اور دولتمند اشخاص کا اثر - اب تک ہم نے جو کچھہ کہا وہ زیادہ تر سرکاری انتظامات تعلیم ہی سے متعلق تھا - ہمارے ملک ہند میں پبلک کو ابھی سرکار کا ہاتھہ بٹانے کا خیال نہیں پیدا ہوا ہے - اگر پبلک بھی ایسے تعاونی اور رفاہ عام سے متعلق کاموں میں محض زبانی نہیں بلکہ دام و درم کے ساتھہ دلچسپی لے تو یقین کے ساتھہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں کسی دوسرے متمدن ملک سے پیچھے نہیں رہے گا - امرا اگر کارہائے تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم ان کو دلچسپی دلانے کی کوشش کریں - مجھے افسوس کے ساتھہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک حیدرآباد میں لائق اور فہم آور اساتذہ وغیرہ بہت گزرے ہیں - لیکن ان میں سے کسی نے بھی طبقۂ امراء یا صاحب ثروت حضرات پر اپنے علمی کاموں کا ایسا گہرا اثر نہیں جما یا جس سے ان بزرگ ہستیوں کو وظایف یا انعام تعلیمی کے ذریعہ سے ان اساتذہ کی یادگاریں قائم کرنے کا کچھہ بھی احساس پیدا ہوا ہو - جو یادگاریں قائم ہیں وہ زیادہ تر سرکار ہی کی رقم سے قائم ہیں - پبلک فنڈ سے اگر کوئی یادگاریں قائم ہیں تو ان کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کا ہونا نہونا

دونوں مساوی ہیں - مجھے اندیشہ ہے کہ اس قلت کی وجہ زیادہ تر خود اہل علم کا باہمی حسد یا سہل انگاری ہے - میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب ان کمزوریوں کو رفع کریں گے اور طبقہ علما کی فضیلت کو ملک سے منوا کر انہیں اس بلند رتبہ پر پہنچا دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں —

مطابع اور ان کا اثر اشاعت تعلیم پر - مطابع خواہ انگریزی ہوں یا اردو یا دیگر ملکی زبانوں کے مدارس سے بھی زیادہ علم کی اشاعت کرتے ہیں - ان کے ذریعہ ہزارہا مفید معلومات دور و دراز مقامات تک اور عام طور پر بہترین پیرایہ میں پہنچائی جاتی ہیں - مطابع کے مالک اور علمی اخبارات و رسالہ جات کے مدیر ایک طرح سے علم کے سرپرستوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں - انہیں اپنی قوت کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اس قوت کو اچھے ہی کاموں میں صرف کرتے ہیں ان کے پاس ایک نہایت ہی تیز شمشیر ہے جس سے وہ اگر چاہیں تو جہل اور دروغ کو دنیا سے نیست و نابود کردیں پس انہیں چاہئے کہ اس ہتھیار کو صرف نیک کاموں کی تائید میں استعمال کریں ذاتیات اور غلط بیانی اور غیر محققہ اطلاعوں کی اشاعت سے پرہیز کریں - ورنہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا وہ مشہور شعر ان کے حسب حال سمجھا جاسکے گا —

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نگفتم کہ دیوار مسجد بکن

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اب ایسے مدیر پیدا کرنے کی طرف مائل ہورہا ہے جو اس شعر کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے اور واقعات کے بیان اور رایوں کے اظہار میں حق شناسی اور نیک نیتی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں - میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں سیاسیات کو نظر انداز کر کے مطابع کے ان کاروبار سے بحث کررہا ہوں جو علمی رسالوں اور کتابوں کی طباعت سے متعلق

ھیں مناسب رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سے ہر گھر مدرسہ یا دارالتعلیم بن سکتا ہے اور ان کا ہر مطالعہ کرنیوالا ایک گھر یلو یونیورسٹی کا طالب علم تصور ہوسکتا ہے - افسوس ہے کہ ہماری اقتصادی کمزوری اجازت نہیں دیتی کہ ملک میں مطابع کی کافی تعداد مہیا ہوجائے - اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں انگریزی اور اس میں بھی ریاضی و سائنس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں - خدا کرے کہ طباعت کتب کے لئے حیدرآباد میں جلد مدراس بمبئی کلکتہ وغیرہ کی سی سہولتیں میسر ہو جائیں تاکہ مصنفین کو تصنیف و تالیف کی مزید ترغیب ہو اور پڑھنے والوں اور علی الخصوص طلبہ کو سستے داموں اور عمدہ چھپائی کی کتابیں مل سکیں یہاں اردو ٹائپ اور نستعلق وغیرہ کا سوال بھی خود بخود پیدا ہوجاتا ہے - چونکہ حال ہی میں نستعلیق کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوے تھے اور اس کا مسئلہ زیر سرپرستی سرکارعالی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہوا ہے اس لئے صرف اتنا بیان کر کے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار عالی نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش میں کئی ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے اور خرچ کرنے پر آمادہ ہے جس سے اس کی سرپرستی علم کا ایک مزید ثبوت ملتا ہے —

تعلیمی نمائش اور ان کے فوائد :— سابق میں ہماری تعلیمی کانفرس کے جلسوں کے ساتھ علمی نمائش کا بھی انتظام ہوتا آیا ہے - ہمیں چاہئے کہ حتی‌الامکان ایسی نمائشوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں - ان کے قیام و انتظام پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے - اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ بیان کروں کہ اگر ہرسال بلدہ کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسی نمائش منعقد کی جائیں اور دیگر ممالک کے مدارس و اساتذہ وغیرہ کو ان میں شرکت کی دعوت دی جائے تو شوق مسابقت اور باہمی ارتباط نہ صرف

تعلیم کی ایسی شیتسی یعنے استعداد کو ترقی دیکا بلکہ آپس کا اتحاد بھی بڑھا دیکا جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے ایسی نمائشوں میں سینما کے ذریعہ تاریخی و اقتصادی مطالب پر بھی بہت کچھہ روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور سائنس کے جدید ترین تحقیقات اور ان کے نتائج سے چھوٹے اور بڑے بچے اور بوڑھے سب کے سب بوقت واحد واقف کرائے جاسکتے ہیں —

اسی ضمن میں میں 'نقاشی و عکاسی' یعنے پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی تعلیم کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں - ہمارے ملک کو عمدہ پینٹروں اور فوٹو گرافروں کی بڑی ضرورت ہے - سیر و سیاحت کے ذریعہ انسان اپنے اور پرائے ملکوں کے خوشنما مناظر سے آگاہ ہوجاتا ہے اور ان کا خوشگوار اثر اُس کے جمالیاتی حواس کو تقویت بخشتا ہے اور اس کی اخلاقی زندگی کو فروغ دیتا ہے - لیکن حافظہ کب تک اور کہاں تک کام دے سکتا ہے - ان چیزوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمدہ فوٹو یا تصاویر لئے جائیں - بعض صورتوں میں فوٹو گرات کے ذریعہ اشیاء کی تفصیل خاطر خواہ نہیں ظاہر کی جاسکتی - معہذا اچھے سے اچھے فوٹو گرات زیادہ دیر پا بھی نہیں ہوتے - اس لئے پینٹنگ یا ڈرائنگ اور فوٹو انگریونگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے - ہمارے ملک میں مہذب دنیا کے ان مشہور و معروف کمالات کا شوق پیدا کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ان کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جاے - اگر ہر سال چند ہونہار طالب علم اٹلی یا دیگر مشہور ممالک یورپ کو فائین آرٹس کی تعلیم کے لئے بھیجے جائیں تو ملک کو اس سے بڑی ترغیب ہوگی - ان کمالات کے کسب سے انسان کی حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے - ذی اثر اور صاحب ثروت لوگ ممالک غیر کی خوبیوں کو دیکھہ کر اپنی بود و باش کے شہروں کو بھی خوش نما بنانے کی کوشش کرتے ہیں —

سیر و سیاحت (اکسکرشن) - شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے :—

گر بہ دکان و خانہ در گردی ہر گزا ے خام آدمی نشوی
برو اندر جہاں تفرج کن پیش ازاں روز کز جہاں بروی

کون ایسا شخص ہے جو سیر و سیاحت کے فوائد سے انکار کرتا ہے یا اس کا لطف اٹھانا نہیں چاہتا - ہر حصۂ عمر میں سیاحت مختلف طریقوں سے منفعت بخش ہوتی ہے - لیکن نو عمری اور طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ انسان کے حواس مشاہدہ قوی تر اور اس کی آئندہ زندگی کو ایک خاص شکل میں ڈھالنے کے مواقع بیشتر اور بہتر ہوتے ہیں سیر و سیاحت زیادہ تر فائدہ بخش ہوتی ہے - انگلستان کے مدارس (صاحب ثروت اور علم دوست اصحاب کی مدد سے جو کیا عجب کہ انہی مدارس کے طلبہ قدیم میں سے ہوں) طلبہ کی سیر و سیاحت کا خاص طور پر انتظام کرتے ہیں - سولہ سترہ سال کے لڑکے چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں دوران مدت تعلیم دنیا کا سفر کر کے اپنے اپنے مدرسوں کو واپس لوٹتے ہیں - بوائے اسکاوٹس کے منتظمین بھی اس قسم کے کاموں میں عہدہ داران مدارس کا ہاتھہ بٹاتے ہیں - ایسے اکسکرشن ہمہ قسم کے ہوتے ہیں اور سب کے سب دلچسپی سے مملو ہیں- ان میں کوئی پاپیادہ ملک کا سفر کرتے ہیں کوئی سائکلوں پر - اگر دور کا سفر مطلوب ہے تو ریل یا جہاز کے ذریعے سیاحی کرتے ہیں - ارباب پول کے فرزند موٹر کاروں میں بھی گھوم کر آتے ہیں - شائد چند سال کے بعد ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی طلبہ سیاحت کرسکیں - چونکہ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ اس قسم کا سفر مدرسہ کی زندگی کا ایک جزو ہے اور ڈسپلین یعنے تربیت کما حقہ ملحوظ رکھی جانی چاہئے - اس لئے دوران سفر کوئی نا خوشگوار بات وقوع میں آنے نہیں پاتی اور اگر آتی ہے تو خاطی کو پوری سزا دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے - جب نو عمر طالب علم ایسے باقاعدہ طریقے پر

دنیا کی سیر کرتا ہے اس کے مختلف ممالک پہاڑ دریا جنگل میدان شہر اور قصبے دیکھتا ہے اور متعدد اقوام کی بے شمار درس گاہوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے ہم عمر بچوں کے ساتھہ گفتگو کرتا اور کھیلتا ہے تو دنیا اس کے اندازے میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور انسان کا عز و وقار اور اس کے ساتھہ ہی خدا کی قدرت اور عظمت کا تیقن اس کے دل میں بڑہ جاتا ہے —

اگر بنی نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرانا مقصود ہے تو شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ دستیاب نہیں ہو سکتا —

کھیلوں کے متعلق جسمانی تربیت کا ذکر کرتے وقت میں کچھہ زیادہ نہ کہہ سکا - ابھی ابھی سیر و سیاحت کے بیان میں میں نے کھیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے- طلبہ کے لئے کھیل بھی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کہ درس - اس دعوے کے ثبوت میں مجھے کوئی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں - ہر کس و ناکس طلبۂ مدارس کے لئے کھیل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے - کیا خوب ہوتا کہ ہماری تمام یا کم از کم بڑے بڑے مدارس اور کالج اپنی اپنی زمین رکھتے - اکثر صورتوں میں مدرسہ کو خود اپنا مکان ہی نصیب نہیں تو زمین کہاں سے آئی - جامہ کہ ندارم دامن از کجا آرم - لیکن جب کرایہ کے مکان میں مدرسہ کھولا جاتا ہے تو کھیل کے لئے زمین بھی کرایہ پر یا اجازت سے لی جاسکتی ہے - اور اکثر صورتوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے - آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات دارالسلطنت سے دور واقع ہونے میں انہیں یہ بڑا فائدہ ہاتھہ آیا کہ ان کے پھیلنے میں موانعات کم آئے ہیں اور ان کو کھیل کود کے لئے مسطح میدان کے وسیع رقبے بآسانی مل گئے اور مل جاتے ہیں - لندن اور دوسری شہری جامعات کو یہ قدرتی مواقع نصیب نہ ہوسکے - اس پر بھی لندن کے کالج اور مدارس شہر کی آبادی سے باہر مناسب میدان کرایہ پر یا اجازت سے لے رکھتے ہیں اور شوقین طلبہ موسم بہار و گرما میں وہاں ریل وغیرہ کے ذریعہ

پہنچ کر کھیل کا لطف اُٹھاتے ہیں سررشتہ تعلیمات اگر اسی قسم کی سہولتیں اپنے علاقے کے تمام مدارس کے لئے مہیا کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف طلبہ کی صحت ہی ترقی کریگی بلکہ تعلیم کے ساتھہ تربیت بھی اچھی ہو جاے گی —

' تعلیم اور بے روزگاری :-

اکثر اصحاب تعلیم کی عمومیت کے لئے جب کوئی تحریک کی جاتی ہے تو بے روزگاری کا سوال پیش کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیم عام ہونے سے پڑھے لکھے آدمی بہت ہو جائیں گے اور ان سبھوں کو چونکہ نوکریاں نہیں مل سکتیں اس لئے ان میں بے چینی پھیل جاے گی - صحیح اعداد و شمار کے بغیر کسی بھی مسئلہ کے متعلق کوئی راے قائم کردینا مناسب نہیں - برطانوی ہند میں ضرور ایسا ہوتا آیا اور ہو رہا ہے - لیکن ابھی حیدرآباد میں تعلیم کی ایسی عمومیت نہیں ہے کہ اس قسم کا خدشہ پیدا ہو - صرف اتنا سمجھ کر خاموش بیٹھہ جانا بھی تدبر نہیں پہلے تو ہمیں چاہئے کہ ایسے طریقہ تعلیم ہی اختیار نہ کریں جن سے بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو - تعلیم عام ہو یا نہ ہو ملازمت کی تعداد تو محدود ہی رہے گی - ممکن ہے کہ تعلیم زیادہ ہونے سے نوکریوں کی تعداد بھی کچھہ زیادہ ہوجاے - لیکن یہ تو نا ممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص سرکاری یا خانگی نوکری حاصل کرسکے گا - اس کے ساتھہ ہی ہر زندہ انسان کو اپنا پیٹ پالنا اور اپنے متعلقین کی پرورش کرنا ناگزیر ہے - اس خطبہ کے ابتدائی حصوں میں میں نے جس قسم کی تعلیم کی سفارش کی ہے اگر وہ اختیار کرلی جاے تو بے روزگاری اور بے چینی کا خطرہ کم رہے گا - بہ حالت موجودہ جب کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً گریجوئٹس وغیرہ کی تعداد ہمارے ملک میں چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور ہر سال ہماری اور دیگر جامعات سے دیڑھ دو سو سے زیادہ ملکی گریجوئٹ نہیں نکلتے ہیں تو باہر کے خصوصیت کے ساتھہ لائق افراد کے تقرر کی گنجائش نکال کر بھی ہمیں

شاید کافی تعداد میں ملازمت مل سکے اگر ریاست کے تمام محکمہ جات کارخانہ جات وغیرہ کی سرکاری اور غیر سرکاری خدمتوں کو شمار میں لایا جاتا ہے - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ محض گریجویٹس کی تعداد کا خدمات کی تعداد سے مقابلہ کرنا درست نہیں- اُمیدوار کے لئے خدمت کی موزونیت کا اگر لحاظ نہ کیا جاے تو یقیناً خدمت کے لئے اُمیدوار کی موزونیت کا تو لحاظ کرنا لازمی ہے- اسی طرح سے اگر دیکھا جاے تو اب بھی جب کہ گریجویٹس کی تعداد کم ہے ملک میں کافی نوکریاں نہیں مل سکتیں - پس ضروری ہے کہ تعلیم کا طریقہ تبدیل کیا جاے - یہ مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ بہترین مشوروں کے بموجب اس مسئلہ کا بہترین حل منظور ہوگا —

میں مکرر یہ کہونگا کہ ہمیں زراعت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے ہماری تعلیم ہمیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کے زیادہ قابل بنانا چاہئے - کہیں بعض حضرات اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ اس تحریک سے میرا منشاء یہ ہے کہ ہم لوگ صرف غریب کسان بن جائیں ' نہیں میں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص زمیندار بنیں - جاگیردار اپنی جاگیروں کو آپ سنبھالیں- مقطعدار بہ نفس نفیس اپنے مقطعوں کی دیکھ بھال کریں اور پٹہ دار و انعام دار اپنی وسیع زمینات پر صحیح اور فنی معلومات کے ساتھ زراعت اور باغبانی کریں - تعلیم یافتہ شخص اگر زراعت کی طرف توجہ کرے تو وہ نوکری سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکتا ہے مجھے معلوم ہے کہ زراعت سے مرفہ الحال زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سے شرائط کی تکمیل کی ضرورت ہے - آب رسانی - اتحادی عمل تقاوی وغیرہ کا اچھا انتظام ہونا چاہئے - صبر و استقلال اور جدید تحقیقات کے نتائج سے واقفیت جب تک نہو کامیابی ممکن نہیں - لیکن جب زندہ رہنا مقصود ہے تو زندگی کے لئے جن امور کی ضرورت ہو ان کو بہم پہنچانا بھی لازمی ہے- سرکاری خدمات کے متعلق بھی مجھے یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

جس طرح سیول سروس کے لئے ملک کے بہترین امیدواروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اسی طرح دوسری گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ خدمات کے لئے بھی اچھا انتخاب کیا جانا چاہئے - سبھی خدمات کے لئے تحریری یا زبانی امتحان لینے کی ضرورت نہیں لیکن مناسب شرائط و ضوابط کے لحاظ سے امیدواروں کی قابلیت و اہلیت کا پرکھ لینا تو ضروری ہے - ذاتی تلخ تجربہ نے ہر بڑے یا چھوٹے عہدہ دار کو نہایت تکلیف دہ طریقہ سے ثابت کر کے بتادیا یا بتارہا ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی خدمت کے لئے بھی ایک خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت ہے اور اگر بر وقت تقرر یا ترقی اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے تو کام میں خرابی پیدا ہوتی ہے —

اب میں اس تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں - ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلی حضرت میر عثمان علی خاں بہادر جی - سی - یس آئی - کو علم سے بیحد دلچسپی ہے - آپ نے کروڑہا روپیہ رفاہ عام کے لئے منظور فرمایا ہے اور اس کروڑہا روپیہ میں سے کارہائے تعلیم پر معتدبہ رقمیں صرف ہوی ہیں - اور صرف ہونے کو ہیں —

میں دعا کرتا ہوں کہ اعلیحضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی ہو اور ان کی زیر سرپرستی حیدرآباد میں علم و ہنر کو ایسا ہی عروج نصیب ہو جیسا کہ بغداد و قرطبہ میں ان کے بہترین زمانہ میں نصیب ہوا تھا — آمین

سلطانہ رضیہ میدان جنگ میں

(آخری لڑائی)

از

جناب محمد جلال الدین صاحب ' اشک ' مدیر

ہاتھہ میں تیر کماں اور کمر میں تلوار　　دوش پر زلف سیہ گوش میں در شہوار
زیر راں اسپ سبکسیر و صر صر رفتار　　تمتمائے ہوئے گرمی سے وہ دونوں رخسار
آج میدان میں رضیہ کی سپہ داری ہے
کچھہ انوکھی یہ زمانے سے طرح داری ہے

گرد آلودہ جبیں ہونٹوں پہ آہ سوزاں　　اثر رنج و الم دیدۂ گریاں سے عیاں
دولت حسن پہ اپنی جو کبھی تھی نازاں　　آج میدان میں آئی ہے وہ نالاں گریاں
پیچ تقدیر کا ہے گیسوے پر پیچ اسے
کام دنیا کے نظر آتے ہیں سب ہیچ اسے

آہ بگڑی نظر آتی ہے زمانے کی ہوا　　اپنی ہی فوج کے سردار ہیں سر گرم جفا
کل وفادار تھے جو آج وہ دیتے ہیں دغا　　لٹ رہی ہے سربازار جہاں جنس وفا
ظلمت یاس کی چھائی ہیں گھٹائیں سر پر
کس غضب کی ہوئی نازل ہیں بلائیں سر پر

یاس انگیز زمانے کی ہے حالت کیسی آنکھہ جھپکاتے پلٹ جاتی ہے قسمت کیسی
سر پہ رضیہ کے ہے آئی ہوئی آفت کیسی اس کی صورت سے ہیاں آج ہے حسرت کیسی

جو وفادار تھے غدار نظر آتے ہیں
تخت شاہی کے طلبگار نظر آتے ہیں

ملوکیت کا ارتقا

(انگلستان میں)

از

جناب سید محمد مرتضیٰ صاحب متعلم ایل ایل بی

زندہ اقوام کے ہر شعبۂ حیات میں آزادی کی لہر دوڑتی ہے - ان کی طرز معاشرت ، ان کی تہذیب ، ان کا ادب ، ان کی شاعری ، ان کی سیاسیات غرض کہ وہ کونسا ادارہ ہے جو باوجود قدیم روایات میں مقید ہونے کے آزاد نہیں - انہیں قوام کے لئے یہ کہنا زیبا ہے کہ " آزادی انسان کا فطری حق ہے " - گو یہ الفاظ بہ ظاہر سیدھے سادے ہیں لیکن حقیقت و صداقت سے معمور ہیں ، اور یہ صداقت ان سیاسی سرگرمیوں میں پائی جاتی ہے جن میں انگریز قوم خود اپنے اہل وطن کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہونے کے لئے مصروف تھی - انگلستان کی دستوری تاریخ کا ہر عظیم‌الشان واقعہ ان کی آزادی کی امنگ کا مظہر ہے - اسی کی ہم سطور ذیل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ توجہہ کریں گے - اس میں شک نہیں کہ اس کی تشریح و توضیح میں ان غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو عموماً سیاسی مظاہر کا تجزیہ کرنے میں پیش آتی ہیں - یہ امر مسلمہ ہے کہ سیاسی مظاہر بہ لحاظ اپنی نوعیت کے اس قدر ملتف اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ہر ایسی کوشش بہت کم منزل مقصود تک پہونچاتی ہے ، کیونکہ بعض اوقات یہ تصفیہ کرنا

مشکل ہو جاتا ہے کہ سیاسی مظہر کا وہ جزو ترکیبی جو اس مظہر یا کل کی آفرینش میں معین ہوتا ہے کہاں کل کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے یا وہ مظہر بحیثیت کل کے اسی جزو پر محیط ہے - اسی طرح یہ مسئلہ بھی محتاج تشریح ہے کہ " تاج " یا " بادشاہ " جو حکومت انگلستان کی کل کا ایک پرزہ ہے کیا اُس کا وجود واقعی ایسی اہمیت رکھتا ہے جس کے بغیر حکومت چل نہیں سکتی ؟ اس کا پورا پورا مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ان منازل کو بیان کیا جائے جنھیں طے کرنے کے بعد " تاج " نے اپنی یہ موجودہ حیثیت اختیار کرلی ہے —

دستور انگلستان کے کسی عظیم الشان واقعہ کی جس نے ہیئت سیاسی میں تبدیلیاں پیدا کردی ہوں کوئی خاص تاریخ قطعی طور پر معین نہیں کی جاسکتی- عام مورخین کے بیان کے موافق سنہ ۱۶۸۸ ع سترھویں صدی کا ایک انقلاب انگیز سال ہے - اس سنہ میں موجودہ ملوکیت (بادشاہی) کا سنگ بنیاد رکھا گیا - یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس انقلاب کے قبل (جس کی ابتداء سنہ ۱۶۸۸ ع میں جیمس دوم کی معزولی سے ہوئی اور جس کا اختتام سنہ ۱۷۱۴ ع میں جارج اول کی تخت نشینی پر ہوا) شاہان انگلستان نے سلطنت (Reign) نہیں بلکہ فرمان روائی (govern) کی -

اینگلو سیکسنی دور میں " بادشاہ " کی ذات کل مملکتی اختیارات کا مرکز تھی بادشاہ کی شخصیت نہ صرف ایک اعلیٰ قانون ساز کی سی بلکہ وہ اعلیٰ حاکم عدلیہ و عاملہ بھی تھا - جہاں ایک طرف قوانین ایتھلبرٹ (Ethelbert) ایڈورڈ دی ایلڈر (Eaward the Elder) سے بادشاہ کی قانون سازی کا ثبوت ملتا ہے ' دوسری طرف بادشاہ کا جنگ وصلح کے معاملات کا خود طے کرنا اس کے عاملانہ اختیارات پر دلالت کرتا ہے مختصر یہ کہ اینگلوسیکسنی دور میں بادشاہ کل اختیارات کا حامل تھا - بعد ازاں بیرونی حملہ آوروں نے جو ان کے جانشیں ہوے اسی دور

کی روایات کو محفوظ رکھا —

اینگلوسیکسنی دور کے خاتمہ پر ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے جس کو ہم نارمنی فتح سے موسوم کرتے ہیں - اس دور میں بادشاہ کی وہی حیثیت بر قرار رہی جو سنین گذشتہ میں تھی - ولیم فاتح اس عہد کا سب سے پہلا اور زبردست حکم راں گذرا ہے ' جس کی طاقت و قوت کے آگے امراء عظام کو سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا - ولیم نے ملکی اصلاحات اور امراء کی پنجہ کنی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جو بہ لحاظ حالات مناسب و بہتر تھا - نظام جاگیری کی ترویج سے اس نے بڑی حد تک ان خرابیوں کا ازالہ کیا - اس اصول کے تحت بادشاہ اراضی کا اعلیٰ ترین مالک تصور ہوتا تھا ' اور ملک کی کل اراضی چند شرائط کے ساتھ امراء کو عطا کی جاتی تھی - بڑے جاگیر دار یا امراء ان اراضیات کو چھوٹے چھوٹے زمینداروں میں اسی قسم کی چند شرائط کے ساتھ تقسیم کرتے تھے ' اسی طرح یہ سلسلہ بہت دور تک جاری رہتا تھا - باوجود اس تقسیم کے ان سب کی حیثیت ایک عارضی مالک کی سی تھی اور اراضی کا اعلیٰ ترین مالک بادشاہ ہی تھا - دوسری طرف بادشاہ نے انتظام مملکت کے لئے عدالت شاہی (Curia Regis) کو قایم کیا ' جس کو قانون سازی کے ساتھ ساتھ عدالتی و مالیانہ اختیارات بھی حاصل تھے - یہ ادارہ وجود میں آنے کے باوجود بادشاہ کل شعبہ جات میں مداخلت کرتا تھا اور اس کے اختیارات میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی تھی - بعد کو زمانہ نے اپنا رنگ بدلا اور یہ حالات باقی نہ رہے ' اور بعض سیاسی تغیرات سے پارلیمنٹ عالم وجود میں آئی -

چودھویں اور پندرھویں صدی میں پارلیمنٹ کے حقوق و مطالبات میں سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی - انھیں مطالبات اور ان اختیارات کی بنا پر جس کو پارلیمنٹ نے استعمال کرنا شروع کردیا تھا سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا - لنکسٹری انقلاب در حقیقت ایک پارلیمنٹی انقلاب تھا جس نے لنکسٹری دور کے بادشاہوں

کو دستوری نظام کا پابند کردیا - ہنری چہارم کی یہ جرات نہ ہوئی کہ وہ مثل رچرڈ ثانی یا ایڈورڈ سوم حکمرانی کر سکے - سرمیریٹ (Sir Marriot) کے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ " لنکسٹریوں کا دستوری تجربہ در اصل کابینہ کا پیش خیمہ تھا جو اس واقعہ کے تین صدی بعد عالم وجود میں آئی" - اُس صدی کے مفکر جان فارٹیسکو (John Fortescue) کا بیان ہے کہ " بادشاہ انگلستان اپنی مرضی کے مطابق قانون ملک میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کرسکتا کیونکہ نوعیت حکومت محض ملوکی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے " - سنہ ۱۴۰۴ ع سے سنہ ۱۴۳۷ ع تک اراکین مجلس شاہی کی پارلیمنٹ میں نامزدگی ہوتی تھی اور اُن کا انحصار کلیتاً پارلیمنٹ پر ہوتا تھا - مجلس مقننہ کو کامل اختیارات حاصل ہو گئے تھے اور شعبۂ عاملانہ اُس کے بالکل ماتحت تھا - واقعہ یہ ہے کہ خود پارلیمنٹ امور مملکت کو سر انجام دینے میں ناکام رہی - اس مقام پر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایک اعلیٰ تجویز جو زمانۂ ما بعد میں ملک کے لئے پیام آزادی ثابت ہوئی ابتدائی دور میں بالکل نا کام رہی - اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ذمہ دارانہ حکومت کی بقا کا دار و مدار معاشرتی و سیاسی حالات پر ہے - دونوں حالات کے باہمی توافق سے ایسے نظام حکومت میں نشو و نما ہوتی ہے - انگلستان کی پندرھویں صدی میں اس تجویز کی کامیابی کی توقع رکھنا عبث اور بے فیض تھا - کیونکہ اجتماعی سیاسی حالات کا رشتۂ اتحاد منقطع ہو چکا تھا - بشپ اسٹب (Bishop Stubb) نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ " دستوری ترقی نے نظام حکومت کو درہم برہم کردیا" - معاشرتی حالات ہمیشہ سیاسی ترقی میں مزاحم ہوتے رہے - حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کی ذہنیت پختہ نہیں ہوتی یا تی تو پارلیمنٹی حکومت اس کے حق میں تباہ کن ثابت ہوتی ہے - یہی نتیجہ انگریز قوم کا ہوا - پندرھویں صدی میں جب کہ پارلیمنٹ بادشاہ سے اپنے حقوق منوانے

کے لئے سرفروشانہ جد و جہد کر رہی تھی تو دوسری طرف اہل انگلستان کے باہمی مناقشات اور خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ اُمراء نشۂ دولت و طاقت سے مست تھے۔ نظام جاگیری کی بعضی تباہ کن خامیاں ملک میں رونما ہونے لگی تھیں، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ "ہر امیر دوسرے امیر سے ہر ضلع دوسرے ضلع سے اور ہر قصبہ دوسرے قصبہ سے برسر پیکار تھا"۔ قانون و انصاف کا خون ہوگیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم ابھی اس قابل نہ تھی کہ وہ اُن آزادیوں سے متمتع ہوسکے جو اُس کو نصیب ہوئی تھیں۔ اس بد نظمی و بد امنی کے زمانہ میں ایک ایسی طاقت و قوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ترتیب و تنظیم کے ذریعہ اُن خرابیوں کو دور کرسکے —

اس زبردست قوت کو ہم ٹیوڈر ری آمریت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس دور میں عام بے چینی و بد نظمی جس نے ملک کی فضاء کو مکدر کردیا تھا دور ہوگئی۔ ایک صدی تک شاہان ٹیوڈر معاشرتی خرابیوں اور معاشی افلاس کی بیخ کنی کرنے میں ہمہ تن کوشاں رہے۔ اس اصلاح کے دوران میں قوم کا رجحان سیاسی تحریکات کی طرف سے ہٹ گیا تھا، اور اسی وجہ سے نظام پارلیمنٹ نمو نہ پا سکا، تاہم ملک کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہونچا۔ اس عہد کی برکات نے قوم میں از سر نو تازگی پیدا کردی، اُمراء کی طاقت و قوت کا خاتمہ کردیا گیا، عدل و انصاف کے لئے نئی عدالت "دیوان انجم" (Star Chamber) قایم کی گئی جس سے سرکشی کا سد باب ہوا۔ دوسری طرف ملک کی کثیر آبادی کے لئے وسائل معاش بہم پہونچائے گئے۔ تجارت کو فروغ ہوا۔ بحریہ و بریہ کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ متوسط طبقہ میں علمی ترقی و معاشی خوشحالی سے نئے نئے خیالات کی اشاعت ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم سولہویں صدی کے اختتام پر اس قابل ہوگئی کہ وہ اپنی آزادی کو مخالفین کے دست برد سے محفوظ رکھ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ٹیوڈری سلاطین کے جا نشین شاہان اسٹورٹ کو ہمیشہ اپنی رعایا سے بر سر پیکار رہنا پڑا جو حکومت خود اختیاری کی باگ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی آرزومند تھی۔ قوم کے اس سیاسی رجحان کا انکشاف اُس وقت ہوتا ہے جب پارلیمنٹ سنہ ۱۶۴۲ ع میں ایک " استدعا " بادشاہ کی روبرو پیش کرتی ہے۔ اس کا ہر لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قوم اب استبدادیت کے زیر فرمان نہیں رہنا چاہتی ہے جو شاہان ٹیوڈر کا طرۂ امتیاز تھی۔ ایسے موقع پر اُن الفاظ کو قلم بند کرنا مناسب ہوگا جو " استدعا " کا لب لباب ہیں۔ اور اہل بصیرت ان الفاظ سے اہل انگلستان کے قومی مزاج کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں .....

" جہاں پناہ کے لئے یہ امر باعث مسرت ہوگا کہ وہ کاروبار حکومت اور ملکی حالات کے متعلق عام اطلاعات دار العوام سے حاصل کریں ..... کیوں کہ زبان خلق ' ان کے اپنے ذاتی معاملات میں نقارۂ خدا ہے —

بس اس نئے دور (شاہان اسٹورٹ) کے آغاز نے ایک سیاسی پیکار کا بیج بویا۔ جیمس اول اور اُس کے فرزند نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ کسی طرح بھی اُن کے مفاد اور پارلیمنٹ کے مطالبات و حقوق میں تطابق پیدا کیا جائے۔ ان بادشاہوں نے " حقوق شاہی من جانب اللہ " کے اُصول پر بہت زور دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ قوم " عرض داشت حقوق " سنہ ۱۶۲۸ ع میں پیش کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اِس دستاویز کا پہلا سہی چارلس کی تیسری پارلیمنٹ (سنہ ۱۶۲۹ ع) کی برخواستگی اور سرجان ایلیٹ ' شہید آزادی کی وفات (سنہ ۱۶۳۲) پر ختم ہوتا ہے —

عرض داشت حقوق میں اس امر کا اظہار کیا گیا کہ قرضہ جات اور ٹیکس کا بغیر پارلیمنٹ کی رضامندی کے عائد کرنا خلاف قانون ہے۔ اس طریقہ سے پارلیمنٹ کا منشا یہ تھا کہ وہ کاروبار سلطنت کو شاہی مداخلت سے محفوظ رکھ سکے۔ لیکن گیارہ برس (سنہ ۱۶۲۹ ع تا سنہ ۱۶۴۰ ع) تک مملکت کا انتظام بغیر پارلیمنٹ کے

" مشورہ و رضامندی " کے ہوتا رہا ہے - اس دوران میں ' لاڈ ' کے خیالات کی اشاعت نے اسکاٹ لینڈ میں شورش پیدا کردی اور اس شورش کو رفع کرنے کے لئے چارلس پارلیمنٹ منعقد کرنے پر مجبور ہوا —

" طویل العہد پارلیمنٹ " (Long Parliament) کا انعقاد ہوا اور چند ماہ تک یہ پارلیمنٹ مجرمین کو سزا دینے میں مصروف رہی - اسٹرافورڈ اور لاڈ نے بھی اس سلسلہ میں کہ وہ شخصی حکومت کے موید ہیں سزا پائی - اس موقع پر پارلیمنٹ کا شعبۂ عاملانہ پر دست اندازی کرنا اس بات کی علامت تھی کہ دستور انگلستان ایک نازک دور میں قدم رکھ رہا ہے - جب پارلیمنٹ کی قانون سازی کے متعلق کوئی بحث باقی نہ رہی تو شعبۂ عاملانہ سیاسی پیکار کا آماجگاہ بن گیا - اس وقت بحث طلب پارلیمنٹ کے اختیارات تھے نہ کہ اس کا وجود - ' بیکن ' کا یہ خیال تھا کہ پارلیمنٹ کو قانون سازی ' ٹیکس عاید کرنے اور اطلاعات بہم پہونچانے کا پورا پورا اختیار ہے - ' پم ' تو اس سے بھی زائد پارلیمنٹی اختیارات کا متمنی تھا تاکہ شعبۂ عاملانہ پر پورا قبضہ اور تصرف رہے - " شکوۂ عظیم " (Grand Remonstrance) کے الفاظ سے بھی یہی منشا نکلتا ہے - ان واقعات کا سلسلہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۶۴۹ ع میں بادشاہ کی وفات سے بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا لیکن سیاسی دنیا میں ایک نیا واقعہ رونما ہوا —

کرامول (Cromwell) نے اپنی فوج ملک میں حکومت کا ڈنکا بجانے لگا سرمیریٹ (Sir Mairiot) کے یہ الفاظ کہ " بادشاہت سے نجات مل سکتی ہے لیکن بادشاہ کا سایۂ عاطفت ناگزیر ہے " بہ ظاہر تضاد سے خالی نہیں معلوم ہوتے - لیکن ان پر معنی الفاظ نے صداقت کو بے نقاب کردیا ہے - ممکن ہے کہ کسی ملک میں بادشاہ ہو لیکن رسمی یہ ضروری نہیں کہ ملوکیت کے ساتھ ساتھ استبدادیت بھی پائی جائے - بہر طور کرامول کی حکومت نے یہ بتلا دیا کہ ایک

ہستی جو بحیثیت جنرل کے کامیاب ثابت ہوی تھی بحیثیت حکمران کے نا کام رہی - نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام مملکت کے لئے " آلۂ حکومت" (Instrument of Government) کی ضرورت محسوس ہوی - ایک دیوانی طریق قانون سازی وجود میں آیا مگر پارلیمنٹ کے مطالبات پورے نہ ہوے ' اور وہ شعبۂ عاملانہ میں مداخلت کرنے سے محروم رہی اس سے قومی جذبات کو ایک اور ٹھیس لگی اور انہوں نے اپنی سیاسی معرکہ آرائیوں کو جاری رکھا - کرامول کو ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - اس نے یہ حالت دیکھکر ایک دیوانی طریق قانون سازی کو مسترد کردیا اور ایوان بالائی از سر نو وجود میں لایا گیا - کرامول نے اس موقع پر پارلیمنٹ کو بھی قانون سازی کے لئے طلب کیا - یہ جدید پارلیمنٹ نہ صرف قانون سازی بلکہ سارے دستور کی از سر نو نظر ثانی کرنا چاہتی تھی - علاوہ ازیں اس نے شعبۂ عاملانہ کے عیوب کو منظر عام پر لانا چاہا - واقعہ ہے کہ جب حکومت بزور شمشیر چلائی جاتی ہے تو ملکی اصلاح کے لئے پارلیمنٹ کا طلب کرنا اور مختلف کمیٹیوں کا انعقاد کرنا بے اثر معلوم ہوتا ہے - لیکن جس شخص نے اس حکومت کی بنیاد ڈالی تھی ' اس میں یہ طاقت و جرات بھی تھی کہ وہ اس حیثیت کو برقرار رکھے - ایسی صورت ایک کمزور حکمراں کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے - اور انھیں خطرات کا اسکے جا نشینوں کو سامنا کرنا پڑا جو ان صفات سے عاری تھا —

کرامول کا جانشین رچرڈ اس قابل نہ تھا کہ ملکی اور فوجی اقتدار میں تطابق پیدا کر کے تنظیم قائم رکھہ سکے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر گوشہ سے " امن ! امن ! " کی صدائیں بلند ہونے لگیں ' اور موروثی ملوکیت کی نئی پوجا شروع ہوئی —

ہود شاہی (Restoration) سے تاریخ دستور انگلستان میں دو سیاسی اصول مسلمہ طور پر ضروری سمجھے گئے - ایک اصول ملوکیت یا شاہی دوسرا

نظام پارلیمنٹ —

اس واقعہ کے بعد چارلس ثانی برسراقتدار ہوا لیکن بادشاہ میں صلاحیت نہ تھی کہ وہ موقع سے کماحقہ فائدہ اٹھاتا —

اب اس نوبت پر پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہےکہ کیا قوم نے اپنا مقصد حاصل کرلیا جس کے حصول کے لئے وہ دو صدیوں سے بر سر پیکار تھی ؟ نفس واقعہ یہ ہے کہ حالات بہ نسبت سابقہ زمانے کے اور بھی پیچیدہ ہوگئے ' اور سنہ ۱۶۸۸ ع کا "شاندار انقلاب" حصول آزادی کے لئے ناگزیر تھا -

یہ انقلاب تاریخ دستور انگلستان کا زبردست واقعہ ہے - اس انقلاب کی نوعیت بھی جداگانہ تھی - عموماً انقلاب کے ساتھ ساتھ میدان کشت و خون بھی نظروں میں پھرنے لگتا ہے' مگر انگریزی انقلاب کا دامن بھی خون کے دھبوں سے پاک ہے - اس موقع پر کوئی شے بادشاہت کا قلع قمع کرنے کے لئے قوم کے مزاحم نہ تھی - لیکن وہ اپنے پچھلے تجربے سے سبق حاصل کرچکی تھی' جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے' اور اس لئے مزید تجربے کے لئے آمادہ نہ تھی - اس انقلاب سے قوم کی قدامت پسندی کا پتہ چلتا ہے کہ حکومت باوجود دوسرے خاندان میں منتقل ہونے کے "تاج" کے وہی قدیم قانونی حقوق باقی رہے - پارلیمنٹ کے پھر پابندی کے ساتھ اجلاس منعقد ہونے لگے - مختصر الفاظ میں اس عہد کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہوسکتی ہیں —

۱۔شعبۂ عالمانہ کا شعبۂ مقننہ کے زیر اقتدار ہونا

۲-پارلیمنٹ کے روبرو تاج اور اس کے وزرا کی ذمہ داری

۳۔دستوری بادشاہت کا حقیقی آغاز

یم تھرس (M. Theirs) کے بیان کے مطابق " دستوری بادشاہ سلطنت کرسکتا ھے لیکن فرما روائی نہیں کرسکتا " (reign but can not govern) لیکن اس مقولے کا انطباق اس طور پر نہیں ھوسکتا جس کی ابتدا سنہ ۱۶۶۹ ع کے انقلاب سے ھوئی اور جس کا اختتام جارج اول کی تخت نشینی پر ھوتا ھے - سنہ ۱۷۸۹ ع سے سنہ ۱۷۰۲ ع تک ولیم ثالث کی حکمت عملی ملکی معاملات پر محتوی رھتی ھے اور ملکہ اینی بھی پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی تجویز کو عملی جامعہ پہنانے میں پس و پیش نہیں کرتی —

حقیقی دستوری بادشاھت کا آغاز خاندان ھینور (Hanover) کے پہلے تاجدار سے ھوتا ھے - اگرچہ شاھی حقوق میں تخفیف ھوگئی تھی لیکن یک قلم معدوم نہیں کردئے گئے تھے - ابھی قوم کا مذھبی جوش بادشاھت کے ساتھہ وابستہ تھا - صرف سیاسی فریق وھگ اور ٹوری وجود ملوکیت کی مخالفت سے باز نہ آے تھے —

جارج سوم کی تخت نشینی سے شاہ پسند جذبے کا احیا ھوتا ھے - اس بادشاہ کو سیاسی مسائل سے بےحد دلچسپی تھی ' اور اس نے سیاسی امور میں سنہ ۱۷۷۰ ع سے سنہ ۱۷۸۲ ع تک لارڈ نارتھہ (Lord North) کے عہد وزارت میں انتہائی انہماک سے کام لیا - جارج سوم انتظامی معاملات میں اپنے زمانے کا زبردست مدبر تھا ' لیکن ایک چیز اپنی قوت انتظامی کی کمی اس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مزاحم ھوتی تھی - علاوہ ازیں اس کے جنون کے دوروں نے بھی اس کو عاجز کردیا تھا جس کی وجہ سے وزرا کو ملکی معاملات میں کامل آزادی سے مداخلت کرنے کا موقع مل گیا —

تولیت (Regency) اور جارج چہارم کے عہد میں " تاج " کی یہ مقبولیت قوم کے دل میں باقی نہ رہی ' لیکن ابھی اُس کا شخصی اثر باقی تھا - جارج چہارم کا جانشین ولیم چہارم (سنہ ۱۸۳۰) ایک " ملاح اور قرش رو وخوش باش انسان تھا " اس کے عہد میں تاج کی وہ عظمت و مرتبت باقی نہیں رہی تھی - لیکن دوسری طرف سیاسی فضاء میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہورہی تھیں اور اس نازک موقع پر ملکۂ وکٹوریا نے ۱۸۳۷ ع میں اپنے سر پر تاج رکھا —

ملکۂ وکٹوریا کے لئے سب سے بڑی دو مہمات تھیں - ایک طرف بادشاہت کا برقرار رکھنا دوسری طرف متوسط طبقہ کا اعتماد حاصل کرنا جو اُس زمانہ کی سیاسی جد و جہد میں سر گرم تھے - بلکہ سیاسی امور میں ذی فہم و ذی ادراک ثابت ہونے کے باوجود اپنا مقصد جلد حاصل نہ کرسکی - واقعہ یہ ہے کہ برائیوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے کیونکہ برائی کا بیج بہت جلد نمو پاتا اور بار اور ہوتا ہے —

ملکہ نے جس کام کی بنیاد اپنی جوانی میں ڈالی تھی اُس کی تکمیل بوڑھاپے میں ہوئی - دور حکومت کے نصف زمانہ تک قوم کے دل میں ملکہ کی طرف سے کوئی محبت و التفات کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا - قومی جذبات میں اُس وقت تغیر پیدا ہوتا ہے جب قوم اپنی غلط فہمی سے جو اُس کو پرنس کانسرٹ (Prince Consort) کے متعلق تھی آگاہ ہوتی ہے - پرنس کی وفات حسرت آیات کے کچھ ہی دنوں بعد والٹر بیجہٹ (Walter Bagehot -) کی مشہور کتاب " دستور انگلستان " کی اشاعت ہوئی اُس کتاب کا وہ باب جس میں بادشاہت سے بحث کی گئی ہے اُس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے "..... انگلستان کی موجودہ حکومت بغیر ملکہ کے چل نہیں سکتی - بہت سے لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ ملکہ وقت سر میں تفریح ..... یا

پرنس آف ویلز تربی کے لئے گئے ہیں' تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ملکہ معمولی چیزوں کو بہت اہمیت دیتی ہے - اُن کا یہ خیال بالکل درست نہیں" - ان الفاظ سے ایک طرف "تاج" کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے' دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ والٹر بجہت بادشاہت کا فطرتاً معتقد تھا - "تاج" کے غیر سیاسی اختیارات کے متعلق بیجہت کی تشریح ایک حد تک مکمل ہے' بعد ازاں اس میں مزید اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہی - بیجہت کے الفاظ میں "تاج" دستور کے نمائشی جز (Dignified Element) کا محور ہے - مزید برآں وہ اپنے بیان کو اس طریقہ سے بھی واضح کرتا ہے کہ " بادشاہت ایک ایسی حکومت ہے جس میں قوم کی توجہ ایک شخص پر مرتکز ہوجاتی ہے' جس کے افعال مقاصد کے تحت ہوتے ہیں - بر خلاف اس کے جمہوریت ایک ایسی حکومت ہے جس میں قوم کی توجہ بہت سے اشخاص میں تقسیم ہوجاتی ہے جن کے افعال کا کوئی مقصد نہیں ہوتا" —

بیجہت بھی مثل دیگر شارحین کے "تاج" کے سیاسی حقوق کو واضح کرنے میں ناکام رہا - اس مسئلہ پر مزید روشنی عہد وکٹوریا کے مدبرین کی "سوانح و مکاتیب" اور خود ملکہ کے خطوط سے پڑتی ہے —

موجودہ زمانہ میں بادشاہ کی ذات سے سیاسی یا غیر سیاسی حقوق کے علاوہ چند شاہی اختیارات (Prerogatives) بھی وابستہ ہیں جن کا ذکر کرنا اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے —

Right of Dissolution. - حق برخاستگی —

بادشاہ اپنے اس حق کو انتخاب کنندگاں کے ذریعہ تسلیم کرواتا ہے' جو سیاسی مقتدر اعلیٰ ہیں اور جن کی مرضی کے آگے قانونی مقتدر اعلیٰ لاچار ہے - ڈائیسی (Diecy) کا اشارہ اسی نکتہ کی طرف ہوتا ہے جب وہ یہ لکھتا ہے کہ " جدید دستوری رواج میں یہ چیز مضمر ہے کہ ہر ایک نازک سیاسی مسئلہ کے آخری فیصلہ

کا انحصار انتخاب کنندگان پر ہے نہ کہ دارالعوام پر - یہ الفاظ دیگر قوم کی رائے اہم سیاسی مسائل میں قطعی اور آخری فیصلہ ہے " - ان اختیارات کو بادشاہ اُس وقت استعمال کرتا ہے جب وزراء بادشاہ کے افعال کے ذمہ دار ہونے سے انکار کرتے ہیں یا اُن پر قوم کا اعتماد باقی نہیں رہتا ہے مگر یہ شکل ایک انتہائی چارۂ کار ہے - بادشاہ من مانے اس حق کو استعمال نہیں کرسکتا - بادشاہ کی حیثیت کا صحیح اندازہ میریٹ (Marriot) کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے کہ " بادشاہ مثل ایک ایسے مالک کے ہے جو باوجود اپنے ملازمین کو متنبہ کرنے کے چند حالات کے تحت اُنھیں ان ہو کی شرائط پر برقرار رکھنے پر مجبور ہے " - سنہ ۱۷۸۴ ء اور سنہ ۱۸۳۴ ع کے مشہور سیاسی معرکہ آرائیوں سے یہ اُصول عالم وجود میں آیا ہے - ان دونوں موقعوں پر بادشاہ نے کابینہ کو برخاست کردیا ' کیوں کہ دارالعوام کا اُن پر اعتماد باقی نہیں رہا تھا - ہر دو صورتوں میں حق برخاستگی کے ذریعہ قوم سے مشورہ لیا گیا تھا - بادشاہ نے اپنا یہی حق سنہ ۱۹۱۳ ع میں بھی استعمال کیا جب کہ آئرلینڈ کی آزادی کا مسودۂ قانون (Irsh Home RuleBill) اور قانون پارلیمنٹ (سنہ ۱۹۱۱ ع) کے نفاذ کے سلسلہ میں مخالفین کے بحث و مباحثہ انتہا کو پہونچ گئے تھے وائی کونٹ کیو (Viscount Cave) اس موقع پر اپنی توقع کا اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ اگر وزرات اسکو یتھ (Asquith) مطالبات اُلسٹر (Ulster) کو انتخاب کنندگان کے روبرو پیش نہ کریگی تو بادشاہ سلامت پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کے انتہائی اختیارات آئندہ اجلاس کے انعقاد سے قبل استعمال کریں گے - لارڈ بیلفور (Balfour) نے حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اُن کاروائیوں پر نظر ثانی کرے جو وائی کونٹ کیو (Viscount Cave) نے روانہ کی ہیں - اس نے ان اُمور پر غور کرنے سے انکار کیا اور پارلیمنٹ برخاست کردی گئی —

استرداد حق برخواستگی - (The Refusal of Dissolution)

بعض معاملات میں بادشاہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ موجودہ کابینہ کو برخاست کرنے سے انکار کرے اس شاہی اختیار (Prerogative) کا استعمال سنہ ۱۹۲۳ ع میں کیا گیا جب کہ تینوں فریقین کو دارلعوام کی نمائندگی کے موقع پر کامل غلبۂ آرا حاصل نہیں ہوا تھا - مسٹر بالڈن نے استعفاء پیش کیا اور مسٹر میکڈانلڈ نے اس کو منظور کیا - اگر اس موقع پر پارلیمنٹ کی برخاستگی کا مطالبہ کیا جاتا تو بادشاہ اول الذکر کے مستعفی اور آخرالذکر کے منظور کرنے کے قبل اس کو قبول نہیں کرتا - باوجود ان نظری اختیارات کے اس امر کا تعین کرنا دشوار ہے کہ بادشاہ انگلستان اپنی " مشیت سیاسی " (Political Will) پر پورا پورا قابو رکھتا ہے —

مگر چند سال سے بعض اسباب کی بنا پر شاہی حقوق سیاسی میں اضافہ ہو رہا ہے- اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ پارلیمنٹ قانون سازی میں غیر معمولی طور پر مصروف ہے - دوسرے روز بروز مملکت کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہورہا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ " تاج " کے رسمی عاملانہ اختیارات وسیع ہوگئے —

موجودہ زمانہ میں تاج کا اقتدار نصف النہار پر پہنچ رہا ہے - جنگ عظیم کے بعد سیاسی تخیلات میں ایک انقلاب ہوگیا ' اور دوسری طرف دنیا کے ہرگوشہ میں کوئی نہ کوئی حصۂ ملک سلطنت برطانیہ کے زیر اقتدار ہے اور اس تمام آبادی کا جذبۂ وفاداری کا ایک " شخصیت " سے وابستہ ہے نہ کہ کسی ادارہ سے بہ الفاظ دیگر بادشاہ کی ہستی اس جذبۂ وفاداری کا مرکز اور " وحدت شاہی " (Imperial Unity) کی سب سے بڑی نشانی ہے —

جنگ کے زمانے میں بادشاہ انگلستان قوم و ملک کی روح کا محافظ تھا ۔ ساری قوم کے جذبات کا محور ایک ہی ہستی تھی ۔ وہ موقع انگلستان کے لئے بہت ہی نازک تھا جب کہ عام محور پر ملوکیت کی طرف سے بد دلی پھیل گئی تھی لیکن " وحدت قومی " کے مظہر کو کوئی صدمہ نہ پہنچا —

اس واقعہ کے بعد سنہ ۱۹۲۶ ع کی " شاہی کانفرنس" (Imperial Conference) کے انعقاد اور اس کی تجاویز نے تو شاہی اقتدار کو اور بھی بڑھادیا ۔ یہ موضوع بذات خود ایک تفصیلی بحث کا محتاج ہے ۔ مختصراً اس موقع پر یہ بتلانا ضروری ہے کہ " شاہی کانفرنس " کے بعد نوآبادیات کنیڈا نیوزی لینڈ وغیرہ نے پارلیمنٹ کو مقتدر اعلیٰ ماننے سے انکار کردیا اور پارلیمنٹ کے بجائے بادشاہ کو مملکت کی انتہائی قوت تسلیم کیا گیا ۔ گو نظری حیثیت سے بادشاہ ان تمام حقوق و اختیارات کا حامل ہے لیکن عملاً وزراء بادشاہ کے ہرفعل اور مملکت کی ہر کاروائی کے ذمہ دار ہیں ۔ دستور انگلستان کا یہ مقولہ " بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی " قابل غور ہے ۔ اس کی تشریح پروفیسر ڈائسی (Dicey) نے یوں کی ہے کہ بادشاہ کے کل افعال کی ذمہ داری خواہ صائب ہوں یا غیر صائب وزراء پر عاید ہوتی ہے ۔ اگر بادشاہ خدانخواستہ وزیرآعظم پر گولی چلائے جس سے اس کی موت وقوع میں آئے تو کوئی عدالت بادشاہ کو اس فعل کا ذمہدار نہیں قرار دے گی ۔ جب بادشاہ سلامت اس طرح ذمہداری سے بری ہوجاتے ہیں توصحیح معنوں میں ان کا ہر فعل وزراء کا فعل متصور ہوتا ہے ۔ بادشاہ کی حقیقی عظمت و مرتبت قوم کی معاشعرتی جدوجہد کے سرپرست ہونے میں مضمر ہے ۔ سیاسی میدان میں قدم قدم پر وہ کسی غیر ہستی کے ارادہ سے مجبور ہے ' اور یہ تو مدید صدیوں کے

ارتقاء کے بعد عائد ہوتی ہے - پارلیمنٹ کے مطالبات کی بنیاد پندرھویں صدی میں پڑتی اور اٹھارویں صدی کے اور اخر میں تکمیل کو پہنچتی ہے - اس سیاسی طوفان کے دوران میں کئی موجیں اٹھیں اور فنا ہو گئیں —

پندرھویں صدی کا جمہوری میلان اہل انگلستان کو کسی زبردست سیاسی تجربہ کے لئے آمادہ کرتا ہے ' اور وہ شاہی اقتدار پر قیود عائد کرنا چاہتے ہیں' جس میں انہیں ناکامی ہوتی ہے ' اور یہ واقعہ ٹیوٹری آمریت کا پیش خیمہ ہوتا ہے - ٹیوٹری امریت کے دور اس میں قوم اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ آنے والے اسٹورٹ استبدادیت کا مقابلہ کرسکے - اس استبدادیت کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے اور کرامول کی مطلقیت (Absolutism) افق سیاسی پر نمودار ہوتی ہے اور ملک کی عام فضاء کو اس قدر سکدر بنادیتی ہے کہ سنہ ۱۶۸۸ ع کے " شاندار انقلاب " سے قوم اس کی بیخ کنی کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے - اس واقعہ کے بعد حکومت ایک نئے خاندان (ہینور)میں منتقل ہوجاتی ہے جس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے - اس عہد میں شخصی ملوکیت دستوری ملوکیت میں تبدیل ہو گئی —

اس تدریجی ارتقاء سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر قوم کا ماضی اس کے مستقبل کا آئینہ ہے - زمانۂ ماضی میں جو تحریکات ملکی اصلاح کے لئے عالم وجود میں آتی ہیں باوجود ان کی ناکامی یا کامیابی کے ان کا کام رجحان ترقی کی طرف ہوتا ہے - انگلستان کی موجودہ دستوری ملوکیت میں بھی سلین ماضیہ کی استبدادیت کے چند اہم اجزاء رونما ہو رہے ہیں ' یہی وجہ ہے کہ تاج انگلستان کو شاہی وحدت کا مرکز تسلیم کیا جارہا ہے اس تغیر کو ہم احیا ماضی کہہ سکتے ہیں - مگر اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ انگریز قوم ماضی پرست ہے - صحیح معنوں

میں اس کو ماضی پسند کہا جاسکتا ہے - گو اس قوم کے جدید تخیلات کی بنیاد قدیم ہے ' لیکن اس بنیاد پر جو عمارت چنی گئی ہے وہ بالکل نئی ہے - اسی لئے تاج انگلستان رسمی طور پر شاہی وحدت کا محور اور ملکی اقتدار کا سر چشمہ ہے لیکن عملاً ان نظری اختیارات کی کوئی اہمیت نہیں ہے - اسی بنا پر انگریز قوم یہ دعوی کرسکتی ہے کہ " انفرادی آزادی افراد مملکت کا فطری حق ہے " —

کمال زندگی

(۱)

از

جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب ' باقی ' ایم - اے مدیر حصۂ انگریزی
[نواب سر نظامت جنگ بہادر انگریزی کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور ہمارے تعارف سے قطعاً مستغنی - آپ کو اس صنف سخن سے جسے سانٹ " Sonnet " کہا جاتا ہے اور جو ایک حدتک غزل سے مشابہت رکھتی ہے بڑا شغف ہے- محبی 'باقی' صاحب نے نواب صاحب کی دوسانٹس (Sonnets) کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ نواب صاحب کی نظر سے بھی گذر چکا ہے اور انہوں نے اپنے ایک خط میں جو ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کے نام لکھا گیا ہے شاعر کی کامیابی کی دل کھول کر داد دی ہے - ذیل میں ہم اس ترجمہ کو اصل سانٹس کے ساتھ شائع کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو اس کی خوبیوں کا صحیح اندازہ ہوسکے] — " مجلہ "

کمال زندگی

عشق را نازم کہ واقف نیستم از راز اُو
یاد عرش لامکانے می دہد آواز اُو

منزلے بود ست شاید او کہ دور آید نظر
یا بہ چشم نیم بازم خواب شیریں سحر

ایں قدر دانم کہ در حسنت دل بیمار من
می کند سیر تماشائے گل و گلزار من

اے مثالت لذت درد مآل زندگی
در جمالت یافتم راز کمال زندگی

می نماید چشم تو راز غم پنہان من
در نگاہت ہست شور خندۂ یزدان من

اے لب جان بخش تو تسبیح خوان حسن و عشق!
اے دل معصوم تو روح روان حسن و عشق!

بخش بادست خمیدہ در گلویم آیتے
تابہ تلخی اجل بینم فراغ لذتے

THE CROWN OF LIFE

—— : o :——

I know not what Lovee is, – a memory
Of Heaven once Known, – a yerning for some goal
That shines afar, — a dream that doth Control
The Spirit, shadowing forth what is to be.
But this I know my heart hath found in thee
The Crown of life , the glory of the soul,
The healing of all strife, the making whole
Of my imperfect being — yea of me !
For to mine eyes thine eyes through Love reveal
The smile of God; to me God;s healing breath
Comes through thy hallowed lips whose prayer is Love
Thy touch gives life ! And oh, let me but feel
Thy hovering hand my closing eyes above
Then, then, my soul will triumph over Death.

From

Sonnets

of

Nizamat Jung

——— ‡ ❋ ‡ ———

سر مستی

بر سر شاخ گلستان ، سینه چاکے بلبلے
نغمهٔ فریاد ریزد در تمنائے گلے
تا ز مستئی غم اُلفت شود چشمش فگار
سینه اش خاموش باشد صورت شمع مزار

می شود سرشار از عشقش ، ایاغ زندگی
آشیان در وصل گل چیند ز باغ زندگی
چون اجل با خوش ادائی بر سر بلبل شود
از کمال عشق بلبل همکنار گل شود

هم چنان اے نازنیں ، را بدل راهے کشا
تا شود بر سوز عشقت آه یک جانم فدا
اے دم عیسائے من جام حیات دیگرے !
اے مه کنعان من کام حیات دیگرے

قالبم شو تا طلسم جاودانے بنگریم
وز درون پردهٔ راز اجل بر تر پریم

ECSTASY

The nightingale ; upon the Rose's breast
Warbling her tale of life - long sorrow lies,
Till in loves's tranced ecstasy her eyes
Close, and her throbbing heart is set at rest;
For, to the yielding flower her bosom prest,
Death steals upon her in sweet disguise
Of Crowned Love and brings what life denies —
A mingling of the souls, — Love's eager quest!
Thus let my heart against thy heart repose ,
Sigh forth its life in one delicious sigh
Then drink new life from out thy balmy breath;
Thus in love's, languor let our eyelids close,
And let our blended souls enchanted lie,
And dream of joy beyond the gates of Death

from
sonnets
of
Nizamat Jung

نظریۂ صداقت عمل سے کیا مراد ہے

مترجمۂ ڈاکٹر مہر ولی الدین صاحب ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (لندن) بار ایٹ لا

بڑی خوشی کی بات ہے کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی ''اولڈ بائز ایسوسی ایشن'' کی جانب سے ایک مجلس قائم کی گئی ہے جس کا نام '' مجلس علمیہ '' تجویز کیا گیا ہے - اس مجلس کی جماعت عاملہ کلیہ کے ان مایۂ ناز سابق طلبہ پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بناء پر ملک میں خاصی شہرت حاصل کرلی ہے - مجلس کے مقاصد نہایت اعلیٰ اور سنجیدہ ہیں - اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں ایسی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کرے جو ادبی اور علمی لحاظ سے خاص پایہ رکھتے ہوں اور جنھوں نے زندہ اقوام کی ذہنیت کو بدلنے اور اس کو بلند کرنے میں خاص حصہ لیا ہو —

ڈاکٹر مہر ولی الدین صاحب سابق متعلم کلیہ بھی اس مجلس کے ایک سرگرم رکن ہیں - انہوں نے مجلس مذکور کے لئے چند کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں سے ایک ولیم جیمس کی مشہور کتاب Pragmatism یا نظریۂ صداقت عمل ہے - ذیل کا مضمون اسی کتاب کا ایک خاص باب ہے - اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مجلس کے پیش نظر کتنا ٹھوس اور علمی کام ہے —

ہم مجلس علمیہ کے ممنون ہیں کہ اس کی اجازت سے یہ مضمون جو اب تک غیر مطبوعہ ہے مجلہ میں شائع ہو رہا ہے —

'' مجلہ ''

کچھ سال پہلے پہاڑوں کی سیر کے لئے میں ایک جماعت کے ساتھ نکلا تھا ایک روز جب میں اپنی تلاش ختم کرکے واپس ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سب کے

سب ما بعدالطبیعاتی مباحثہ میں مصروف ہیں ' مبحوث عنہ ایک گلہری تھی زندہ گلہری جو درخت کے تنے کی ایک جانب چمٹی جارہی تھی ' اور درخت کی جانب مخالف ایک آدمی کھڑا تھا ' آدمی چاہتا تھا کہ جلدی سے درخت کے اطراف گھوم کر گلہری کو دیکھ لے ' لیکن خواہ وہ کتنی ہی پھرتی سے کام لے ' گلہری بھی تیزی سے حرکت کرتی تھی ' اور ہمیشہ درخت ہی آدمی اور گلہری کے درمیان حائل ہوتا تھا اور وہ کبھی دکھائی نہ دیتی تھی ' اس سے جو مابعدالطبیعاتی مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ یہ ہے " کیا آدمی گلہری کے اطراف گھومتا ہے یا نہیں ؟ ظاہر ہے کہ وہ درخت کے اطراف تو یقیناً گھومتا ہے ' اور گلہری درخت پر ہے ' لیکن کیا وہ گلہری کے اطراف بھی گھومتا ہے ' صحرا کی بے انتہا فرصت میں اس مسئلہ کی دھجیاں اُڑائی گئیں ' ہر ایک نے اس میں حصہ لیا تھا ' اور ہر ایک اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا ' موافقت و مخالفت میں حصہ لینے والوں کی تعداد برابر برابر تھی ' جب میں پہنچا تو ہر ایک نے مجھ سے التجا کی تاکہ اس کی جماعت کی تعداد میں اضافہ ہوجائے ' مدرسیت کے اس مقولہ کا خیال رکھتے ہوئے کہ جب تناقضات سے مقابلہ ہو تو فروق کا خیال رکھنا چاہئے ' میں نے فوراً ان کے طرف توجہ کی اور یہ فرق پایا - میں نے کہا کہ تم میں سے کسی ایک کا جماعت کا صحیح ہونا اس امر پر منحصر ہے کہ گلہری کے " اطراف گھومنے " کے عملی معنی کا تعین ہو - اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اس کے شمال سے مشرق تک جائیں ' اور پھر جنوب سے مغرب کی طرف اور پھر اس کے شمال کی طرف ' تو ظاہر ہے کہ آدمی اس کے اطراف گھومتا ہے کیوں کہ وہ متوالیاً ان جگہوں پر ہوتا ہے ' اگر اس کے برخلاف تمہاری مراد یہ ہے کہ پہلے آدمی گلہری کے سامنے ہو ' پھر اس کے سیدھے جانب ' پھر اس کے پیچھے ' پھر اس کے بائیں جانب ' اور بالآخر اس کے سامنے ' تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ اس کے اطراف نہیں گھوم سکتا ' کیوں کہ گلہری خود بھی حرکت کرتی ہے ' جس کی وجہ سے وہ اپنا پیٹ ہر

وقت آدمی کے سامنے اور پیٹ کے پیچھے کئے ہوتی ہے ' اگر یہ فرق قائم کیا جاے تو پھر مناقشہ کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی ' تم دونوں صحیح بھی ہو اور غلط بھی اس کا انحصار " اطرات گھومنے " کے عملی معنی پر ہے !

گو کہ ہو ایک گرم خو بحث کرنے والوں نے میری اس تقریر کو محض ایک حیلہ سے تعبیر کیا ' اور کہا کہ وہ معاولت سے کام لینا نہیں چاہتے اور نہ ہی مدرسیہ کی طرح بال کی کھال کھینچنا چاہتے ہیں بلکہ " اطرات " سے ان کی مراد وہی تھی جو سیدھی سادی زبان میں ہو سکتی ہے ' تاہم بہتوں نے یہ مان لیا کہ اس فرق کے قائم کرنے کی وجہ سے مناقشہ میں کمی ضرور ہو جاتی ہے ! میں اس حقیر سے قصہ کو اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ جس " نظریۂ صداقت عمل " کے طریقہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اس کی یہ ایک نہایت آسان مثال ہے ' یہ طریقہ ' مابعد الطبیعاتی مناقشات کے تصفیہ کرنے کا ایک طریقہ ہے ' اگر یہ نہوتا تو ممکن تھا کہ یہ مناقشات غیر منتہی ہوتے ' دنیا وحدت پر مشتمل ہے کہ کثرت پر ؟ یہاں جبر ہے کہ آزادی ؟ ہ دنیا مادی ہے کہ روحانی ؟ یہ وہ تعقلات ہیں جو دنیا پر صادق بھی آسکتے ہیں اور نہیں بھی ! اور ان تعقلات پر لامتناہی مناقشہ ہو سکتا ہے ان حالات میں " نظریہ صداقت عمل " کا طریقہ ہر تعقل کی توجیہہ اس کے عملی نتائج کی روشنی میں کرے گا ' اور یہ دیکھے گا کہ اگر ہم اس تعقل کو بجائے دوسرے تعقل کے صحیح سمجھیں تو علمی فرق کیا ہو سکتا ہے ' اگر کسی علمی فرق کا پتہ نہ چل سکے تو جان لینا چاہئے کہ دونوں صورتیں بالکل ایک چیز ہیں ' ان پر مباحثہ بیجا ہے ' جب کبھی مناقشہ اہم ہو تو ہمیں چاہئے کہ ہم کسی عملی فرق کو بتلا سکیں جو کسی ایک جانب کے درست ہونے سے پیدا ہوتا ہے —

اس تصویر کی تاریخ پر غور کرنے سے آپ کو اور اچھی طرح معلوم ہو جائے

کا کہ نظریۂ صداقت عمل کیا ہے ' پراگماٹزم " (جس کا ترجمہ ہم نے نظریۂ صداقت عمل کیا ہے) ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی وہی ہیں " جو عمل " یا "عملی" کے لفظ سے ظاہر ہوتے ہیں فلسفہ میں سب سے پہلے اس کو مسٹر چارلس پیرز نے سنہ ۱۸۷۸ ع میں روشناس کیا ' ایک مضمون میں جس کا عنوان " ہم اپنے تصورات کو کس طرح واضح کرسکتے ہیں " تھا اور جو پاپیولر سائنس منتھلی میں جنوری کے مہینے میں شائع ہوا تھا مسٹر پیرز نے یہ بتلانے کے بعد کہ ہمارے تیقنات ہمارے اعمال کے لئے درحقیقت قواعد کا کام دیتے ہیں ' کہا تھا کہ کسی فکر کے معانی کے تحقق کے لئے ہمیں صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے کردار کو پیدا کرنے کے قابل ہے ' یہ کردار ہمارے لئے اس فکر کا معنی واحد ہو سکتا ہے ' اور ہمارے امتیازات فکری کتنے ہی باریک کیوں نہوں واقعہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اتنا دقیق اور نازک نہیں ہوتا جو کچھہ عملی فرق نہ رکھتا ہو لہذا کسی شئے کے مختلف خیالات میں اگر کامل وضاحت پیدا کرنا ہوتا تو ہمیں صرف یہ دریافت کرنا چاہئے کہ اس شئے سے کیا عملی نتائج متبادر ہوسکتے ہیں یعنی اس سے کس قسم کے احساسات کی توقع رکھنی چاہئے ' اور کس قسم کے ردعمل کے لئے تیار ہونا چاہئے ' ان نتائج کے متعلق جو کچھہ بھی ہمارا تصور ہوگا (خواہ یہ بدھی ہو یا غیر بدھی) یہی ہمارے لئے شئے کا بھی تصور ہو گا ' بشرطیکہ اس تصور کے کوئی ایجابی معنی ہو سکتے ہوں ! یہ پیرز کا اصول ہے اور یہی نظریہ صداقت عمل کا بھی اصول ہے بیس سال تک اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا یہانتک کہ میں نے پروفیسر ہوونسن کی یونین میں جو کالیفورنیا یونیورسٹی میں واقع ہے پھر اس کو پیش کیا اور مذہب پر منطبق کیا اس وقت (سنہ ۱۸۹۸ ع میں) زمانہ اس کے قبول کرنے کے لئے تیار نظر آتا تھا ' نظریۂ صداقت عمل (پراگماٹزم) کا لفظ پھیل گیا ' اور اس وقت ہم تو فلسفیانہ رسائل کے صفحات پر اس کو جابجا پاتے ہیں ' ہر ایک کی زبان پر

ہم " نظریۂ صداقت عمل کے دور " کا ذکر سنتے ہیں ' جو کبھی عزت کے ساتھہ کیا جاتا ہے ' کبھی حقارت کے ساتھہ ' مگر شاذ ہی پوری سمجھہ کے ساتھہ ' اس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ میں وہ تمام میلانات آسانی کے ساتھہ آسکتے ہیں ' جن کے لئے کوئی اسم جمع نہ تھا ' اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ لفظ قبول کرایا گیا ہے پیرز کے اصول کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس امر کی عادت کرنی چاہئے کہ ہم اس کو مادی حالات پر منطبق کریں ' چند سال قبل میں نے دیکھا تھا کہ استٹ والد ' لپزگ کے مشہور عالم کیمیا نے اس اصول کا اپنے لکچروں میں (جو فلسفۂ حکمت پر اس نے دئیے تھے) واضح طور پر استعمال کیا ہے گو کہ اس نے اس کو اس نام سے نہیں پکارا !

اس نے مجھہ کو لکھا تھا کہ " تمام حقائق ہمارے عمل پر اثر کرتے ہیں " اور ہمارے لئے ان کے معنی سے مراد یہی اثر ہے ' میں اپنی جماعت کے طلبہ پر یہ سوال کرنے کا عادی ہو گیا ہوں کہ بجائے اس شئے کے کوئی اور شئے صحیح ہو تو دنیا میں کس حیثیت سے فرق ہو گا ؟ اور مجھے کوئی فرق نہ ملے تو پھر اس تبادل کے کوئی معنی نہیں "

یعنی مخالف نظریوں کے عملاً وہی معنی ہوتے ہیں ' اور عملی معنی کے سوا کوئی اور معنی ہمارے لئے نہیں ' آسٹ والد ایک تقریر میں جو شایع ہو چکی ہے اپنے مطلب کے تفہیم کے لئے یہ مثال دیتا ہے - علماء کیمیا میں ایک مدت تک بعض اجسام کی اندرونی ماہیت کے متعلق جنھیں ' ٹاٹومرسن ' کہتے ہیں مجادلہ ہوتا رہا - ان کی خاصیتیں اس خیال سے بھی موافق تھیں کہ ہائڈروجن کا ایک غیر ثابت جوہر ان میں ارتعاش کر رہا ہے اور اس خیال کے موافق بھی کہ یہ " اجسام کی غیر ثابت آمیزش ہیں - اس پر بحث چلتی رہی مگر کسی امر کا فیصلہ نہ ہوا - ' آسٹ والد ' کہتا ہے کہ مباحثہ کی ابتداء ہی نہ ہوئی ہوتی اگر مخاصمین نے یہ پوچھا ہوتا کہ اس نقطۂ نظر یا دوسرے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے

پر کس خاص تجربی واقعہ میں فرق پیدا ہوا ہوتا - کیونکہ معلوم ہو جاتا کہ واقعتاً کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور یہ جھگڑا اسی قدر بے بنیاد ثابت ہوتا جس قدر کہ ایام جاہلیت کا یہ نظریہ کہ خیبر اُٹھنے کے لئے جب ایک فریق نے ایک دیوتا کی مدد چاہی تھی اور دوسرے نے کسی دوسرے دیوتا کی - تو در اصل واقعہ کی اصلی علت کونسی ہو گی * ؟ "

واقعی یہ کتنی عبرت انگیز بات ہے کہ بہت سارے فلسفیانہ مناقشات اسی دم بے معنی ہوجاتے ہیں جس دم ہم ان کے عملی نتائج کے دریافت کرنے کی آسان آزمائش کا استعمال کرتے ہیں - کوئی فرق ایسا نہیں ہوسکتا جو کہیں نہ کہیں کچھہ فرق پیدا نہ کرے ' یعنی تحریدی صداقت میں کوئی ایسا فرق نہیں ہوسکتا جو اپنا اظہار کسی مادی واقعہ اور بعد میں آنے والے عمل میں جو کسی پر کبھی ' کسی جگہہ ' کسی طرح ' عائد نہ ہوا ہو ' نہ کر سکے - فلسفہ کا تمام کام اس امر کی دریافت ہونی چاہئے کہ اگر ہم دنیا کے کسی دستورالعمل کو صحیح سمجھیں تو تمہارے اور میرے لئے زندگی کے مقررہ اوقات میں کیا فرق پیدا ہوگا —

لہذا نظریۂ صداقت عمل کے طریقہ میں کوئی چیز مطلقاً نئی نہیں ' سقراط

---

* " نظریۂ عمل "

پروفیسر ڈبلیو ' ایس فرانک لن کے خطبہ میں میں آسمت والد سے زیادہ گہرا " نظریۂ صداقت عمل " پاتا ہوں " میرے خیال میں طبیعات کا کمزور تصور جو ایک طالب علم اختیار کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ " طبیعات کمیت " مکسرات اور ایتھر کا علم ہے " اور میرے خیال میں توانا سے توانا تصور اگر طالب علم اس کو اختیار نہ بھی کرے - یہ ہے کہ طبیعات اجسام پر متصرف ہونے اور ان پر عمل کرنے کا علم ہے (رسالہ سائنس ' جنوری ۱۹۰۳ء ' سنہ ۱۹۰۳ ع) —

اس کا ماہر تھا ' ارسطو نے اس کو ایک طریقہ کے ساتھہ استعمال کیا تھا - ' لاک ' ہارکلے ' اور ہیوم نے اس کے ذریعہ صداقت کی عظیم‌الشان مدد کی ' شیاۃ ورت ' ' ہاجسن ' ہمیشہ اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ حقائق وہی ہیں " جیسے کہ وہ ہمیں معلوم ہوتے ہیں " مگر نظریۂ صداقت عمل کے پیشروؤں نے اس کو جزیتاً استعمال کیا ' انہوں نے اس کا صرف اقتتام کیا - ہمارے ہی وقتوں میں آکر یہ اس قدر عام ہوا ہے ' اپنی خدمت کلیہ کا احساس کیا ہے ' دعوی کیا ہے کہ اس کی قسمت اوج پر ہے مجھے اس کی فاتحانہ قسمت پر یقین ہے اور مجھے امید ہے کہ میں آپ میں بھی اس یقین کی ضیا پیدا کر سکوں گا —

نظریۂ صداقت عمل فلسفہ کے ایک نہایت مانوس طریقہ کو ظاہر کرتا ہے اور وہ تجریبی طریقہ ہے لیکن میرے خیال میں یہ اس طریقہ کو ایسی صورت میں پیش کرتا ہے جو زیادہ بنیادی بھی ہوتا ہے اور کم قابل اعتراض بھی - اس نظریہ کا قائل اُن بہت ساری سخت عادتوں کی طرف سے جرأت کے ساتھہ اپنا منہ موڑ لیتا ہے جو پیشہ ور فلسفیوں کے لئے بہت عزیز ہوتی ہیں - وہ تجرید کو ' قلت کو ' لفظی حل ' خراب اولی استدلات اور جامد اصول کو ' سر بستہ نظامات کو ' اور ملتبس کلیات و ماخذ کو بالکل ترک کر دیتا ہے ' وہ مغروریت اور کثافت واقعات ' افعال اور قوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' اور یہی تجریبی طبیعت کا خلیہ ہے اور اسی کے معنی " عقلیتی " طبیعت کو خلوص کے ساتھہ ترک کرنا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم فطرت کی کشادہ فضا اور اس کے ممکنات میں سانس لے رہے ہیں کہ ادعا ' تصنع اور صداقت کے آخری لفظ کہنے کا دعوی کر رہے ہیں !

اور یہ ساتھہ ساتھہ کسی خاص نتیجہ کا ذمہ دار بھی نہیں - یہ محض ایک طریقہ ہے مگر اس طریقہ کی عام کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ اُس شئے میں جس کو کہ میں نے گذشتہ تقریر میں فلسفہ کی " طبیعت " سے تعبیر کیا ہے ' ایک زبردست

انقلاب پیدا ہوسکتا ہے - اب عقلیت مفرطہ کے معاملین اسی طرح غارت ہو جائیں گے ' جس طرح کہ جمہوریت میں دور باری مزاج کے لوگ ' اور ہردلستانت ملک میں وہ پادری جو ریاست پوپ کے متعلق عقائد مفرطہ کو اپنی دماغ میں جگہ دیتے ہیں ' حکمت (سائنس) اور ما بعد الطبیعیات ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جائیں گے ' بلکہ ساتھ ساتھ کام کرنے لگیں گے —

عام طور پر ما بعد الطبیعیات کی جستجو نہایت ہی ابتدائی طریقہ کی رہی ہے ' آپ جانتے ہیں کہ انسان غیر قانونی سحر کا کس طرح جو یا رہا ہے ' اور ساحری میں ' الفاظ ' نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے ' اگر آپ کے یاں کسی کا نام ہو یا سحر کا وہ جملہ ہو جو اس کو باندھ سکتا ہے تو آپ اس کی روح ' جن ' یا عفریت کو یا جو بھی قوت ہو اس کو اپنے تسلط میں لاسکتے ہیں ' چنانچہ سلیمان کو تمام اجنہ کے نام معلوم تھے ' اور نام معلوم ہونے کی وجہ ہی سے وہ ان کو اپنے قبضہ میں رکھتے تھے - اسی طرح نظری ذہن کے لئے کائنات ایک قسم کا معمہ تھی - جس کی کنجی بعض قوت بخش یا درخشاں نام یا لفظ تھے ' یہ لفظ کائنات کے اصول کو بتلاتے تھے اور ان کا حاصل کرنا گویا خود کائنات کا حاصل کرنا تھا - " خدا " " مادہ " " عقل " " ذات مطلقہ " " توانائی " یہ تمام اسی قسم کے حل کرنے والے نام ہیں - اگر یہ آپ کو مل جائیں تو پھر آپ آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں ' گویا آپ اپنی ما بعد الطبیعیاتی تلاش کی انتہا پر پہنچ گئے —

لیکن اگر آپ نظریہ صداقت عمل کے طریقہ پر چلیں تو پھر یہ الفاظ آپ کی تلاش کو ختم نہیں کرسکیں گے - ہر لفظ کی آپ کو نقد قیمت دریافت کرنی ہو گی اور اس کو اپنے تجربہ کے دائرہ میں کام پر لگانا ہو گا - یہ طریقہ کسی چیز کا حل نہیں بلکہ یہ ایک لائحہ عمل ہے - اور بالخصوص یہ ان راستوں کو بتلاتا ہے جن میں حقائق موجودہ بدلے جاسکتے ہیں —

اس طرح نظریے معمون کے محض اوزار قرار دئے جا سکتے ہیں نہ کہ یہ ان کے جواب ہوں جہاں پہنچ کر ہم آرام کرسکیں - ہم ان پر اتکا نہیں کرتے ہم آگے کی طرف بڑھتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی مدد سے فطرت کو پور مشکل کرتے ہیں نظریۂ صداقت عمل ہمارے تمام نظریات کو ڈھیلا کردیتا ہے ' یہ ان کو ملائم کرتا ہے اور پھر کام پر لگاتا ہے - چونکہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے - لہذا یہ بہت سارے قدیم فلسفیانہ میلانات میں توافق پیدا کرتا ہے - مثلاً وہ اسمیت سے اس امر میں مشابہ ہے کہ وہ ہمیشہ جزئیات کی طرف رجوع کرتا ہے - افادیت سے اس امر میں کہ وہ عملی حیثیت پر زور دیتا ہے ' ایجابیت سے اس امر میں کہ وہ لفظی حل ' بے سود مسائل اور مابعد الطبیعاتی تجریدات پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے —

ظاہر ہے کہ یہ تمام میلانات دافع عقلیت ہیں - اگر عقلیت خود کو بطور ایک دعوی یا طریقے کے پیش کرے تو نظریہ صداقت عمل اس کی مخالفت کے لئے پوری طرح تیار و مستعد ہے لیکن کم از کم ابتدا میں اس سے کوئی خاص نتائج مفہوم نہیں ہوتے اس کے نہ کوئی عقائد ہیں نہ قواعد ہاں مگر ایک طریقہ تو ضرور ہے - چنانچہ اس کو نوجوان ایطالیائی مامی پاپی نی نے خوب کہا ہے کہ یہ نظریوں کے وسط میں اسی طرح واقع ہوا ہے جس طرح کہ کسی ہوٹل کا رواق ہوتا ہے جس سے بے انتہا کمرے ملحق ہوتے ہیں - کسی میں ایک شخص تم کو ملے گا جو الحاد پر ایک کتاب لکھ رہا ہو - دوسرے میں کسی کو دیکھو گے جو اپنے زانو ٹیکے ایمان وقوۃ کے لئے دست بدعا ہے - تیسرے میں ایک عالم کیمیا کسی جسم کے خواص کے اکتشاف میں مصروف نظر آے گا - چوتھے میں تصوری مابعد الطبیعات کے ایک نظام کا اختراع ہورہا ہے - پانچویں میں مابعد الطبیعات کے عدم امکان کو بتلایا جارہا ہے - لیکن رواق سب کی ملکیت ہے - اور سب ہی اس سے ہو گزریں گے اگر انہیں ان کمروں میں آسانی سے جانے اور باہر نکلنے کی کوئی راہ مطلوب ہو —

تو ظاہر ہے کہ نظریہ صداقت عمل کے طریقہ سے سوائے کوئی خاص نتائج نہیں بلکہ یہ محض توضیح کی ایک صورت ہے یعنی اس سے سوائے اولیات، اُصول، معقولات، اور فرضی ضروریات کا ترک کرنا اور عواقب، نتائج، ثمرات اور واقعات کی طرف متوجہ ہونا ہے —

نظریہ صداقت عمل کے طریقہ کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے - آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں بجائے اس کی توجیہ کرنے کے تعریف کر رہا تھا - لیکن یہ بتلاتے ہوئے کہ یہ بعض مانوس مسائل کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے ابھی میں اس کی پوری توجیہ کئے دیتا ہوں اسی اثناء میں یہ لفظ ایک وسیع معنی میں استعمال ہو رہا ہے اور کسی حد تک اس سے صداقت کے ایک نظریہ سے سوائے لی جا رہی ہے-میرا خیال ہے کہ میں اول راستہ تیار کرنے کے بعد اس نظریہ کی توضیح میں پوری ایک تقریر صرف کروں لہذا میں یہاں اختصار سے کام لے سکتا ہوں لیکن اختصار کا سمجھنا کسی قدر مشکل ہوتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے اس کو زیادہ توجہ سے سنیں - اگر اکثر چیزیں غیر واضح رہ جائیں تو مجھے اُمید ہے کہ بعد میں آنے والی تقاریر میں میں ان کی توضیح کرسکوں گا —

ہمارے زمانے میں فلسفہ کے جس شعبہ نے کامیابی کیساتھ ترقی دی گئی ہے وہ منطق استقرائی ہے - یہ ان حالات کا مطالعہ ہے جن کے زیر اثر ہمارے علوم کا ارتقاء ہوا ہے - اس مضمون کے مصنفین نے یہ بتلانا شروع کیا ہے کہ ان کے ہاں آپس میں فطرت کے قوانین اور واقعہ کے عناصر کے معانی کے متعلق (جنہیں جب علماء ریاضیات، طبیعات اور کیمیا نے مشکل کیا ہے کس قدر اتفاق ہے - جو ریاضیات منطق اور فطرت کی پہلی یکسانیتیں (قوانین اولیہ) دریافت کی گئیں، اور ان سے جو بھی وضاحت، حسن یا سادگی پیدا ہوئی تو اس نے انسان پر اتنا اثر کیا کہ اس کو یقین ہوگیا کہ اس کو قادر مطلق کے ابدی افکار کا وثوق کے ساتھ علم ہوگیا ہے - انسان نے خیال کیا کہ

خدا کا ذہن بھی قیاس ہی کے ذریعہ جولانی دکھلاتا ہے وہ بھی مخروطات، مربع اور جذر اور نسبت جیسے حدود میں فکر کرتا ہے اور اقلیدس کی طرح بن گیا ہے - اس نے سیارات کے لئے کپلر کے قوانین بنائے - گرنے والے اجسام کی رفتار میں وقت کی مذا سبت سے زیادتی پیدا کی روشنی کے لئے جیب کے قوانین بنائے تاکہ انعطاف کے وقت اسکو اختیار کرے - حیوانات اور پودوں کی جماعتیں، درجے اور ان کے انواع و اجناس مقرر کئے اور ان کے درمیانی فاصلوں کو قرار دیا - اس نے تمام چیزوں کی اصل کو سونپا اور ان کے تنوعات کو ترتیب بخشی - اور جب ہم اس کے ان تعجب خیز نظامات میں سے کسی ایک کو دریافت کرلیتے ہیں تو ہمیں اس کا ذہن اور اس کا اصلی ارادہ معلوم ہوجاتا ہے —

لیکن جوں جوں علوم میں ترقی ہوتی گئی ہے یہ خیال قوی ہوتا چلا ہے کہ ہمارے اکثر بلکہ تمام قوانین محض تخمینے ہیں خود قوانین اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ ان کی تعداد کا کوئی شمار نہیں رہا - اور حکمت کے ہر شعبہ میں اس قدر مخالف نظریات پیش کئے گئے کہ محققین اس خیال کے عادی ہوگئے ہیں کہ کوئی نظریہ حقیقت کی صحیح نقل نہیں بلکہ ان میں سے کوئی ایک کسی نہ کسی نقطہ نظر سے فائدہ مند ہوسکتا ہے ان کا سب سے بڑا فائدہ قدیم واقعات کی تلخیص کرنا اور نئے واقعات کی طرف رہبری کرنا ہے - وہ محض انسان کی بنائی ہوئی زبان ہیں، یا جیسا کہ بعض نے کہا ہے، تعقلات کا خط اشارہ، ہیں جس میں ہم فطرت کی رپوٹ لکھتے ہیں - اور ہر ایک جانتا ہے کہ زبانوں میں بہت سی عبارتیں ہوسکتی ہیں اور بہت سے لغات —

اس طرح انسانی اختیار نے خدائی ضرورت کو حکمی منطق سے باہر نکالا - اگر میں سکوارٹ، ماغ، آسٹ والد، پیرسن، مل تھوت، پائنکارے، دیوہیم، رائی سان، کے صرف نام لوں، تو آپ میں سے جو طالب علم ہیں آسانی کے ساتھ سمجھ جائیں گے

کہ میری مراد کس میلان سے ہے اور آپ کو اسی قسم کے مزید نام یاد آجائیں گے —

اس حکمی منطق کے بحر کے شناور شلر اور ڈیوڈے نے بھی صداقت کی وہی توجیہ کی ہے جو انہیں ہر جگہ ملتی ہے ان معلمین کا قول ہے کہ ہمارے تصورات و تیقنات کی صداقت سے وہی مراد ہے جو سائنس (حکمت) میں اس سے لی جاتی ہے اس کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تصورات (جو خود ہمارے تجربہ کے حصے ہیں) اس وقت صحیح ہوتے ہیں جب کے وہ ہم کو اپنے تجربہ کے دوسرے حصوں سے تعلق پیدا کرنے میں خاطر خواہ مدد دیں - اور نیز ان کی تلخیص میں بھی معین ہوں' اور ان تک تعقلات کے مختصر راستہ سے (نہ کہ جزئی طور پر کے لامنتہی سلسلہ کے ذریعہ) پہنچنے میں معاونت کریں جس تصور پر گویا ہم سوار ہو سکیں اور جو ہمیں تجربہ کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک طمانیت کے ساتھہ پہنچائے اور اشیا کو ایک دوسرے سے خوش خواہ طور پر ملائے' جو حفاظت کے ساتھہ کام کرے' ہماری محنت میں کمی کرے یا اس سے بچائے وہ تصور اسی حد تک صحیح ہوگا یعنی بالوسیلہ صحیح ہوتا' یہ صداقت کا " آلاتی " نظریہ ہے' جو چیکاگو میں نہایت کامیابی کے ساتھہ سکھایا جارہا ہے ' اس نظریہ کی رو سے ہمارے تصورات کی صداقت سے مراد اس کے " عمل کی قوۃ ہے اور یہ آکسفورڈ میں نہایت آب و تاب کے ساتھہ مشتہر کیا جارہا ہے —

" ڈیوڈے " اور شلر اور ان کے احباب نے ' صداقت کے اس عام تصور تک پہنچنے کے لئے علما ارضیات ' حیاتیات ' لسانیات کی مثال کا تتبع کیا ہے - ان علوم کی تاسیس کے لئے کامیاب طریقہ یہ تھا کہ بعض سادہ اعمال کو لیا جائے جو دوران عمل میں مشاہدہ کے قابل ہوتے ہیں (مثلاً موسمی اثرات کی وجہ سے چٹانوں کی تحریت ' یا جنس انواع سے تبدل ' یا لغت کا نئے الفاظ و تلفظات کے اضافہ کی وجہ سے تغیر) اور پھر ان کی تعمیم کی جائے اور تمام زمانوں پر ان کو منطبق

کیا جائے ' اور قرنہائے قرن تک ان کے اثرات جمع ہونے کی وجہ سے عظیم‌الشان نتائج پیدا کئے جائیں —

جس قابل مشاہدہ عمل کو " شار " اور دیودے نے تعمیم کے لئے منتخب کیا ہے یہ وہی مانوس عمل ہے جس کے ذریعہ ایک فرد نئی رائے اختیار کرتا ہے یہ عمل ہمیشہ یکساں ہوا کرتا ہے فرد کے ہاں پرانی رائوں کا ذخیرہ ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کو ایک ایسے نئے تجربہ سے سابقہ پڑتا ہے جو ان میں خلل پیدا کردیتا ہے مثلاً کوئی شخص ان کی مخالفت کرتا ہے ' یا غور کرنے سے اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپس میں متناقض ہیں ' یا وہ ایسے واقعات کے متعلق سنتا ہے جو ان کے موافق نہیں ہوتے ' یا اس کے جی میں ایسی خواہشات پیدا ہوتی ہیں جن کو یہ متشفی نہیں کرسکتے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے قلب میں ایک تنازع پیدا ہوتا ہے جس سے وہ پہلے واقف نہ تھا ' اور وہ اپنی گذشتہ رائوں کے مجموعہ میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا کرکے اس تکلیف سے بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ ان میں سے جتنوں کو بچاسکتا ہے بچا لیتا ہے کیونکہ یقین کے معاملہ میں ہم سب حد سے زیادہ قدامت پسند ہیں اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ پہلے اس رائے کو بدلے پھر اس کو (کیونکہ یہ تغیر کا مختلف طور پر مقابلہ کرتے ہیں ') یہانتک کہ ایک نیا تصور اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے جس کو وہ اپنے پرانے خیالات کے ذخیرہ میں زیادہ اختلال پیدا کئے بغیر اضافہ کرلیتا ہے یہ تصور قدیم ذخیرہ اور نئے تجربہ کے درمیان ایک واسطہ کا کام دیتا ہے - اور ان دو میں مناسبت اور امن کے ساتھ ایک رشتہ قایم کردیتا ہے —

اب یہ تصور صحیح سمجھ کر مان لیا جاتا ہے یہ صداقتوں کے قدیم ذخیرہ کو ادنیٰ تبدل کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے ' ان کو صرف اسی حد تک بدلتا ہے کہ جس حد تک کہ اس جدید شے کو قبول کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے ' مگر جہانتک ممکن

ہو اس تبدل کو بھی مانوس طریقوں سے سمجھا جاتا ہے - ایک مبالغہ آمیز توجیہ جو تمام تصورات سابقہ میں خلل پیدا کرتی ہو کسی جدید شے کا صحیح بیان ہرگز نہیں سمجھی جاسکتی - ہمیں جفاکشی کے ساتھ کسی ایک چیز کی تلاش کرنی پڑے گی جو اتنی بے قاعدہ نہ ہو - کسی فرد کے تیقنات میں اگر بہت زبردست انقلاب پیدا کیا جائے تو اس کے پرانے نظام میں سے بہت کم پر اثر ہوگا - زماں و مکاں علت و معلول فطرت و تاریخ اور اپنی سوانح عمری ویسی ہی رہے گی - نئی صداقت ہمیشہ ایک واسطہ ہوتی ہے جو انقلاب میں نرمی پیدا کرتی ہے وہ قدیم رائے اور جدید واقعہ میں ایک رشتہ جوڑتی ہے جس میں فصل تو کم سے کم اور تسلسل زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے - ہم کسی نظریہ کو اسی مناسبت کے ساتھ صحیح سمجھتے ہیں جس مناسبت کے ساتھ یہ اس کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کے مسئلہ " کو حل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے - مگر اس مسئلہ کے حل میں کامیاب ہونا زیادہ تر ایک تخمینہ کی بات ہے ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ اس دوسرے نظریہ کی بہ نسبت بہ حیثیت کلی زیادہ اطمینان کے ساتھ اس کو حل کرتا ہے - مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہمارے زیادہ اطمینان کے لئے اور ظاہر ہے کہ مختلف افراد اپنے اطمینان پر مختلف طور پر زور دیں گے لہذا ایک حد تک ہر چیز یہاں ملائم ہے —

خصوصاً جس چیز پر میں آپ کو غور کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں وہ پرانی صداقتوں کا طرز عمل ہے اس کا خیال نہ رکھنے ہی سے وہ بیجا تنقیدیں پیدا ہوی ہیں جس کا نشانہ نظریہ صداقت عمل رہا ہے - ان قدیم صداقتوں کا اثر بالکل تنقیدانہ ہے ان کی اطاعت اصول اولیں ہے ' بلکہ اکثر حالت میں اصول واحد ہے - جو مظاہر کہ اپنی جدت کی وجہ سے ہمارے تصورات سابقہ کی ترتیب میں اہم فرق پیدا کریں ان کے استعمال کرنے کا سب سے معمولی طریقہ یہ ہے کہ انہیں بالکل نظر انداز کردیں ' یا ان کی شہادت دینے والوں کو گالیاں سنائی جائیں —

آپ بلا شبہ صداقت کی اس نشو و نما کے عمل کی مثالیں چاہتے ہوں گے اور مجھے جو چیز تکلیف دہ دکھائی دیتی ہے وہ محض ان مثالوں کا ضرورت سے زیادہ ہونا ہے - نئے صداقت کی سادہ ترین مثال نئے قسم کے واقعات کا ' یا پرانے قسم کے نئے واقعات کا ہمارے تجربہ میں عددی اضافہ ہے ' یعنی ایسا اضافہ جو ہمارے پرانے تیقنات میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کرتا ایک دن کے بعد دوسرا دن گزرتا ہے اور اس کے مضمون میں محض اضافہ ہوتا جاتا ہے - یہ نیا مضمون خود صحیح نہیں ہوتا - وہ صرف ظاہر ہوتا ہے اور پایا جاتا ہے - صداقت تو وہ ہے جو ہم اس کے متعلق کہتے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہوا ہے تو صداقت کی محض اس سادہ اضافی جملہ سے تسکین ہو جاتی ہے —

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کسی دن کے حاصل کردہ مضمون میں نئی ترتیب پیدا کرنی پڑتی ہے اگر اب میں یہاں کھڑا ہوا دل شگاف چیخیں مارنا شروع کروں اور دیوانہ کی طرح حرکتیں کرنے لگوں تو آپ میں سے بہت سارے اس امر پر مجبور ہوجائیں گے کہ میرے فلسفہ کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے جو خیالات ہیں انپر بھی غور کریں حال میں " ریڈیم " ان کے حاصل کردہ مضمون کے ایک حصہ کی طرح نمودار ہوا ' اور تھوڑی دیر کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترتیب فطرت کے متعلق ہمارے جو کچھہ تصورات ہیں وہ تمام اس کے مقتاقض ہیں اس ترتیب کو ہم بقائے توانائی کہنے لگے تھے - ریڈیم کا اپنے جیب سے غیر متعین طور پر حرارت کا خرچ کرنا اس بقائے توانائی کے خلاف معلوم ہوتا تھا - اب اس کے متعلق کیا خیال کیا جائے ؟ اگر یہ اشعاع حرارت غیر منطقوں توانائی بالقوہ کا بچ کر نکلنا سمجھا جائے جو جواہر میں قبل ہی سے موجود تھی تو قانون بقائے توانائی بچا لیا جاسکتا ہے - جب " ہی لیم " دریافت کیا گیا جو اس اشعاع کا نتیجہ ہے تو اس یقین کو پناہ لینے کے لئے جگہ ملی چنانچہ " رامزے " کا نظریہ عام طور

پر صحیح مانا جاتا ھے کیونکہ گو یہ ھمارے توانائی کے پرانے تصورات میں وسعت پیدا کرتا ھے تاھم ان کی نوعیت میں بہت کم ترمیم و تبدیل کا باعث ھے —

مجھے زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ایک نئی رائے اسی تناسب کے ساتھہ " صحیح " کہلائی جائے گی جس تناسب سے کہ وہ فرد کی اس خواھش کو تسکین بخشے جس کی وجہ سے وہ اپنے تیقنات کے ذخیرہ میں نئے تجربہ کو داخل کرنا چاھتا ھے - اس کو چاھئے کہ پرانی صداقت پر بھی اتکا کرے اور نئے واقعہ پر بھی گرفت رکھے ' اور اس امر میں اس کی کامیابی (جیسا کہ میں نے ابھی کہا ھے) فرد کی قدردانی پر منحصر ھے - پس جب قدیم صداقت نئی صداقت کے اضافہ سے نشوونما پاتی ھے تو اس کے وجوہ ذھنی ھوتے ھیں ھم میں یہ عمل جاری ھوتا ھے اور ھم ان وجوہ پر چلتے ھیں وہ نیا تصور سب سے زیادہ صحیح کہلائے گا جو ھماری اس دوگونہ ضرورت کی تشفی کے لئے اپنے وظیفہ کو نہایت امن کے ساتھہ پورا کرے اپنے طریق عمل کی بنا پر وہ اپنے کو صحیح ثابت کرتا ھے ' صحیح کہلاتا ھے ' گویا کہ یہ صداقت کے پرانے جسم پر پلتا ھے اور اسی طرح نشوونما پاتا ھے جسطرح کہ ایک درخت ' کیا سی یم ' کے ایک نئے طبقہ کی فعلیت کی وجہ سے نشوونما پاتا ھے —

" اب ڈیوڈے " اور " شلر " اس مشاھدہ کی تعمیم کر کے صداقت کے قدیم ترین حصوں پر اس کو منطبق کرنا چاھتے ھیں - یہ بھی کسی زمانہ میں ملائم تھے - ان کو بھی انسانی وجوہ کی بناء پر صحیح کہا جاتا تھا - یہ بھی زیادہ قدیم تر صداقتوں اور ان مشاھدات کے درمیان جو اس زمانہ میں جدید سمجھے جاتے تھے واسطہ کا کام دیا کرتے تھے محض خارجی صداقت ' جس کی تاسیس میں تجربہ کے قدیم حصوں کو نئے حصوں سے مربوط کرنے اور اس طرح انسانی تشفی پیدا کرنے کے عمل کا کوئی حصہ نہ ھو ' کہیں نہیں ملتی ' جس وجہ سے ھم اشیا کو صحیح

کہتے ہیں اسی وجہ سے وہ صحیح بھی ہیں ۔ " کیونکہ صحیح ہونے کے معنی اسی " عمل ارتباط " کا پورا کرنا ہے —

اسی طرح ہمیں مار انسانی کے نشان یا ہر چیز پر ملتے ہیں۔ صداقت مطلقہ ' یا وہ صداقت جس کو ہم محض پاتے ہیں ' اور جو احتیاج انسانی کا ساتھہ نہیں دیتی ' یا ایک لفظ میں یوں کہو ' لاعلاج صداقت ' پائی تو کثرت سے جاتی ہے یا یہ کہ عقلیہ سمجھتے ہیں کہ اس کا وجود ہے' لیکن اس صداقت کی مثال بالکل ایک زندہ درخت کے مردہ دل کی سی ہے اور اس کے وجود کے معنی یہ ہیں کہ صداقت کا بھی اپنا علم الاحافیر ' ہوتا ہے اور یہ " حق تصرف " بھی رکھتا ہے ' کئی سال کی تجربہ کار ملازمت کے بعد سست اور انسان کی نظروں میں محض قدامت کی وجہ سے ذلیل ہو جاتا ہے - لیکن تاہم ہمارے زمانہ میں منطقی اور ریاضیاتی تصورات کے تحویل کی بناء پر (اور یہ تحویل تو طبیعات کے دائرہ پر بھی حملہ آور معلوم ہوتی ہے) یہ نہایت وضاحت کے ساتھہ بتلا دیا گیا ہے کہ قدیم سے قدیم صداقتیں بھی کس قدر ملائم ہو سکتی ہیں - قدیم قوانین وسیع تر اصول کے خاص اظہارات سمجھے جا رہے ہیں ' جن کو ہمارے آبا و اجداد نے موجودہ شکل و صورت میں کبھی نہ دیکھا ہو گا —

مسٹر شلر اس نظریۂ صداقت کو اب تک انسیت ہی کے نام سے پکارتے ہیں مگر اس کے لئے نظریۂ صداقت عمل (پراگماٹزم) کا لفظ زیادہ عروج پر ہے ' اس لئے میں ان تقاریر میں اس کو اسی نام سے پکاروں گا —

اب نظریۂ صداقت عمل کا دائرہ بحث یہ ہوگا اولاً ایک طریقہ ' ثانیاً ایک تکوینی نظریہ کہ صداقت کے کیا معنی ہیں - یہ دو چیزیں ہماری آئندہ موضوع بحث ہوں گی —

جو کچھہ کہ میں نے نظریۂ صداقت عمل کے متعلق کہا ہے ' مجھے یقین ہے

کہ وہ آپ میں سے بہتوں کو اختصار کی وجہ سے مبہم اور ناکافی معلوم ہوا ہو گا مگر بعد میں چل کر میں اس کو تلافی کردوں گا - " فہم عام " پر جو آگے چل کر میں تقریر کروں گا اس میں یہ بتلانے کی کوشش کروں گا کہ صداقت کے قدامت کی وجہ سے متحجر ہو جانے سے میری مراد کیا ہے ایک دوسری تقریر میں میں اس خیال کی توجیہ کردوں گا کہ ہمارے تصورات اسی تناسب سے صحیح کہلاتے ہیں جس تناسب سے کہ وہ اپنے ارتباط و واسطہ کے عمل کو کامیابی کے ساتھہ پورا کرتے ہیں - تیسری تقریر میں میں یہ دکھلاوں گا کہ صداقت کی تکمیل میں ذہنی و خارجی اجزاء کے درمیان امتیاز کرنا کس قدر دشوار ہے - ممکن ہے کہ آپ مجھے ان تقاریر میں پوری طرح نہ سمجھہ سکیں ' اور اگر سمجھہ بھی لیں تو ممکن ہے کہ میرے ساتھہ پورا پورا اتفاق نہ کریں - مگر میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کم از کم اپنے بیان میں سنجیدہ تو سمجھیں گے اور میری کوشش کو نظر احترام سے دیکھیں گے -

لیکن یہ آپ کو معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ دیودے اور شلر کے ان نظریوں کو حقارت اور مضحکہ کے ایک طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا ہے - تمام عقلیت اس کے خلاف اٹھہ کھڑی ہوئی - ذی اثر حلقوں میں مسٹر شلر کو خصوصاً ایک ایسا گستاخ طفل مکتب سمجھا گیا جس کی سرزنش ضروری ہے - مجھےاس کا ذکر نہ کرنا چاہئے - لیکن یہ عقلیہ کی اس طبیعت پر روشنی ڈالتا ہے جس کے خلاف میں نے نظریۂ صداقت عمل کی طبیعت کو رکھا ہے - یہ نظریہ اگر واقعات سے دور ہو تو اضطراب محسوس کرتا ہے - عقلیت صرف تجرید ہو کی موجودگی میں سکون پاتی ہے - جب نظریہ صداقت عمل کے حامی صداقتوں کا ذکر جمع میں کرتے ہیں اور جب ان کی افادیت اور کفایت اور ان کے عمل کی کامیابی کا بیان کیا جاتا ہے تو یہ عقلیہ کی سی ذہنیت والوں کو ایک درشت دون اور اتنگ سی صداقت نظر آتی ہے - ان کے نزدیک اس قسم کی صداقتیں اعلیٰ صداقت نہیں - یہ معیار محض

ذهنی ہے - اسکے برخلاف خارجی صداقت ایسی ہونی چاہئے جو غیرافادی ہو متکبر ہو ، لطیف ہو ، دور دراز ہو ، جلیل اور عالی شان ہو ، یہ ہمارے فکر کی کامل حقیقت کیساتھہ کامل مطابقت کا نام ہے - یہ ایسی چیز ہونی چاہئے جسکی ہم بھوں شرح فکر کرسکیں - جن مشروط طریقوں پر ہم دراصل فکر کرتے ہیں وہ غیر متعلقہ ہیں اور نفسیات کے دائرہ میں داخل ہیں - لیکن ان سوالات میں نفسیات کو ترک کرنا چاہئے اور منطق کو قبول کرنا چاہئے —

ذہنیتوں کے اس نفیس تقابل پر غور کیجئے ! نظریۂ صداقت عمل کا حامی واقعات اور مقرونیت سے چمٹتا ہے ، جزئی واقعات میں صداقت کے عمل کو مشاہدہ کرتا ہے اورہر تعمیم سے کام لیتا ہے - اس کے لئے صداقت ان تمام مخصوص عملی قیمتوں کا ایک اسم جنسی ہے جو ہمارے تجربہ میں پائی جاتی ہیں - عقلیہ کے لئے یہ محض ایک تجریدہ ہے جس کے ہر نام کی ہمیں اطاعت کرنی چاہئے - جب نظریۂ صداقت عمل کا قائل شرح وبسط کے ساتھہ اس امر کے بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیں کیوں اطاعت کرنی چاہئے - عقلیہ ان مقرون اشیاء کو پہچاننے کے بھی ناقابل ہوتے ہیں جن سے انہوں نے اپنے مجردات حاصل کئے ہیں وہ ہم پر تہمت دھرتے ہیں کہ ہم صداقت کا انکار کرتے ہیں ، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم نے محض دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لوگ کیوں اس کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں کیوں اس کی پیروی کرنی چاہئے - آپ کا اصلی مفرط تجرد پسند مقرونیت سے کانپتا ہے ، اگر دوسرے حالات برابر ہوں تو وہ زرد خیالی شئے کو اس پر یقیناً ترجیح دیگا اگر اس کے سامنے یہ دونوں کائنات پیش کئے جائیں تو وہ بہ نسبت حقیقت کے گھنے جنگل کے ہمیشہ ایک نحیف نقشہ ہی کو بخوشی اختیار کرے گا یہ اس کے لئے بہت زیادہ پاک و صاف اور بہتر ہے ! —

مجھے امید ہے کہ جوں جوں ان تقریروں میں ہم آگے بڑھتے جاویں گے - نظریۂ

صداقت عمل کی مقروفیت اور اس کا واقعات سے قرب ظاہر ہوتا جائے گا اور ممکن ہے کہ آپ کو اس کی بھی تشفی بخش خاصیت پسند آئے یہ نظریہ محض اپنے دوسرے ساتھی علوم کے مثال کا تتبع کرتا ہے اور غیر مشہود کی مشہود سے توجیہ کرتا ہے - یہ ذہن و حقیقت کے باہمی تطابق * والے سکوئی رشتہ کے تصور کو جو بالکل نہیں ہوتا ہے ہمارے جزئی افکار اور دوسرے تجربوں کی عظیم الشان کائنات کے باہمی کامیاب اور ذی اثر مخالطت + میں تحویل کردیتا ہے جہاں یہ اپنا کام کرتے ہیں اور فائدوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے جو کچھ کہ میں نے کہا ہے اس کے ثبوت کو آئندہ پر اٹھا رکھتا ہوں - میں چاہتا ہوں کہ اس وقت اپنے اس دعوے کی مزید توجیہ کروں جو میں نے گزشتہ دفعہ پیش کیا تھا کہ نظریہ صداقت عمل تجربی طریق فکر اور انسان کے مذہبی مطالبات میں ایک خوشگوار وفاق پیدا کرسکتا ہے —

آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ جن آدمیوں کے طبائع شدت کے ساتھ واقعات پسند ہیں وہ ایسے فلسفہ سے دورہی رہتے ہیں جو واقعات سے ہمدردی نہیں رکھتا اور موجودہ زمانہ کی تصوریت کا یہی طرز ہے یہ ضرورت سے زیادہ عقلیت پسند ہے قدیم طرز کی ذہنیت ' جس کا یہ خیال تھا کہ خدا ایک عالی شان شہنشاہ ہے اور جس کے غیر قابل فہم یا محال سے " صفات " ہیں ' کافی خراب نہیں تھی' لیکن جس حد تک یہ " غایت " والے استدلال پر قوت کے ساتھ یقین رکھتی تھی اس کو مادی حقائق سے کسی قدر مس ضرور تھا - لیکن جب سے کہ " داؤنیت " نے سائنٹفک (حکیمانہ) ذہنوں سے غائت کو ہمیشہ کے لئے دور کردیا ہے دینیت کا قبضہ اٹھ گیا ' اور جو چیز کہ ہمارے معاصرین کے تخیل کو ان

---

* اس کے معنی کے متعلق ہم آگے چلکر دریافت کریں گے -

+ جس کا ہرشخص پوری طرح تتبع کرسکتا اور سمجھ سکتا ہے -

دنوں بھلی لگتی ہے ۔ وہ ایک قسم کا خدا ہے جو اشیاء میں ساری ہے ' ان میں داخل ہے اور ان کے اوپر نہیں پایا جاتا - ہم میں سے جنہیں ایک فلسفیانہ مذہب مطلوب ہے وہ اکثروں زیادہ امید کے ساتھ تصوری وجودیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہ کہ قدیم ثنوی دینیت کی طرف حالانکہ ثانی الذکر کے قابل حامی اس وقت تک موجود ہیں —

لیکن جیسا کہ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا ہے جس قسم کی ''وجودیت'' اس زمانہ میں ملتی ہے ' یہ وہ لوگ مشکل سے قبول کرتے ہیں جو واقعات کے پرستار ہوتے ہیں یا تجربی ذہنیت رکھتے ہیں - یہ مطلقیت کی وہ قسم ہے جو گرد سے پاک ہوتی ہے اور اپنی بنیاد خالص منطق پر قائم کرتی ہے - یہ مقرونیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی - چونکہ اس کے نزدیک ذہن مطلق ' جو اس کے لئے خدا کا بدل ہے ' واقعہ کے تمام جزئیات کا عقلی مفروض سابق ہوتا ہے - خواہ یہ کچھ ہوں - وہ ہماری دنیا کے تمام جزئی واقعات سے بالکل بے نیاز رہتا ہے - یہ واقعات جو کچھ بھی ہوں ذات مطلق ان کا رب ہے - یاد ہوگا کہ ' ای ساپ ' کے فسانہ میں ایک بیمار شیر کا ذکر ہے جس کے غار کے طرف تمام نشان پارہ نمائی کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی واپس ہوتا نظر نہیں آتا —

اسی طرح آپ ذات مطلق کی مدد سے ان جزئیات والی دنیا میں نہیں لوٹ کر آ سکتے نہ ہی اس کی ماہیت کے تصور سے اپنی زندگی کے متعلق کسی اہم نتائج کا ' (جو شرح و بسط کے لحاظ سے ضروری ہوں) استنتاج کرسکتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ وہ آپ کو یہ یقین دلاتے ہے کہ اس کی ذات اور اس کے ابدی طریق فکر کے متعلق سب کچھ غیرت سے ہے ' مگر وہ آپ کو یہاں پر لا کر چھوڑ دیتی ہے کہ اپنی دنیوی تدابیر سے اپنے محدود نجات کی فکر کر لیں —

مجھے اس تصور کے احتشام کا یا اس کی قابلیت کا جس کی رو سے وہ ایک

نہایت قابل احترام جماعت کے ذہن کو ذہنی تسکین پہنچاتا ہے ہرگز انکار نہیں لیکن انسانی نقطہ نظر سے کوئی یہ کہنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس میں بُعد و تجرید کے نقائص نہیں پائے جاتے یہ بدرجۂ اولیٰ اس چیز کی پرستار ہے جس کو میں نے طبیعت عقلیہ' کہنے کی جرأت کی ہے - وہ تجربیت کے احتیاجات کی تحقیر کرتی ہے وہ حقیقی دنیا کی دولت کے بجائے ایک تہی خاکہ کو پیش کرتی ہے' وہ ستھری ہے' پاک ہے مگر خراب معنی کے لحاظ سے یعنی جس معنی میں کہ پاک ہونا حقیر خدمات کی بجا آوری کے نا قابل ہوتا ہے - میری رائے میں اگر اس گرد و غبار والی دنیا میں اشیاء کے متعلق کوئی نظریہ "پاک" ہو تو یہ اس کی صداقت کے خلاف گمان پیدا کرنا چاہئے اور اس کی فلسفیانہ نا اہلیت کی دلیل ہونی چاہئے ممکن ہے کہ "ظلمت کا شہزادہ" ایک شریف زادہ ہو' اور ہم نے سنا ہے کہ وہ ہے بھی شریف' مگر اس زمین و آسمان کا خدا جو بھی ہو وہ یقیناً شریف زادہ نہیں ہوسکتا - فلک الافلاک پر جس قدر اس کے جاہ و جلال کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ ہمیں اپنے انسانی مصائب کی گرد و خاشاک میں اس کے ادنیٰ خدمات کی ضرورت پڑتی ہے -

اب گو نظریۂ صداقت عمل کو واقعات سے اس قدر شغف ہے - لیکن تجربیت کی طرح اس میں مادی میلان نہیں پایا جاتا - علاوہ ازیں اس کو تجریدات کے تحقق پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ آپ ان کی مدد سے جزئیات میں چل پھر سکیں اور وہ آپ کو در اصل کہیں لے جائیں چونکہ یہ سوائے ان نتائج کے کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں رکھتا جن کو کہ ہمارے ذہن اور تجربے نے نکالا ہو اس لئے اس کو ضروری طور پر دینیات سے بد ظنی نہیں اگر دینی تصورات مادی دنیا کے لئے کوئی قیمت رکھتے ہیں تو وہ نظریۂ صداقت عمل کے لئے اسی حد تک صحیح ہوں گے اور رہا یہ امر کہ کس حد تک وہ اور زیادہ صحیح ہیں سو اس

کا انحصار دوسری صداقتوں کے تعلقات پر ہے - جن کا تسلیم کرنا بھی ہمارے لئے ضروری ہے —

جو کچھ کہ ابھی میں نے ذات مطلق ' اور ماورائی تصورئیت کے متعلق کہا ہے اسی کو لیجیے اولاً میں اس کو " محتشم " کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ ایک خاص جماعت کے ذہن کو مذہبی تسکین پہنچاتی ہے ' پھر میں نے اس کے بعید و غیر مثمر ہونے کی شکایت کی لیکن جہاں تک اس سے اس قسم کی تسکین حاصل ہوتی ہے وہ یقیناً غیر مثمر نہیں ' اس میں اس قدر قیمت موجود ہے ' وہ ایک مادی عمل بھلائی ہے ' لہذا بحیثیت نظریۂ صداقت عمل کے ایک ایمانداز حامی کے مجھے " ذات مطلق " کو اس ایک حد تک ' صحیح سمجھنا چاہئے اور میں بلا پس و پیش اس طرح سمجھتا ہوں —

لیکن اس حالت میں " اسی ایک حد تک " کے کیا معنی ہیں ؟ اس کے جواب کے لئے ہمیں صرف نظریۂ صداقت عمل کے طریقے کو استعمال کرنا چاہئے جب ذات مطلق کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس یقین سے تسکین ملتی ہے تو اس سے ان کی کیا مراد ہوتی ہے ؟ ان کی مراد یہ ہے کہ چونکہ ذات مطلق میں محدود شرکا کا قلع قمع ہو جاتا ہے لہذا ہم جب چاہیں اس فانی نظام کو بلقوی ازلی سمجھ سکتے ہیں - اور اس کا ہمیں یقین ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے نتیجے پر بھروسہ کر سکتے ہیں اور بغیر کسی گناہ کے ارتکاب کے اس محدود ذمہ داری کے خوف کو دور اور اضطراب کو دفع کرسکتے ہیں مختصر یہ کہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ " اخلاقی تعطیل " منائیں دنیا کو اپنی راہ پر چھوڑیں کیونکہ اس کے نتائج و عواقب ہم سے بہتر ہاتھوں میں ہیں جن میں ہمارا کوئی دخل نہیں —

کائنات ایک ایسا نظام ہے جس کے متعلق انفرادی ارکان اپنی تشویش میں کمی کرسکتے ہیں جس میں انسان کے لئے - ' لاابالی ' کا جذبہ بھی جائز ہوسکتا ہے

'' اخلاقی تعطیلات '' بھی روا ہو سکتے ہیں اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو میری رائے میں یہ وہ کام ہے جو ذات مطلق جیسی کہ '' وہ ہمیں معلوم ہے '' بجالاتی ہے یہ وہ عظیم الشان فرق ہے جو اس کے صحیح ہونے سے ہمارے جزئی تجربات میں وقوع پذیر ہوتا ہے ' یہ ہے اس کی نقد قیمت جب ہم اس کی نظریۂ صداقت عمل کے مطابق توجیہ کرتے ہیں اس سے زیادہ وہ شخص جو فلسفے میں معمولی طور پر دلچسپی لیتا ہے اور '' تصوریت مطلق '' کے موافق خیال رکھتا ہے اپنے تصورات میں تیزی پیدا کرنے کی جرأت نہیں کرتا وہ ذات مطلق سے صرف اسی قدر کام لیتا ہے اور یہ بھی نہایت قیمتی ہے اور جب آپ ذات مطلق کے متعلق بد اعتقادی سے باتیں کرتے ہیں تو اس کو صدمہ ہوتا ہے - اور وہ آپ کے تنقیدات کی پروا نہیں کرتا کیونکہ یہ ایسے تعقل سے بحث کرتے ہیں جن کو سمجھنے سے یہ قاصر ہے اگر ذات مطلق کے صرف اسی قدر معنی ہیں اور اس سے زیادہ نہیں تو اس کی صداقت کا کون شخص انکار کر سکتا ہے ؟ اس کے انکار کے یہ معنی ہیں - کہ ہمیں کبھی استراحت ہی نہ کرنی چاہئے ' اور نہ تعطیل ہی لینی چاہئے —

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ میں سے بعض کو مجھے یہ کہتا سنکر تعجب سا ہوتا ہوگا کہ جس حد تک ہم کسی تصور کو اپنی زندگی کے لئے فائدہ بخش سمجھیں اس حد تک وہ صحیح بھی ہے - مگر یہ آپ بخوشی مان لیں گے کہ جہاں تک وہ فائدہ بخش ہے - خیر ہے اچھا ہے - مگر اس کی مدد سے ہم کوئی اچھا کام کریں تو اس تصور کو آپ اسی حد تک اچھا ضرور کہیں گے کیونکہ اس کی وجہ سے ہم زیادہ نفع میں ہیں لیکن آپ پوچھیں گے کہ کیا اسی وجہ کی بناء پر تصورات کو صحیح بھی کہنا الفاظ کا ایک تعجب انگیز غلط استعمال نہیں —

میری تقریر کے اس منزل میں اس مشکل کا جواب دینا ناممکن ہے - صداقت کا جو میں نے اور '' شلر '' اور ڈیوڈے نے نظریہ پیش کیا ہے اس وقت اس کے نقطۂ

مرکزی پر آپ نے حملہ کیا ہے اور میں اس پر اپنی چھٹی تقریر تک بحث نہیں کرسکتا میں یہاں پر صرف اتنا کہوں گا کہ صداقت خیر کی ایک نوع ہے اور جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے خیر سے علحدہ کوئی جنس نہیں - صداقت ہر اس شے کا نام جو یقینی طور پر اپنے کو خیر ثابت کرے اور خیر بھی بعض خاص قابل بیان و قابل تعین وجوہ کی بناء پر یقیناً آپ اس کو مان جائیں گے کہ اگر تصورات صادقہ سے زندگی کے لئے کوئی بھلائی میسر نہیں ہوتی ' یا ان کا علم قطعاً غیر مفید ہوتا اور تصورات کاذبہ ہی صرف مفید ہوتے تو یہ موجودہ خیال کہ صداقت ایک گراں بہا اور افضل شئے ہے جس کی طلب ہمارا فریضہ ہے ہر گز پیدا نہ ہوا ہوتا اور نہ ایک عقیدہ دینیہ بن جاتا - اس قسم کی دنیا میں ہمارا فریضہ صداقت سے اعراض کرنا ہوتا - لیکن اس دنیا میں جس طرح کہ بعض غذائیں نہ صرف ہمارے ذائقہ کے لئے خوشگوار ہوتی ہیں ' بلکہ دانتوں ' پیٹ اور اعصاب کے لئے بھی ' اسی طرح بعض تصورات نہ صرف فکر یا ان دوسرے تصورات کی تائید کرنے میں خوشگوار ہوتے ہیں جنھیں یہ چاہتے ہیں بلکہ یہ ہماری زندگی کے عملی جدوجہد میں ممد و معاون ہوتے ہیں- اگر کوئی ایسی زندگی ہو جس کا بسر کرنا حقیقتاً اچھا ہو ' اور اگر کوئی ایسا تصور بھی ہو جس پر یقین کرنے سے ہمیں اس قسم کی زندگی بسر کرنے میں مدد ملتی ہے - تو ہمارے لئے واقعی اچھا ہوگا کہ ہم اس تصور پر یقین لائیں بشرطیکہ یہ یقین دوسرے اہم فوائد سے اتفاقاً متعارض نہ ہوتا ہو —

جس پر یقین کرنا ہمارے لئے بہتر ہو '' یہ خود صداقت کی تعریف سے معلوم ہوتی ہے - یہ تقریباً اس قول کے مساوی ہے کہ " جس پر ہمیں یقین کرنا

چاهئے۔ اور اس تعریف میں کوئی غرابت نہیں کیا ہمیں ایسی چیز پر یقین نہ کرنا چاهئے جس پر یقین کرنا ہمارے لئے بہتر ہے ؟ اور کیا ہم ان دو خیالات کو کہ کیا چیز ہمارے لئے بہتر ہے اور کیا چیز ہمارے لئے صحیح ہے ہمیشہ کے لئے جدا رکھہ سکتے ہیں —

نظریۂ صداقت عمل کہتا ہے کہ نہیں اور مجھے اس سے پورا اتفاق ہے اور جہاں تک کہ مجرد بیان کا تعلق ہے کہ شاید آپ بھی میرے ساتھہ اتفاق کریں گے لیکن آپ کے دل میں یہ شبہ ہوگا کہ اگر ہم ہر چیز پر جو ہماری ذاتی زندگی کے لئے اچھی ہو عملی طور پر یقین کرلیں تو ہمیں اس دنیا کے معاملات کے متعلق ہر قسم کے اوہام ' اور حیات آیندہ کے متعلق ہر طرح کے خیالی وسوسوں میں مبتلا ہونا ہوگا ۔ آپ کا یہاں پر یہ شبہ در حقیقت وجہ رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم تجرید سے نکل کر مادی شے کی طرف رخ کرتے ہیں تو کوئی ایسی شے ضرور رقوم پذیر ہوتی ہے جو صورت حال کو پیچیدہ کردیتی ہے —

میں نے ابھی کہا ہے کہ جس شئے پر تعین کرنا ہمارے لئے بہتر ہے وہ صحیح ہے بشرطیکہ یہ یقین دوسرے اہم فوائد سے اتفاقاً متعارض نہ ہوتا ہو اب حقیقی زندگی میں کن اہم فوائد سے ہمارا کوئی خاص یقین بہت زیادہ متعارض ہوسکتا ہے ؟ یہ سوائے ان اہم فوائد کے اور کیا ہوسکتے ہیں جو دوسرے تیقنات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ اول کے اذعانات کے مغائر ثابت ہوتے ہیں بالفاظ دیگر ہماری کسی ایک صداقت کے سب سے زبردست عدو ہماری دوسری باقی صداقتیں ہیں صداقتوں میں ہمیشہ کے لئے تحفظ ذات کی یہ بے باک جبلت پائی جاتی ہے ۔ جو بھی ان کی مخالفت کرتا ہے اس کو فنا کرنے کی زبردست خواہش ان میں

موجود ہوتی ہے جس بھلائی کی بناء پر ذات مطلق پر میرا یقین ہے اس کو میرے دوسرے تیقنات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے - مانا کہ یہ اس وجہ سے صحیح ہے کہ مجھے " اخلاقی تعطیل " ملتی ہے تاہم میرے خیال میں (اور یہ میں راز میں کہہ رہا ہوں گویا کہ اپنی ذات کی حد تک (یہ میری اُن دوسری صداقتوں سے متعارض ہوتا ہے جن کے فوائد سے میں کسی طرح دست بردار ہونا پسند نہیں کرتا وہ ایسی منطق سے وابستہ ہے جس کا کہ میں دشمن ہوں ' میں دیکھتا ہوں ' کہ وہ مجھے ایسے ما بعد الطبیعاتی تناقضات و محالات میں پھنساتا ہے کہ مجھے ہرگز منظور نہیں لیکن چونکہ مجھے زندگی میں کافی مصیبتیں ہیں اور میں کسی طرح ان عقلی تناقضات کی مصیبت میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا اس لئے میں اپنی حد تک اس ذات مطلق کو چھوڑ دیتا ہوں میں اخلاقی تعطیل یوں ہی مناتا ہوں ' یا بحیثیت ایک پیشہ ور فلسفی کے دوسرے اصول کی بناء پر ان کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں —

اگر میں اپنے ذات مطلق والے خیال کو صرف اس کی تعطیل دینے والی قیمت تک محدود کر رکھوں تو یہ میری دوسرے صداقتوں سے متعارض نہ ہوگا لیکن ہم اپنے مفروضات کی اتنی آسانی کے ساتھ تحدید نہیں کر سکتے ان کی فوق العدد حیثیتیں ہوتی ہیں اور ان ہی سے تعارض پیدا ہوتا ہے میرے ذات مطلق کے یقین نہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ میں ان فوق العدد حیثیتوں میں یقین نہیں رکھتا کیونکہ میں اخلاقی تعطیل کے جواز کا پورا یقین رکھتا ہوں —

آپ نے اس بیان سے معلوم کیا ہوگا کہ میری مراد یہ کہنے سے کیا تھی کہ نظریۂ صداقت عمل ایک واسطہ ہے ' صلح کن شے ہے ' اور ' پاپی فی ' کے

الفاظ میں وہ ہمارے نظریات کو " ڈھیلا " کرتا ہے اس کو کسی قسم کا تعصب نہیں - نہ ہی اس کے کوئی معارض عقائد ہوتے ہیں نہ کوئی سخت اصول جن کو ہم ثبوت خیال کر سکیں - یہ نہایت طبعی سی چیز ہے وہ ہر ایک مفروضہ کو سنتا اور شہادت پر غور کرتا ہے - اس بیان سے لازم آتا ہے کہ اس کو مذہبی دائرہ میں ایجابی تجربیت پر جس کا رجحان مذہب کے خلاف ہے - اور نیز مذہبی عقلیت پر جس کی کامل ہمہ‌ردی محض اس شئے کے ساتھہ ہے جو تصور کے لحاظ سے بعید ' پاک سادہ اور مجرد ہو خاصہ تفوق حاصل ہے —

مختصر یہ کہ وہ خدا کی طلب کے دائرہ کو وسیع کرتا ہے - عقلیت کا انحصار محض منطق اور فلک الافلاک پر ہے تجربیت خارجی حواس پر انحصار رکھتی ہے - نظریہ صداقت عمل ایک شئے کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے - منطق ہو یا حواس اور یہ حقیر سے حقیر اور نہایت ذاتی تجربوں کو شمار کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے - اگر صوفیانہ تجربات سے عملی نتائج متبادر ہوتے ہیں تو وہ ان کو بھی محسوس کرے گا - وہ اپنے خدا کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہے - جس کی جگہ نجاست بھرے واقعات ہوں بشرطیکہ یہ جگہ اس کے ملنے کے قابل معلوم ہو —

اس کے نزدیک احتمالی صداقت کی ایک ہی آزمائش ہے - یعنی جو ہماری رہبری کا کام بہترین طور پر بجالائے ' جو زندگی کے تمام حصوں کے بالکل موافق ہو اور جو انہیں کل تجربہ کے احتیاجات سے متحد کرے اور کسی چیز کو نظر انداز نہ کرے - اگر دینیاتی تصورات یہ کام کریں اور خصوصاً خدا کا تصور یہ کرسکے تو پھر نظریۂ صداقت عمل خدا کے وجود کا کس طرح انکار کرسکتا ہے ؟ ایک ایسے تصور کو جو اس نظریہ کی بنا پر اس قدر کامیاب ہوسکتا ہے یہ خود کس طرح غیر صحیح سمجھہ سکتا ہے ؟ اس کے نزدیک مادی حقیقت کے ساتھہ

اس تطابق کے علاوہ کسی اور قسم کی صداقت ہوسکتی ہے —

میں اپنی آخری تقریر میں پھر اس نظریہ اور مذہب کے درمیانی تعلق پر بحث کرونگا مگر آپ نے دیکھہ لیا ہوگا کہ یہ کس قدر جمہوریت پسند ہے۔ اس کے اخلاق اتنے ہی لچکدار اور مختلف الفروع ، اس کے منابیع اتنے ہی وسیع اور لا انتہا ، اور اس کے نتائج اتنے ہی موافق ہیں جتنے کہ خود مادر فطرت کے !

دل کی دنیا

از

جناب میر حسن الدین صاحب بی - اے ' ایل - ایل - بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ

شاعر کے دل کا کاشانہ ہے ساقی عشق کا میخانہ
اک عالم سوز وگداز ہے یہ اک نغمۂ بے آواز ہے یہ
یاں کاہش سودوزیاں ہی نہیں یاں قید زمان و مکاں ہی نہیں
یاں آغاز و انجام نہیں یاں شام و سحر کا نام نہیں
یاں آہوں میں ہے موسیقی سامان طرب لذت غم کی
یاں شمع تاثر کی ہے ضیا گُل عقل و حکمت کا ہے دیا
یہ حسن و عشق کی وادی ہے وجدان کو یاں آزادی ہے
ہے جرم محبت حسن عمل اور دل کا سکوں پیغام اجل
جو نغمہ تری آواز میں ہے وہ دل کے شکستہ ساز میں ہے
آ تو بھی دل کی بستی میں گُم ہوجا حسن پرستی میں

نور کا شاعر

مترجمہ جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب ' باقی ' مدیر حصہ انگریزی

مکرمی ایڈیٹر صاحب مجلہ

تسلیم Alfred Noyes انگلستان کے عہد حاضر کا ایک مشہور شاعر اور ادیب ہے ' شاعری اور ادب پر اس نے یورپ کے متعدد ممالک اور امریکہ میں متحرکۃالآرا لکچر دئے ہیں - اس کی کتاب Some Aspects Modern Poetry میں شیلی کی شاعری پر اس کا ایک عالمانہ مضمون ہے جو میتھیو آرنلڈ ' کارلائل ' اور لوئل وغیرہ کی مخالفانہ تنقیدوں کے جواب میں لکھا گیا ہے ' اور جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہے یہ امریکہ میں اس کے ایک لکچر سے ماخوذ ہے - اس مضمون کی ادبیت ' شاعرانہ طرز تحریر ' اور اعلیٰ معیار شاعری پر نظر رکھتے ہوے اس کو شراب سہ آتشہ کہا جاے تو نا مناسب نہ ہوگا - علاوہ ازیں اس میں کلام شیلی کے چند پاکیزہ اقتباسات ہیں جو روح کو وجد میں لاتے ہیں - ان حالات کی مدنظر میں نے کاوش سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - جہاں تک میرا خیال ہے ہمارے علم ادب میں ایسے پر زور تبصرے اس اعلیٰ شاعرانہ انداز میں بہت کم لکھے گئے ہیں ' ضرورت تھی اس امر کی کہ اردو خوان پبلک کو اس سے روشناس کرایا جاے - اس مضمون کی انگریزی ادق اور طرز تحریر ٹھوس اور گنجلک تھی ' میں نے حتی‌الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس اور صاف ہو ' شاید مجھے اس میں پوری کامیابی نہ ہوئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ اوریجنل کی وجہ سے اس امر کا ہونا ناگزیر تھا - بہر حال مضمون کی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے میں نے

اس کی اشاعت کا تہیہ کر لیا ہے لہذا مجھے امید ہے کہ آپ اس کو مجلہ عثمانیہ کے آئندہ شمارہ میں طبع فرما کر ممنون فرمائیں گے —

خاکسار

مترجم

ادب کی حیرت افزا تاریخ میں یہ واقعہ کوئی زیادہ حیرت افزا نہیں ہے کہ بعض اعظم ترین شعرا اور فن کاروں کی مدحت سرائی ان خصوصیات میں کی گئی ہے جن کی ان میں نمایاں طور پر کمی تھی اور اسی طرح اُن پر ایسی چیز کی عدم موجودگی کا الزام لگایا گیا ہے جو آگے چل کر ادب پر ان کا احسان عظیم ثابت ہوی ہے - بعض اوقات اس خلط مبحث کے بڑے حصے کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کا شکار ہوتے ہیں —

یہ صرف ارائین جامعہ ہی کا قصور نہیں ہے کہ وہ نو جوان شاعر جو آکسفورڈ سے " ملحد " سمجھ کر (کالج سے) نکال دیا گیا تھا اپنے زور پرواز اور اس کے یزدانی جوہروں کو اس کامیابی کے ساتھ چھپانے پر مجبور ہوا - لیکن انگریزی تنقید نگاری کو کیا ہوا تھا کہ اس نے بھی کم و بیش ایک سو سال تک دنیا کے ایک وسیع حصے سے اُن کو چھپایا یا اُن کو موہوم بنا دیا ؟ شیلی کے الحاد کے متعلق جو قضیہ تھا وہ موجودہ زمانے میں مہما ہو گیا ہے لیکن بد قسمتی سے (آج کل) یہ ایک رسم سی پڑ گئی ہے کہ شیلی کو اس دنیا سے قطعاً الگ سمجھا جاے جہاں کفر و ایمان دونوں ساتھ ساتھ پاے جاتے ہیں - آج کل یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ " شاعروں کا شاعر " ہے یا عالم ارواح کا ایک موکل - وہ اس لئے قابل ستایش ہے کہ اس میں لطف اور شفاف چاند کی طرح ایک نور پایا جاتا ہے - جدید ترین تنقید نگاری میں اس کی تعریف اسی قسم سے کی گئی ہے - یہ آگ ایک طرح پر معصوم نقاد میانھیوں آرنلڈ کے ایک جملے کی لگائی ہوئی ہے - کافی طور پر سمجھا

نہیں گیا کہ شیلی کے الحاد کا افسانہ اصل حقیقت کا ایک مجنونانہ انعکاس ہے - شیلی جس چیز کا قصور وار تھا اس کو آزادی کے ساتھ وہ لوگ " الحاد " کہہ سکتے ہیں جو کسی چیز پر کامل اعتقاد نہ رکھہ کر اپنے مشربوں میں نت نئے اضافہ کرتے رہتے ہیں - (شیلی وہ شخص ہے) جس نے شاید باستثنائے سلطن خدا وند تعالیٰ پر اُن تمام اساتذہ سے جو ہمارے ادب کے معاون رہے ہیں زیادہ پر زور طریقے پر اپنے ایمان و ایقان کا اعلان کیا ہے اور اس آتش ناک (پر جوش) اعلان میں آئین و رسوم " برت کی طرح پگھل گئے ہیں- پرسکون' اجتہاد پرست قدامت پسندوں کے لئے ایسے ادمی کا مقابلہ جس نے نہ صرف ان کے کمزور عقاید کو پانی کی طرح بہا دیا بلکہ اس ازلی قوت کی صداقت و ماہیت پر یقین کامل رکھتے ہوے اپنا پیغمبرانہ نغمہ اس طرح سنایا —

وہ نور جس کی ضیائے تبسم سے فضاے دو کون منور ہوتی ہے
وہ حسن جو ہر کام کی ابتدا اور تنظیم کا سر چشمہ ہے

ایک ہیجان یا طوفان تھا - یہ دو مصرعے اپنے عقید تمندانہ جوش و استحکام میں پیغمبروں کے اعلیٰ ترین ارشادات یا سنت جان کی کتاب مقدس کے مقابل رکھے جاسکتے ہیں - اپنی ابتدائی نظم میں شیلی نے لکھا تھا —

اس ازلی اور گونا گون کوائف رکھنے والی دنیا میں روح
ہی صرف ایک عنصر ہے -

اس اعتقاد کی آگ وہ تاریخ کے ہر شاعر سے زیادہ اپنے سینے میں فروزاں رکھتا تھا - چوں کہ اس کو " روح " میں " حقیقت " کا انکشاف ہوا ' تنقید نگاری نے کئی دفعہ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اس کی شاعری میں حقیقت نہیں ہے !

تھوڑی دیر غور کرنے سے واضح ہو گا کہ شیلی پر جو اعلیٰ ترین تنقیدیں ہوی ہیں ان سے دو عجیب باتیں متشرح ہوتی ہیں اول یہ کہ ہر ایک نقاد نے

ایسے اسم صفات استعمال کئے ہیں جن سے (صرف ایک قسم کی) ضیاپاشی کا مفہوم نکلتا ہے ' لیکن اس کی کوشش نہیں کی گئی ہے کہ اس کا سرچشمہ دریافت کیا جائے - دوسرے ہر ایک نقاد کی یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ اس ضیا پاش شاعری میں ایک غیر مجسم روح کا شائبہ موجود ہے - دونوں کو ملاکر ایک عجیب ذو معنی طریقے سے شیلی کو ایک " جن " یا " روح " کہتا ہے - تقریباً ہر ایک جگہ ان دو خیالات سے شیلی کی مذمت ظاہر ہوتی ہے - کہیں یہ مذمت معمولی ہے اور جس حد تک کسی بھٹکی ہوئی روح کی تعریف کی جاسکتی ہے - کہا جاتا ہے کہ وہ ضیا پاش ہے اور کہیں بے انتہا شدید ' یعنی کہا جاتا ہے کہ جملہ اعلیٰ قسم کی روحوں کے پاؤں مظبوطی کے ساتھہ زمین میں گڑے ہوئے ہوتے ہیں ' وہ لطیف ہوتی ہیں - اور ان کا بہترین مشغلہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ متقدمین کے کلام کا ترجمہ کریں بجائے اس کے کہ چنڈول (Skylark) پر نظمیں لکھیں [اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان روحانیت کامل حاصل نہیں کرسکتا - مترجم]

ادب کے لئے اس روز افزوں عادت سے جو ہمارے پریشان لٹریچر میں جاں گزیں ہورہی ہے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہے کہ نقاد اپنی ذاتی طرفداری کی بنا پر صرف ایک خصوصیت کا حوالہ دیتے ہوئے جو ابھی اپنے مختلف پہلو اور اعتبار سے غور طلب ہے کسی شاعر کے متعلق تحسین یا مذمت کا اعلان کردے یا بغیر کسی شہادت کے اعتراض پذیر دعاوی پیش کرے یا مصنف زیر بحث کے کلام سے کسی لفظ یا جملے کو جو یونہی انتخاب کرلیا گیا ہے جوڑ توڑ کر اپنے مفید مطلب بنالے - ایک مرتبہ نظموں کی ایک نہائت پاکیزہ کتاب محض لفظ " پریوں " کے تحقیر آمیز استعمال کی بنا پر مذموم قرار دی گئی تھی - اور نقاد اس سے بےخبر معلوم ہوتا تھا کہ کتاب اس کے قابل ہو یا نہ ہو اس کے منسوخ کرنے کی وجوہات قطعاً غلط تھیں ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ " خواب شب برشگال " (A Midsummer

(Nights' Dream کو بھی اسی جلدی کے ساتھ مذموم قرار دے دیا جاتا - خیر یہ تو ایک انتہائی مثال تھی - لیکن فی زمانہ ادب کے متعلق فیصلہ کرنے کا ایک نہایت عام طریقہ اس سے زیادہ وسیع صورت میں موجود ہے - کیٹس ہمیشہ بلبلوں کا ذکر کرتا ہے اور یہ ذکر دراصل ایک نغمہ ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ برباد کن ہے سوئنبرن اس لئے قابل مذمت قرار دیا گیا ہے کہ اس نے ایک "عظیم الخلقت دریائی ساور" یا "ویران باغوں" کا ذکر کیا ہے یا ایک پیرا گراف میں اسی قسم کی ترکیبوں کا بے ڈھنگا استعمال کیا - اس طریقے سے ایک تیز مزاج نقاد عام اشیا کے ساتھ خصومت اور بغض رکھ کر انگریزی ادب کے بیسیوں چشموں کو گدلا کر سکتا ہے اور بے پروا اور جلد باز پبلک پر بیجا دباؤ ڈال کر وہ صحیح تنقید کی مزاحمت کرتا (یعنی جو اصل میں محاسن نگاری ہے) اور اس کی ترقی کو عرصۂ دراز تک روک دیتا ہے —

کارلائل جس کی عقل سلیم اکثر اوقات اس کی صحت پر منحصر تھی اس معاملے میں بے قصور قرار نہیں دیا جاسکتا - جب سے اس نے بچھو کو مغالطے سے گوشت سمجھا اس زمانے سے اب تک موجودہ تنقید نگاری میں کئی ایسی تند مزاجانہ غلطیاں ہوگئی ہیں جو اصل حقیقت سے دور ہیں - اس نے کہا کہ شیلی ہمیشہ تشنجی کش مکش کو غلطی سے قوت سمجھتا ہے' اس کا کلام کسی "بھوت" یا "جن" کا کلام معلوم ہوتا ہے جو اپنی یا کسی غیر کی امداد سے مجبور ہوکر رات بھر لاانتہا آہ و فریاد کرتا ہو - کارلائل اپنے شاہکاروں کی حد تک بیشک ایک بڑا مصنف ہے اس پر بھی ہم یہ جواب دے سکتے ہیں کہ شیلی نے اس سے زیادہ زندہ باش' اس سے زیادہ دلوں پر اثر کرنے والی ایسی چیز جس کی پرواز میں زخم و جراحت کا مزاحم موجود ہو نہیں لکھی ہے جو اڈونائی (Adonais) میں ہے —

وہ نور جس کی ضیائے تبسم سے فضائے دوگون منور ہوتی ہے
وہ حسن جوہر کلام کی ابتدا اور تخلیم کا سر چشمہ ہے

یہ اشعار ایک ایسے شخص کا پر تاثیر سکون معلوم ہوتے ہیں جس نے نور کے ساتھ تو صل حینی حاصل کیا ہو - یہ وہ نور ہے جس تک پہنچنے کی کار لائل ہمیشہ کوشش کرتا رہا لیکن پہنچ نہ سکا —

علاوہ ازیں اس سے زیادہ کوئی اور اثر تنقیدی غلطی جو حقیقی قدر کو اس برے طریقے سے الجھاو میں ڈالتی ہو نہیں ہے کہ ایک خاص معاملے میں عام نظریات یا اُصول کو ذاتی رائے کے تحت بیان یا منضبط کیا جائے - یہ بالکل صحیح ہے کہ عام طور پر تشنجی کش مکش کو قوت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جو غلط ہے ' لیکن خود کار لائل نے کئی دفعہ یہ غلطی کی - اور جس طرح لوگ اپنی خصوصیات کو دوسروں کے سر لگا دیتے ہیں (یہ بھی تنقید نگاری کی ایک عام غلطی ہے) اسی طرح وہ اپنی غلطی کو شیلی کے سرتھوپ دیتا ہے اور رات کے وقت لامنتہی آہ و زاری کو جو اس کی ذاتی خصلت ہے اس کے ساتھ متعلق کردیتا ہے - یہ خصوصیت سرتا پا کار لائل کی ہے شیلی کی نہیں - شیلی بعض اوقات قوت حاصل کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ کوشش کرتا ہے اور ایسی حالتوں میں وہ قابل الزام ہے - لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس الزام کو اس کے شاہ کاروں تک وسیع کیا جائے - شیلی کی فطری اور جبلی صفات میں ہیجان یا تاریکی میں لامنتہی آہ و زاری نہیں بلکہ نغمات ' مستی و مدھوشی ' رنگ اور نور داخل ہیں - اگر عام ادب کی سب سے زیادہ فرحت افزا نظم Ode to Skylark کو کار لائل کی تنقید کے مقابلے میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس نظم سے شیلی کی حقیقی عظمت خود بخود جھلکتی ہے اور کار لائل اپنی مغموم تصویر آپ کھینچ کر اس پر تنقید کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے —

میا تھیو آرنلڈ ' بھی اپنے اس جملے یعنی " خوبصورت غیر متاثر فرشتہ

بیکاری کے ساتھہ فضا میں اپنے درخشاں شہپر مار رہا ہے" سے اپنی ایک خصوصیت کو زیادہ تر شیلی کے ساتھہ وابستہ کررہا ہے اور وہ یہ ہے - دو ایسے عالم کے درمیان بہبودہ بوٹکنا جس میں سے ایک [illegible] ہو' دوسرا از سرنو پیدا ہونے سے قاصر ہو - لیکن اس کی تنقید میں کم از کم شہپریوں کی درخشندگی تسلیم کی گئی ہے - 'لوئل' نے آرنلڈ کی آواز بازگشت کی صورت میں کہا تھا کہ شیلی کی عظمت ایک غیر نقصان رساں آگ کی طرح ہے جو اس تخیل کے منور حدود پر جل رہی ہو' ایسی اعلیٰ خصوصیت رکھنے والے نقاد کی زبان سے یہ آواز بازگشت علم ادب میں نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے —

'ٹینی سن' لکھتا ہے کہ میری حد تک شیلی "ضرورت سے زیادہ آسمان پرواز معلوم ہوتا ہے"- یہ بالکل ٹھیک خیال ہے جو کائنات پر زیادہ سائنٹفک نظر کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے' گو اس نظر نے اس کو مصنف اے پپ سیڈیاں (Epipsyehidion) یعنی شیلی کی بجائے گوئٹے سے زیادہ قریب کردیا ہے - 'براوننگ' نے اپنے ایام شباب میں شیلی کو "آفتاب پیما" کے لقب سے پکارا اور اس سے خوشنودی ظاہر کی - 'فرانسس تھامپسن' اس کو جگ مگاتے ہوے اور رنگ برنگی بھیس میں ایک ایسے لڑکے کی طرح دیکھتا ہے جو ماہ تاب کے ساتھہ شوخیاں کرتا ہو - 'مسٹر جارج مور' اس کے کلام کو "بلورین شاعری" سے تعبیر کرتے ہیں اور "حساس پودے" کے چمک دار اشعار' مصنف کے الحاد (مسٹر مور ابھی تک اس پر جمے ہوے ہیں) اور اس کی صناعی کا جو صدف سے بنی ہو اور جس کے مستول پر انجم کا افشاں ہو اور جس کے بادبان ماہ تاب کی شعاعوں سے بنے ہوں ذکر کرتے ہیں --

المختصر شیلی پر جتنی تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں سے تقریباً ہر ایک میں غور کا ذکر موجود ہے لیکن یہ ذکر ایک پروانے یا تیتری کی طرح نظر آتا ہے جو اس کو پھپھانے یا اس کا منبع دریافت کرنے کی بجائے اس کے اطراف بد ترتیبی کے

ساتھہ اژدھو ہوکار لائل کے لئے وہ نور کی صرف ایک دھیمی طلسمی جھلک ہے لیکن دوسروں کے لئے شیلی کے چمک دار پر ہیں ' آگ کی مشعل ہاتھہ میں ہے ' اس کا جلوہ ابر میں ہے اور اس کا پاؤں آفتاب پر ہے - شیلی کی فطرت کی اصلی شناخت جملہ تنقیدوں سے زیادہ براونگ کی ترکیب "آفتاب پیما" میں موجود ہے - اور اس کی مخالف تنقیدوں میں اس نور کو صرف ایک فریب نظر کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے - اس قسم کے مخالف نقاد (جانسن کے الفاظ میں) کہتے ہیں —

اے نور میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں لیکن جراحت آمیز قلب کے ساتھہ

جسکو خواہش کہ سنہری چمک کو شب دیجور کی سیاہی نصیب ہو

صرف براونگ ہے جو اپنی مردانہ اور فاتحانہ ترکیب " آفتاب پیما " میں اس شاعر کو جسکے قدم کے نیچے خورشید موجود ہے اپنی پوری عظمت کے ساتھہ ظاہر کرتا ہے - وہ کہتا ہے

" اے آفتاب پیما ' میں خداوند تعالیٰ اور صداقت پر ایمان رکھتا ہوں "

ایک سنجیدہ اور معقول تنقید کے بالکل ابتدائی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شاعر کی تحسین یا مذمت کے قبل ہم یہ دریافت کریں کہ صناع ہوشمندانہ یا مدہوشانہ طریقے سے کرنا کیا چاہتا ہے ؟ ہم کو ایک منظر کی اس لئے مخالفت نہیں کرنی چاہئے کہ وہ انسانی تصویر نہیں ہے یا ایک تخیلی یا طلسمی قول کو اس لئے مذموم قرار نہیں دینا چاہئے کہ اس میں کسی کثیف اور تاریک حقیقی بیان نہیں ہے ' یا عندلیب پر کسی نظم سے اس لئے ناراضی ظاہر نہیں کرنی چاہئے کہ وہ موجودہ سوسائٹی کے خلاف تنقید نہیں کرتی ہے - اگر زمانہ گذشتہ میں اس ابتدائی اصول کی پابندی کی جاتی تو ہمارے ادب کے بعض اعظم تریں مصنفین دنیا کی دولت علم میں اس سے زیادہ شاندار اضافہ کرسکتے جس کی ہم نے ان کو اجازت دی ہے اور وہ چند اشعار جو شیلی نے کیٹس کی موت پر لکھے

بے ضرورت ثابت ہوتے ۔ "چمکدار بازو" اور خوشنما فرشتہ" نہایت خوشنما ترکیبیں ہیں اور ان کے واضح کے مذاق لطیف کی طرف ہماری توجہ منعطف کرتے ہیں ' لیکن شاعر کے اعتقاد اور دلچسپی کے مفہوم کو جو نور اور ہوا کے تاثرات کے ساتھہ وابستہ ہے شعر برابر بھی ظاہر نہیں کرتے ان سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ ان کے ساتھہ شیلی کی ذہنی وابستگی خود ایک عیب ہے - اس طرح موجودہ نقاد تفصیل کے ساتھہ ان خصوصیات کا جو زمانہ جدید کے مصنف کی امتیازی صفات ہیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا یہ صفات بجائے خود عیوب ہیں ۔ یہ شخص بحرطویل استعمال کرتا ہے ' وہ بحر خفیف ' اس آدمی کو رنگ پسند ہے ' اس کو زبان کی موسیقیت ' یہ شخص دقت اور سختی کے ساتھہ لکھتا ہے سرا آسانی کے ساتھہ ۔ ان میں سے ہر ایک بیان تحسین و مذمت کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے اور قرار دیا بھی گیا ہے - لیکن اس سے تنقید کا حقیقی مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ قطعاً نظر انداز ہو جاتا ہے - شیلی کی حد تک تنقید نگاری ایک فرض یہ تھا کہ وہ نور کے اثرات کے ساتھہ اس کی دلچسپی اور تعلق کا انکشاف کرے نہ یہ کہ بے اثر شعروں کی تصویر مکمل کرنے کے لئے اس سے امداد حاصل کرے

تنقید نگاری نے اس امر کو مسلسل فراموش کر دیا ہے کہ شاعری ایک فن ہے اور شاعروں کو ایک فن کار کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے - کیا خوب کہا گیا ہے کہ نور اپنی بوقلموں رنگارنگی اور جھلکیوں کے اعتبار سے فطرت کا اعلیٰ ترین رومانی عنصر ہے - شیلی خواہ اس نے اس کے متعلق کوئی نظریہ یا اصول قائم کیا ہو یا نہ کیا ہو اپنی جگہ ایک فن کار تھا اور اس نے نور کی دلچسپ کیفیات کو عالم امر اور عالم مثال کے جلوے دکھانے کے لئے استعمال کیا - اس کی شاعری کے اس پہلو میں "ٹرنر" کی مصوری کا رنگ جھلکتا ہے ' شیلی نور کا اعظم ترین شاعر ہے اور کسی نے مقابلتہً نور کی اس سے زیادہ وسیع کیفیات نہیں پیدا کیں ۔ یہ یقینی طور پر

کہا جاسکتا ہے کہ تنقید نگاری نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا کہ شیلی کی ہر ایک نظم میں نور اور پرچھائیوں کی کوئی نہ کوئی نئی کیفیت ایسی ضرور ہے جس کو اس سے قبل کبھی الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا گیا تھا —

اے رات اے ستاروں کے موضع جو ہر ' اپنے جسم پر ہلکے رنگ کی سپید چادر اوڑھ لے
اور اپنی زلفوں کی شفق سے دن کی آنکھوں کو خیرہ کردے

اس قسم کے کلام پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فضائے خالی میں پر مارنے کا مسئلہ اس پر صادق نہیں آسکتا - اسی طرح ہم ٹرنر کی تصاویر ' بارش '' ' بھاپ '' اور '' رفتار '' کو دیکھ کر یہ بیان کرسکتے ہیں کہ یہ ایک خوبصورت بیکار مشین ہے جو فضا میں بیکاری کے ساتھ اپنے چمکدار پہیے گھما رہی ہے - ایک فن کار جو حسن پیدا کرتا ہے وہ کبھی بے اثر نہیں ہوتا بلکہ خود اس فن کار کے منشا کو بخوبی واضح کرتا ہے - '' رات '' پر شیلی کی نظم دیکھئے معلوم ہوگا کہ علم ادب میں اس سے زیادہ خوبصورت شفق کہیں نہیں ہے جو صفحہ قرطاس پر اس مصرعے کی وجہ سے پھولی ہے —

اپنی زلفوں کی شفق سے دن کی آنکھوں کو خیرہ کردے —

اس مصرع کے پہلے چار لفظوں پر نفیس ترین جھلکیوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور آخر کے چار لفظ فطرت کے سب سے زیادہ نرم اور خوبصورت نور یعنی '' آنکھ کی روشنی '' سے جگمگاتے ہیں - لیل و نہار کی ہمرنگی اس سے زیادہ پاکیزہ صورت میں نہیں دکھائی جاسکتی —

ان خاموش لمحوں میں جب کہ رات کی دیوی نے شاعر کی دعا کو شرف قبولیت بخشا تھا' جب کہ وہ خشک روشنیاں جو ہماری زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں آغوش فنا میں جابسی تھیں ' دن کی گرد آلود مصروفیتیں اور ناخوش گوار آوازیں خاموش ہوگئی تھیں جب کہ کائنات کا کالبد خاکی ایک پاک عنصر کے نغمۂ شیریں

میں جذب ہوگیا تھا ' شاعر کو وہ لازوال دولت ملی جس کا وہ بے حد آرزو مند تھا ' اس دولت کی ہیئت ظاہری بدل گئی تھی ' لیکن شاعر نے اس کو ایک نور کی صورت میں جلوہ گر کیا ہے ۔

(اے اللہ) نیند کے سنہری دروازے جہاں حسن اور قوت
ہم آغوش ہو رہے ہیں کھول دے ۔
اور ان کے پاک جسموں کو ستاروں کی چمک عطا کر جو فضائے
باورین کے دریا میں جگمگا رہے ہیں ۔

سوئنبرن نے شیلی سے بہت کچھ حاصل کیا ' لیکن جب اس نے اس قسم کی کیفیات پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ کامیاب نہ ہوسکا ۔ شاید یہی مصرعہ ـــــ ' اپنی زلفوں کی شفق سے دن کی آنکھوں کو خیرہ کردے " تھا جس نے اوالذکر شاعر کے دل میں وضاحت کے ساتھ اپنی " اُداس دن " والی تصویر کھینچنے کا خیال پیدا کیا ہو جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ۔

رات کے بے لطف اور بیکار اظہار محبت اور اس کی ابر آلود
کاکلوں سے اس کا طلائے مطور بے نقاب ہوتا ہے ۔

لیکن اس میں ذرا ثقالت ہے اور اس نظم میں (جس سے یہ اشعار ماخوذ ہیں) زیادہ روکھا پن اور گرانی پائی جاتی ہے ۔ اس میں گہری پر چھائیاں نرم نرم روشنی ' اور وہ دلآویز کانپتی ہوی زندگی فنا ہوگئی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض امور ایسے ہیں جن کو ' سوئنبرن ' دوسروں سے زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا تھا ' لیکن یہ خصوصیت ان میں سے نہ تھی ' وہ دریا اور اس کی تموج انگیز نبضی حرکتوں کا بادشاہ تھا ' لیکن نور کی جذب نشان سلطنت میں صرف شیلی ہی کی حکمرانی چل سکتی تھی ۔ ' بائرن ' اور ' سوئنبرن ' دونوں نے دریا میں روح ازل کا عکس منور دیکھا تھا ' لیکن آخرالذکر نے اس کے ہر ایک

تغیر پذیر منظر میں ایک خاص لذت ایک خاص جذباتی عمق پیدا کیا۔ کف کا اچھلنا، بادبانوں کا دور سے ایک زرد رنگ کھلے ہوئے پھول کی طرح نظر آنا، آبشار اور چادر پر سفید قوس قزح کا نکلنا، یا اس کی وہ پاکیزہ الوداع جو اس کے مختصر مجموعہ نظم کے لئے لکھی گئی تھی —

اے سفید تیتریو! سمندر کی طوف اڑی چلی جاو

قطعاً اسی طرح لیکن اس سے زیادہ جدت کے ساتھہ شیلی نے نور کا استعمال کیا، اور اس کی جملہ تصویریں اس لئے کہ وہ اس حسن سے ماخوذ ہیں جو "ہر کام کی ابتدا اور تنظیم کا سر چشمہ ہے" اپنے ہر تغیر پذیر منظر میں ایک خاص کیفیت رکھتی ہیں —

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ متبرک ساعت ملائے اعلیٰ کی پاکیزہ فضا کی ودیعت تھی اس لئے کہ اس نے آفتاب کے تاج زرین پر سے بہشت کا نور پھیلایا تھا —

اس روحانی عنصر سے اس کی شاعری ہمیشہ ایک عظیم الشان معجزے کی قوت حاصل کرتی ہے اور تخیل و نظر کی اُس بلندی پر پہنچ جاتی ہے جہاں شعرا 'تھامس آکیپس' کی طرح ہر چیز کو وحدت دیکھتے ہیں —

جب رات مشرق کے تاریک کمروں میں نظر اور روشنی سے محروم کر دی جاتی ہے اور نصف النہار کی چادر ہمارے سروں پر پھیلتی ہے اور دریا کی بے شمار موجیں اس مقام پر جہاں دریا اور زمین ہم کنار ہوتے ہیں ہمارے قدموں کے پاس اپنے نغمے سناتی ہیں، اس وقت تمام کائنات عالم گیر آفتاب کے نور میں جذب ہوکر ایک وحدت بن جاتی ہے —

شیلی کا بیان ہے کہ دن کی معمولی روشنیاں بھی نور اعظم کے ساتھہ پیوست

ہوکر اس کے حسن اور اسرار ازل کو جذب کرتی ہیں۔ اس جذب و کشش کے مدارج کو وہ اپنی نظموں میں متعدد جگہ بیان کرتا ہے۔ نظم (Prometheus Unbound) میں اس کا بیان ایک بہترین تمثیل ہے —

> (شاعر) صبح سے شام تک اس شفاف چشمے کو جس میں آفتاب کی شعاعیں گھل رہی ہوں دیکھتا رہے گا اس کی نظر ان تتلیوں پر رہے گی جو انگور کی بیل پر اُڑ رہی ہوں ' وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ وہ کون ہیں ؟ کیا ہیں ؟ لیکن ان سے وہ چند ایسی دلچسپ تصویریں بنائے گا جو جیتے جاگتے انسان سے زیادہ حقیقی ہوں ' اور جن کو حیات جاوید کے آغوش نے پرورش کیا ہو —

باوجود اس کے کہ وہ " زیادہ حقیقی " کا ذکر کرتا ہے اس سے چشم پوشی کرکے یہ فرض کر لینا کہ اس کی سلطنت نور میں کوئی حقیقت نہیں ہے کوئی اچھی تنقید نہیں اگر اس میں حقیقت نہیں تو پھر افلاطون اور موجودہ زمانے کے اعلیٰ ترین فلاسفہ کے مضامین میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تنقید نگار کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس اعلان کا ذکر کرے اور (اگر اس کی شاعری کو غیر حقیقی ثابت کرنا ہو تو اس کو غلط ثابت کرے ۔ یہ فعل درست نہیں ہے کہ اس کے نقطۂ نظر سے چشم پوشی کرکے صرف مفہوم مخالف کو بیان کردیا جائے جس طرح " آرنلڈ " " لوول " اور " کارلائل نے کیا ہے —

یاد رکھنا چاہئے کہ شیلی نے ایک فن کار کی حیثیت سے شعر کہے اور وہ اپنی تخیلی بلندی تک ایک فن کار اور ایک شاعری کے راستے سے پہنچتا ہے۔ جب وہ ہمارے لئے ایک ترکیب مثلاً خوف کی شور انگیز دلفریبی " لکھتا ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ہمارے سامنے سیال پرچھائیوں فلک پرواز نور کی ایک تصویر ان کا ایک احساس پیش

کرتا ہے' یہی احساسات اور ان کے نازک تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ دنیا کی خوبیوں اور اس کی عظمت کو اپنے اندر جمع کرتا اور اپنے تخیل کا اظہار کرتا ہے۔ کئی شاعروں نے کیٹس کی قبر کے پھولوں کا ذکر کیا ہے لیکن شیلی نے ان میں نئی روح پھونک کر ان میں " نور " کا انکشاف کیا - حسب معمول وہ " سبزۂ نمی حیات کی چمک " کا ذکر کرتا اور قبل اس کے کہ اس کی عاشقانہ بیان کرے پہلے نور کا جلوہ دکھاتا ہے —

سبزہ خوابیدہ پرخندہ ہائے گل کی روشنی پھیلی ہوی ہے —

اس کا قاعدہ ہے کہ وہ کثرت کو وحدت کے ممتاز جلوے میں ضم کر دیتا ہے اور اس کی نرم سرگوشیوں کو ملا دیتا ہے اس نور سے جس کی ضیائے تبسم سے فضائے دوکون منور ہوتی ہے —

" نیوٹن " نے اپنے منشور کے ذریعے ان روشنیوں میں جو دن کے وقت روزانہ دکھائی دیتی ہیں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا ' متقدمین شعرا مثل " تھامس آکمپس " وغیرہ نے اپنا مطمح نظر صرف اسی کو بنایا لیکن یہ شیلی کے حصے میں تھا کہ وہ اس نئی مصوری کو لیکر جو " نیوٹن " نے پیش کی تھی دنیا کے سامنے لطیف روحانی تجلیات پیش کرے —

صرف ذات واحد باقی رہتی ہے ' کثرت کو تغیر اور فنا ہے ' —
آسمان کا نور ابد تک روشن رہنے والا ہے ' لیکن زمیں کی
جھلکیاں فنا ہوجائیں گی - حیات ایک رنگ برنگی شیشے
کی گنبد کی طرح ازل کی شفاف فضا میں چمکتی ہے
بالآخر موت کا فرشتہ اس کو روند کر پاش پاش کردیگا ہے —

شیلی کا مقصد اس امر کا واضح کرنا تھا کہ کس طرح نور ازل کائنات کے کالبد خاکی میں ایک دریائے لطیف کی طرح جاگزین ہوا ہے ' اس نے اپنی آسمانی

تجلیوں اور جھلکیوں کو کوزہ میں دریا کی طرح بند کر کے اپنی شاعری کے ذریعہ بیان کیا ہے - اس کے کلام میں ابتدا سے انتہا تک سمندر کے اندر والی طلسمی دنیا کا حیرت انگیز ' حسن اس کا رنگ اور فضا ' اس کی شفق آمیز روشنیاں اور شفاف پرچھائیاں پائی جاتی ہیں - اس روحانیت کے قطع نظر ' طبعی دنیا کے متعلقات سے بحث کرنے میں بھی اس نے کوئی غیر اصولی یا کوئی موہوم طریقہ اختیار نہیں کیا ' حقیقت یہ ہے کہ وہ اس پیغمبر کی طرح شعر کہتا ہے جس نے اس طریقہ کو پیش از پیش دیکھا ہو جس سے خود سائنس اس مادی دنیا کو خواب اور افسانے کے اجزا میں معلول کرنے کی چنانچہ اس کے ذرات ' برق پارے ،مرکز ہائے ثقل و عمل' اور قوت ذہنی کی جنت نشان گردشیں (شاید ان کو ہم چند دن بعد دریافت کریں) معجزوں سے زیادہ معجزنما ہوگئی ہیں —

اس کا کوئی ذرہ فنا نہیں ہوتا ۔ لیکن ایک دریائی تغیر متاثر

ہوکر ایک حیرت انگیز اور خوبصورت شے بنجاتا ہے —

طبعی دنیا کا بھی وہ سیال منظر ' بھی رنگ تغیر تھا جو راگ کی طرح شیرین اور نور تخیل کی طرح لطیف ہے جس میں شیلی نے اپنا الہام محسوس کیا اور ایک حد تک یہی صورت حال تھی جس نے اس پر یہ الزام عاید کیا کہ وہ " خلامیں بیکار پر مارہا ہے " لیکن اس سے زیادہ اندھی تنقید کوئی اور نہیں ہوسکتی وہ ہم کو مادیین کے بے جان ریگستان ' اس کی غیر مصفا آب و ہوا ' ان ڈراؤنے پہاڑوں سے نجات دلا کر ایک ایسی روح پرور کائنات عطا کرتا ہے جس میں دریائی تموجات کی طرح تغیرات (ماضی و مستقبل ہوتے ہیں اور جس کو جملہ فنون کی شاعری ہی پیش کر سکتی ہے —

چشمے ندی ہی کے ساتھ ہم کنار ہوتے ہیں

اور ندی سمندر کی ہم کنار —

شیلی اس جزرومد کے حسن اور اس کو ازلی موسیقیت یعنی کائنات کے نغمۂ شیرین میں اپنی لذت محسوس کرتا ہے - وہ روحانی دنیا اور محبت کی بستی سے اس کو ہم آہنگ بناتا ہے اور بار بار اس کو انتہائی جدت آمیز فطرتی مصوری کے ذریعہ جو اس کے امکان میں تھی ' نور اور جھلک کی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے - اپنی سلیس ترین طرز ادا مثلاً اس " ابر " والی پاکیزہ نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے مادی رخ کو ایک چمکدار تخیلی اجزا کا آئینہ بنانے میں خاص لذت محسوس کر رہا ہے ' لیکن اس کی صفائی تصور اس کو فضائے لطیف میں بھٹک جانے سے روکتی ہے (جس طرح خود پرامپرو شاید بھٹک گیا ہے) — اس کا تصور ایریل (Ariel) کا تصور ہے — ' اس کا کوئی ذرہ فنا نہیں ہوتا " — اور ایریل کا تصور موجودہ سائنس کا تصور ہے - اپنی " ابر " والی نظم میں شیلی قانون فطرت کو اس استعاراتی شان کے ساتھ استعمال کرتا ہے جس طرح موجودہ زمانے کا کوئی سائنس داں شخص حرکت کے اصول منضبطہ کو پوری طرح پیش نظر رکھے گا ...

میں مادر ارض اور سمندر کی جگر گوشہ ہوں اور آسمان کا پروردہ عافیت ' میں سمندر اور ساحل کے مسامات سے گذرتا ہوں - مجھے کو تغیر نصیب ہے لیکن میں فنا نہیں ہوتا ' کیونکہ جب بارش رحمت کے بعد ایوان فلک بغیر کسی داغ کثافت کے عریاں ہوتا اور جگمگاتا ہے ' اور جب کہ ہوا اور آفتاب کی کرنیں اپنی معجذب شعاعوں سے فضائے لطیف کا گنبداخضر تیار کرتی ہوں میں خود اپنے مقبرے کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ ہنستا ہوں ' اور بارش کے غاروں سے اس طرح نکل کر جس طرح ایک معصوم آغوش مادر یا کوئی روح

قبر سے نکلتی ہے بلند ہوتا اور ان سب کو فنا کا جام پلاتا ہوں -

کوئی شخص بھی حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مندرجۂ بالا نظم سے میاتھیو آرنلڈ کو ایسے فرشتے کا تخیل کیوں نہیں پیدا ہوا جو فضائے خالی میں اڑتے رہنے کی بجائے قوانین فطرت کی زیادہ واقفیت رکھتا ہو - شیلی کو ابر سے انس و محبت تھی اور اس لئے نہ تھی کہ وہ بے اصل تھا بلکہ اس لئے کہ وہ کائنات کا درخشاں جز تھا - وہ قوانین فطرت کی پوری اطاعت کرتا تھا اور اس گیں ہم رنگی پیدا کرنے ' چمک اٹھنے ؛ شولے لطیف میں جذب ہو کر نیا رنگ نمود حاصل کرنے کی زیادہ اہلیت موجود تھی - وہ دنیا کے مناظر کا ایک موقع تھا جس کو شاعر عالم کو دکھانے کے لئے عاشق نا شاد کے اس چراغ کی طرح جلاتا تھا جو اُلفت کے جزیرے میں دفن ہو—

شیلی نے اپنی نظم "حساس پودے" میں باغ کو جس انداز سے بیان کیا ہے اگر اس کا مقابلہ شکسپیر کے اس قدرتی جنگل سے کیا جائے جس کو اس نے "خواب شب برشکال " میں خلق کیا ہے تو واضح ہو گا کہ شیکسپیر (شیلی کے ماقبل شعرا کی طرح) معمولی تخیل کے کثیف پھولوں کو ذی حیات ' ممتاز ہستیاں ' اور دلفریب تذکرے سمجھنے میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا شیلی میں بھی یہ دلچسپی موجود تھی ' لیکن وہ ان کو زیادہ تر اس لئے عزیز رکھتا تھا کہ وہ اپنے ذریعہ سے نور پھیلایا کرتے تھے' وہ ان روشن اور منور چراغوں کی طرح تھے جو خود اپنے شعلۂ دل سے فروزاں ہوں اور چھوٹے مراکز ہوں اس نور " کا جسکی ضیائے تبسم سے فضائے دوکوں منور ہوتی ہے " - وہ ایک شاعر اور ایک فن کار کی طرح اس نور کو وجدانیت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور ایسے حیرت انگیز جدید رنگ میں پیش کرتا ہے جس کی نظر دنیا کی ماقبل شاعری میں مشکل سے ملتی ہے - وہ اپنی جودت طبع سے الہامی سرعت کے ساتھ چشم زدن میں اس منزل تک پہنچ گیا جس کی

طرف جانے کے لئے ہمارے موجودہ زمانے کے اعلیٰ ترین مصورین غیر تشفی بخش اصول و ضوابط میں پھنس کر ابھی ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دینوی بہشت میں پھولوں کی حیات و سمات محض انفرادی نہیں ہے اس لئے کہ —

ان پھولوں میں وہ نور اور خوشبو ایک دوسرے کے اندر چھپا کرتی ہے جو ایک ہمسایہ پھول دوسرے کو ودیعت کرتا ہے "۔

آرٹ کی حد تک وحدت و کثرت کی یہ ہم آہنگی جو نور کے رنگ میں پیش کی گئی ہے نہایت مکمل ہے —

وہ تھرتھراتی اور آزاد مچلتی ننھی ننھی تتلیاں جو مختلف رنگوں سے چمکائی ہیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے ایک آفتاب آشام دریا پر سنہری کشتیاں۔ ان میں نور اور خوشبو ہے اور یہ سبزۂ ذی حیات کی چمک پر تیرتی ہیں —

شبنم کے وہ لطیف ابر پارے جو شعاع نظر سے پوشیدہ ہوں، پھولوں میں شعلۂ حسن بن کر چمکتے ہیں۔ لیکن جب آفتاب بام فلک پر چڑھتا ہے اور اپنی پاکیزہ خوشبو سے مدہوش ہوکر آسمانوں میں روحوں کی طرح گردش کرنے لگتے ہیں —

وقت عصر کی مدھم اور مرتعش کرنیں حرارت آمیز سطح عرض پر دریا کی طرح لوٹتی ہیں اور ان میں ہر ایک آواز، ہر ایک خوشبو اور ہر ایک شعاع اس طرح مرتعش ہوتی ہے جس طرح شفاف چشمے کی لہریں —

ان میں سے ہر ایک ایک رحمت نواز فرشتہ ہے جو "حساس پودے" کو روح پرور انبساط کا پیغام پہنچاتا ہے —

اور دن کی جانفزا ساعتیں اس طرح گزر جاتی ہیں جس طرح
صاف آسماں کی خاموش فضا میں ابر کے ٹکڑے —

لیکن اس طوفان نور میں کسی قسم کا ہیجان نہیں ہے ' اس موسیقیت کامل کا کوئی سر اپنی انفرادی خصوصیت اور دل آویزی میں ضائع ہونے نہیں پاتا ' وہ اپنی اکملیت میں کامل اور اپنی جامعیت میں جامع ہے —

اس خوبصورت بستی میں ایک قوت موجود تھی
اس خلد بریں میں ایک حوا کا وجود تھا ' ایک ناز و عشوہ
کی حکومت تھی —
جو پھولوں کو اس طرح دارو ے بیہوشی یا بیداری پلاتی تھی
جس طرح خداوند تعالیٰ ستاروں کی دنیا کو پلاتا ہے —

اس نور کامل کی بھی وہ تجلیات ہیں جو (Epipsychidion) کے اشعار میں جلوہ گر معلوم ہوتی ہیں - اگر نظم متذکرہ کو ایک معمولی نغمۂ محبت سمجھا جاے تو مصنف کے درخشاں بازو فضا میں بیکار پر افشانی کرتے نظر آئیں گے ' لیکن اصل حقیقت یہ نہیں ہے - اصول کی حد تک اس نظم کا مضمون وہی ہے جو اتونی کا ہے اور یہ صحیح ہے کہ موخرالذکر نظم میں شیلی عمداً اول الذکر نظم کے ضیا پاش استعاروں کا اعادہ کرتا ہے " اپی سائی ڈیڈیان" اس نور کی فتح کی مبارکبادی کے سوائے کچھ اور نہیں ہے- جس کی " ضیاے تبسم سے فضاے دوکون منور ہوتی ہے " - اس کا دینوی حصہ اس چراغ کا ڈھانچہ ہے جس کے ذریعہ وہ نور چمکتا ہے ' اور یہ نہیں ہے کہ شاعری کی پری نے اپنے بازو اس شعلۂ آسمانی میں جلاے تھے —

یہ نور اس کی نظر کا جلوۂ کامل تھا ' اور اسی سے شیلی کی جلتی دنیا چمکتی تھی - حقیقتاً دیکھا جاے تو معلوم ہوگا کہ وہ تنقید جس نے اس کے درخشاں بازوں کا موہوم ذکر کیا ہے خود " خلا " میں گم ہو گئی ہے - نقادوں نے ان واقعات کو جن

کی غلط فہمی نے بعض مصنفین کو ایسے مہمل جملے لکھنے کی طرف متوجہ کیا تھا شیلی کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا - مثلاً یہ کہنا کہ شیلی کے دیوان کا ایک صفحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مناظر نور کو بالراست وضاحت کے ساتھہ پیش کیا گیا ہو قطعاً غلط ہے حالانکہ صحفات کے صفحات ایسے ہیں۔ جس میں ہر شعر بلکہ ہر ترکیب لفظی میں یہ کوائف غیر اختیاری طور پر اس طرح استعمال کئے گئے ہیں جس طرح کوئی مطرب خود اپنے گانے سے مدہوش ہوکر کئی بے ساختہ تانیں لگاتا ہے' اور کبھی افلاطون کی تخیلی وسعت اور صفائی نظر پائی جاتی ہے جس سے وہ نور

" وہ حسن جو ہر کام کی ابتدا اور تنظیم کا سر چشمہ ہے "

منعکس ہوتا ہے —

اگر صحیح غور اور تفکر سے کام لیا جاتا تو کوائف نور کے غیر اختیاری اور نوکھے لیکن کامل تعلق کو جس کی انگریزی شاعری میں نظیر نہیں مل سکتی نہایت خوبی اور تکمیل کے ساتھہ سمجھہ لینا کچھہ زیادہ دشوار نہ تھا - لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پر غور ہی نہیں کیا گیا - جلد باز اور تغافل شعار نقادوں کو ان کامل اور حقیقی نوری تعلقات میں ایک معمولی اور موہوم جھلک نظر آئی جس کو انھوں نے صرف ضیا پاشی سے تعبیر کیا یا صرف ایک قسم کی نیم بیدار نہ ملمع سازی جو اس موہوم ضیا پاشی پر کی گئی ہو - یہ نقاد چند موزوں اسم ہائے صفت استعمال کرنے میں اس بہرے ضعیف مولانا کی طرح معلوم ہوتے ہیں - جو ایک زبردست ہارن دیتی ہوی موٹر کار کی طرف اپنی پشت کر کے یہ فرماتے ہیں کہ ان کی قوت سماعت کچھہ بڑہ گئی ہے اس لئے کہ ان کو ایک بھونرے کا بھنبھنانا سنائی دے رہا ہے - ان لوگوں کی نا کامی سے کلام شیلی کی تنقید پر چند عملی اثرات مترتب ہوے بغیر نہ رہ سکے - مثلاً اگر پال گریو Palgrave صاحب اس خاص

نوری کیفیت کو جس کا پیدا کرنا شیلی کا جادوانی اور حقیقی مقصد تھا اچھی طرح محسوس کرتے تو میرے خیال میں وہ یہ نہ فرماتے کہ آفتاب پوش شہر کو نکال کر " دریا پوش شہر " بنا دینا چاہئے - یہ ترکیب لفظی ان اشعار میں ہے جو اُس نے یو جینین پہاڑوں پر لکھے تھے - بر سبیل تذکرہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لوئل کے قول کا جو آرنلڈ کے مشہور جملے کی آواز باز گشت ہے مقابلہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ خود آرنلڈ کا قول شیلی کے ان جملوں کی آواز باز گشت ہو جو اس نے اپنے دیباچے اور نظم پرامی تھیس ان باونڈ Prometheus Unbound کے آخری حصے میں لکھے ہیں - وہ ہمیں — " اگر یہ کوشش غیر موثر ثابت ہو " ..... اس خلا کے عمیق غار میں ..... عشق اپنے پر بلند کرلیتا ہے" اس کافی طور پر نہ سمجھی ہوئی نظم کے ابتدائی اور آخری اقتباسات کو اس تنقید کے ساتھ ملاکیجیئے کہ شیلی کے کلام میں ایسی جھلکیاں ہیں جیسے کاغذ کاٹنے کے چاقو میں ہوتی ہیں تو پھر کسی ادبی جاسوس یا کسی فریوڈ (Freud) کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ میاتھیو آرنلڈ کی اہم تنقیدی غلطی کو جوڑ کر اس کو واضح کر دکھائے —

(اس میں شک نہیں کہ) شیلی کا پست کلام بھی ہے اور یہ کلام اس کے ہم رتبہ شعرا کے کلام سے شاید مقابلتاً بہت زیادہ ہے - " اسلام کی بغاوت " میں متعدد بند پھس پھسے ' خشک اور معمولی ہیں ' لیکن بلا شک و شبہ اس نظم کی دل کھول کر تعریف کی ہے - ڈاکٹر رچرڈ کارینٹ جیسے اعلیٰ نقاد نے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ انگریزی نظموں میں صرف (Faerie Queen) ہی ایک ایسی نظم ہے جو اس کی موسیقیت کا مقابلہ کرسکتی ہے گو شیلی کی نظم میں عظمت زیادہ ہے - اصل یہ ہے کہ اس زمانے میں شیلی اس نظم کو لکھ ہی نہیں سکتا تھا ' " بغاوت " کو کسی صورت میں فنی اعتبار سے باتوں کی نظم چائلڈ ہرالڈ Child Harold کے بہترین اشعار کے مقابل نہیں رکھا جاسکتا - اس نظم کے بعض اشعار جو

رو من سپاهیوں پر لکھے گئے ھیں بغاوت اسلام کے مکمل بارہ بے ربط ' شکستہ بحر رکھنے والے بندوں سے زیادہ قابل قدر ھیں (لیکن ان لوگوں کے لئے جو طرف داری سے اندھے نہ ھوگئے ھوں) کافی تحقیق کے بعد اس مسئلے سے کوئی اھم اختلاف صرف وھی شخص کرتا ھے جو بائرن کے قدامت پسند نا قدروں میں سے ھو - لیکن شیلی بائرن سے کہیں زیادہ بلند رتبہ شاعر تھا اور یہ بلند ی مرتبت انھی خصوصیات پر مبنی تھی جن پر آرنلڈ نے اپنی آواز باز گشت اور دوسرے نقادوں نے اپنی مذمت کی بنیاد رکھی تھی —

صرف یہی نہیں ھے کہ انھوں نے کوائف نور کے ساتھہ شیلی کی خاص مدھوشانہ دلچسپی پر غور نہیں کیا بلکہ کہیں اس امر پر تنقید نہیں کی کہ مثلاً اس مقام پر جہاں دیگر شعرا " غار سے بہتے ھوے چشموں " کا ذکر کرتے ھیں شیلی بار بار اسی چیز کی تصویر نور کے رنگ میں پیش کرتا ھے اور بتاتا ھے کہ یہ " غار چشموں کی روشنی سے منور تھے " جس سے تھوڑی دیر کے لئے ھی کیوں نہ ھو حسن ازل کی رہانی تجلی کائنات کے کالبد خاکی میں محلول و مغفود معلوم ھوتی ھے - وہ بارھں کو قوس قزح کا لباس اوڑھے ھوے دیکھتا ھے - اس کے نزدیک صبح ' سبز و شاداب کھیتوں کی شبنم کو شفق آلود کرتی ھے اور کہکشاں کی نیلگوں اور دراز آستین اُداس رات کو پر نور بناتی ھے - جہاں دوسرے شاعر کسی میوے کا ذکر کرتے یا پھول کا نام بیان کرتے ھیں وھاں شیلی ایسی شگفتگی دیکھتا ھے جو فضا کی چادر پر رنگا رنگ روشنی کے ستارے ٹانکتی ھو اور " میوں کے چمکدار سنہری فانوس جو اپنے اپنے سبز آسمانوں میں آویزاں ھوں " - وہ شہر وینس کو اس طرح نہیں دیکھتا جس طرح اور شعرا دیکھتے ھیں بلکہ اس کے پیچھے ایسے آفتاب کا طلوع دیکھتا ھے جس کی صورت " حریت کے تخیلی بازو رکھنے والی دیوی " کی ھو ' اور جس کی منور شعاعوں سے شہر ایک ایسی

صورت میں مبدل ہو جاتا ہے جسے وہ —

"ایک روشن تنور کے اندر" موجود ہے جس کے مکان، مینار، گنبد، اور عمارتوں کی قطاریں آگ کے چوکھٹے میں انار کی طرح چمکتے ہیں —

وہ گہرے نیلگوں سمندر کی قربان گاہ سے زمرد یں آسمان تک شعلہ ہائے قربانی کی طرح کانپتے اور جگمگاتے ہیں - شاعر ایک ایسی شبنم کا جلوہ دکھاتا ہے جو ہوا میں معلول شدہ ستارے کی طرح جھلکتی ہو اور در اصل یہی ہوا میں معلول شدہ ستارہ ہے جس سے اس کو خاص دلچسپی ہے - کیوں کہ یہ تمام شعلہ افروزیاں ایک بڑے زبردست شعلے کی نشانیاں ہیں —

"عشق ہو یا نور یا موسیقیت، یا خوشبو، یا اُن سب کی پاک روح جو آسمان سے لطیف شبنم کی طرح ٹپکتی ہے، یا وہ دل جو اپنے اندر کائنات رکھتے ہوئے اس نظم کو مضمون عطا کرتا ہے —

اس کے بعد آخر کار وہ ایک پرسکوں بلور کی طرح شفاف چشمے کے قریب پہنچتا ہے جسمیں ایک مندر یا ایک بستی کا عکس پڑتا ہو جو تصور ربانی کو تکمیل کا جامہ پہنا سکے - یکا یک اس کا شعلۂ تخیل بھڑک اٹھتا ہے، اس کے ہونٹوں پر عالم ارواح کی قربان گاہ کا پاک نور تبسم کرنے لگتا ہے - اور وہ ذکر کرتا ہے —

ملائے اعلیٰ کی ان دلفریب صورتوں کا جن کے ضیائے تبسم سے جو سرو کی طرح شفاف ہے خاموش فضا میں عشق جاوید کی چمک پیدا ہو جاتی ہے -

نظم "اتونی" کی طرح یہ سب نور کی ضیا پاش مسکراہٹیں ہیں - تنقید نگاری نے اس مصوری کے تسلسل کو کھودیا اور اس مقصد کا پتہ نہیں لگایا ہے جو

شیلی کی پیش نہاد خاطر تھا - یہ تغافل شعاری اس وجہ سے عمل میں آئی کہ ہماری تنقید نگاری کبھی فن کارانہ تنقید نگاری نہ رہی جو شاعر کے زاویہ نگاہ سے اس کے کلام کا مطالعہ کرتی ہو - شیلی جیسا کے اس نے اپنی نظم Skylark میں بیان کیا ہے اس قسم کا شاعر ہے جو " تخیل کے نور میں گم ہو " - تنقید نگاری نے کبھی اس امر کو کامل طور پر محسوس نہیں کیا کہ مصور کی طرح شاعر کو بھی رنگ اور جسم کی ایسی ہم آہنگیاں نظر آتی ہیں جو اگرچہ وہ تخیل نہیں ہیں لیکن " تخیل کے نور " سے معمور ہیں - وہ ہم کو نہ کوئی افسانہ سناتی ہیں - نہ ہمارے لئے کوئی پیغام لاتی اور نہ کوئی اخلاقی نظریہ پیش کرتی ہیں اس پر بھی وہ عالمگیر وحدانیت سے تعلق رکھتی بلکہ اس میں غرق ہوجاتی ہیں شیلی کے ابتدائی کلام میں کئی صفحات ایسے ہیں - جس میں وہ اعلیٰ شاعری سے ناکام ہوکر ایک قسم کے زبان جمع خرچ " جیسے اشعار لکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ کئی اور حقیقی عظمت رکھنے والے صفحات بھی ہیں جن کو ناظرین مغالطے سے زبانی جمع خرچ سمجھتے ہیں یہ وہ ناظرین ہیں جو یا تو رنگ اور نور کی ہم آہنگیوں کو ان کی حقیقی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں یا ایک فن کار کی طرح خالص منقش تصاویر اور رنگین نغموں سے فرحت اندوز نہیں ہوتے جو یہ محسوس کرتا ہو کہ یہ فن اور کائنات کے عالمگیر اور عظیم الشان نغموں سے تعلق رکھتے بلکہ ان میں غرق ہوجاتے ہیں، اور ان کے فرم نغمے حسن کامل کے غیر فانی موسیقیت کے ساتھ ایک نازک رشتہ رکھتے ہیں- شیلی نور کے استعمال میں بسا اوقات ان کی فوری تاثیرات کو پیش نظر رکھے ہوئے معلوم ہوتا ہے - مثلاً ایک شبنم آلود برگ گل کی چمک ، بارش کے چشموں میں درخت بلوط کا منعکس ہونا ایک نم اوربھیگے ہوئے غار میں جگنو ، ایک آفتاب کی کرن میں جذب ہونے والی شبنم یا آسمانی بزم چراغاں کے متعلق وہ شاندار اشعار جو Prometheus Unbound میں پائے جاتے ہیں —

دور نظر آنے والے نہاگوں پہاڑ کے اس پار نور پاش سحر کی
شفق آلود عمیق فضا میں ایک سفید ستارے کا الماس
ابھی جگمگا رہا ہے —
شبنم کے اس شگاف سے جس کو ہوا نے پیدا کیا ہے چشمہ اخضر
اس کی تصویر لے رہا ہے - دیکھو اس کی روشنی غائب ہوگئی
لیکن وہ لہروں کے سکون اور فضائے سفید میں لکھائے ابر کے
شعاع انگیز پردے چاک ہوجانے کی وجہ سے پھر چمک اُٹھا - اب
لو اب وہ غائب ہوگیا اور دیکھو پہاڑوں کی ابر آلود چوٹیوں سے
شعاع خورشید کی گلابی کرنیں پھوٹنے اور مرتعش ہونے لگیں -
کیا میں بولیا کے سبز رنگ والے پروں کی وہ سریلی تان نہیں
سن رہا ہوں جو صبح خون افشاں کے لئے پنکھا جھل رہی ہے ؟

لیکن شاعر کے مقصد اور منشا کی حد تک اس قسم کے اشعار کی ایک خاص جگہ ہے اور جب ناظرین اس نور کامل کے چھائے ہوئے تخیل کو جس کی " ضیائے تبسم سے فضائے دو کون منور ہوتی ہے " تسلیم کرلیتا ہے تو یہ بند اگر " تنقید حیات " نہیں تو کم از کم ازلی کار و بار کے روشن مرقعے معلوم ہونے لگتے ہیں - (The witch of atlas) وہ حسین خاتون جو نور اوڑھی ہوی ہے بہن ہے اُس رونق کی جو (Epipsychidion) میں پائی جاتی ہے —

اگر اشعار متذکرہ سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ دنیا کی ساخت خواب شیریں کے اجزا سے ہوی ہے تو یہ ان کی قانون فطرت کے ساتھہ سچی پا بندی کی وجہ ہے - یہ بعض پاک اور نیک ساعتوں میں شاعر کے لئے دولت پیدا کرتے ہیں - کہ وہ ان پر سے اس خواب کی ابرآلود نقاب اُٹھالے اور وہ " تخیل پیش کرے جو تاریک کائنات کے اندر نور کی کرن بنکر دوڑتا ہے —

ہلاس (Hellas)میں شیلی پر اسپرو کی شاندار تقریر کو زیادہ یقینی اور زیادہ پاکیزہ نتیجے کی طرف بڑھاتا ہے - شیلی معصوم فرشتے کی طرح پرسپرو کا ہاتھ پکڑتا ہے اس کو ہوائے لطیف کے خلیج سے جس میں وہ محصور ہوگیا تھا نکال کر ایک مضبوط چٹان پر لا کھڑا کرتا ہے - اُس بڑے ساحر نے (میں شیکسپیر اس لئے نہیں کہتا کہ آگے چل کر اس اس قول کی تردید ہو جاتی ہے) کہا تھا " ہوائے لطیف میں " - لیکن شیلی عمداً شیکسپیر کے نغمۂ شیریں کے سلسلے میں بعض دفعہ خود اس کی ترکیبوں کا اعادہ کرکے اس طرح جواب دیتا ہے —

ما و شما کا ذکر نہ چھیڑ ماضی و مستقبل کو زبان پر نہ لا ؟
بلکہ اس ذات واحد پر نظر رکھہ جس کو تغیر نہیں - وہ ذات
جو غیر فانی اور لم یلد ولم یولد ہے —

فضاے آسمانی اور حیات و نور کے و جزیرے جو سفتش ہوا کے
زمردیں طوفان میں نگینے کی طرح جڑے ہوے ہیں ' وہ گنبد
اخضر جو شور اور بد نظمی کے سنگ بنیاد پر قائم ہے '
جس میں آتش جاودانی کے شعلے بھڑکتے ہیں اور جس کی
حصار ایسی دیوار آہنی بن کو جس میں سے شوخ ترین تخیل
بھی بچ کر نہیں نکل سکتا ان کو اس طرح ہٹا دیتی ہے
جس طرح بحر اطلانتک کے ابر کو ' کاپی ' کی چوٹیاں —

یہ آفتابوں ' دنیاؤں ' انسانوں ' درندوں اور پھولوں کا ایک
" مجموعۂ کل " ایک خواب اور افسانہ ہے - اس کے جتنے
مناظر ہیں وہ ایک چشم بیمار کی نظر فریب صورتیں بلبلے
اور خواب ہیں - تخیل اس کا گہوارہ اور اس کی گور ہے -
ماضی و مستقبل اس تخیل کی ازلی پرواز کے مقابلے میں

صرف چھاوں اور سایہ معلوم ہوتے ہیں - ان تمام کا کوئی وجود
نہیں - نیست اس کا نام ہے جو اپنے آپ کو ہست سمجھتا ہے ' -

یہی وہ تخیل تھا جس کے زور سے شیلی اپنی مختصر نظم " آسمان کے نغمے میں قانون فطرت کے سچے اصول کے ساتھہ تکوین عالم کا ایک صاعقہ زا منظر پیش کر سکا جو اپنی تصوری وسعت اور بلندی کے اعتبار سے فلسفہ اور شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے - یہ ایک ایسی نظم ہے جو ایک خاص اور عجب وجہ سے یعنی شاید یہ کہ وہ ہماری گرد و نواح کی ازلی قوتوں کو محسوس کرنے میں اپنے عہد سے آگے تھی شیلی کے کلام میں وہ خاص درجہ حاصل نہ کر سکتی جسکی وہ مستحق تھی فضائے آسمانی کا وسیع خلا ' زرد رو وقت کی وہ عظیم الشان صدیاں جن پر موجودہ علم ہئیت نے اب غور کرنا شروع کیا ہے تکوین عالم کے اس شاندار مرقع کے سامنے جو شیلی نے اس قطرۂ شبنم کی طرح جو کامل اور شفاف ہو ایک تصویر کی صورت میں پیش کیا ہے ہیچ اور بے اصل ہو جاتی ہیں - اس نظم کا وہ حصہ بھی اسی طرح کامیاب ہے جس میں ناقابل بیان اور ناقابل انکشاف اسرار کی طرف جو اس کائنات کے پس پردہ موجود ہیں کیا گیا ہے شاعر ہم کو ان کا جلوہ اس ناقابل تصور دنیا کے اشارے سے دکھاتا ہے جو سبز نو نہالوں سے بنی ہو اور جس کا ایک پھول اپنے آغوش میں شبنم کے چھوٹے چمکدار سیارہ کو تھان رکھے ہوے اس چمن کے ایک جاودانی عنصر کی حیثیت رکھتا ہو —

اے سقف زر نگار جو ابر سے کھلی ہوی تاروں بھری رات کے
ایوان پر کھینچی ہے '
اے سنہری روشنیوں کی بہشت بریں '
اے وہ عمیق ناقابل پیمایش وسیع ہستی جو ازل سے ابد
تک قائم ہے '

اے قصر جس میں ہستی قیام پذیر ہے
اے مندر ' اے مکان ' اے ہمیشہ سر پر رہنے والے گنبد جس میں
آئندہ سے کار فنا اور زمانہ مستقبل رہتے نہیں -
اے آسمان ! کائنات کی درخشاں صورتیں ' زمین اور زمین کے
متعلقات ' ذی حیات سیارگان جو تیری عمیق وادیوں میں
جوق جوق جمع ہوتے ہیں '
وہ سبز دنیائیں جو فضا پر تیرتی چلی جاتی ہیں
وہ تیز رو ستارے جن کی زلفیں منور ہیں
وہ برف آلود چاند جو بہت سرد اور چمکدار ہیں
وہ زبردست آفتاب جو رات سے دور نہایت تیز روشنی رکھنے
والے اجرام ہیں
یہ سب تیری بدولت حیات حاصل کرتے ہیں
یہ چرخ عنبریں کیا ہے ؟ ایک شبنم کا بلبلا جو ایک تازہ
صبح کو ایسے نرگس میں ٹپکتا ہو جس کی نازک پنکھڑیاں کسی
غیر تصوری دنیا میں کھلتی ہیں ' اس میں آفتاب ستاروں
کی آغوش میں پر سکون ہیں
ناقابل پیمائش محور ان کمزور اور دھندلے سیاروں کے لئے
بنائے گئے ہیں جو ۱۰ ہزار کی تعداد میں جمع ہو کر کانپتے '
جگمگاتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں —

یہ شیپر جنھوں نے اس رفیع الشان آسمانی فضا میں پرواز کی " غیر متاثر" نہ تھے اور نہ ان کی " خلا میں بیکار پر افشانی " تھی - یہاں تو شیلی وہ " آفتاب پیما ہے " جس کی براؤننگ نے عنفوان شباب میں پرستش کی تھی اور اس کی

نظر اس روح ازل پر جمی ہوی تھی جو ساری کائنات کو پرورش اور اُس کو منور کرتا ہے - اس آسمانی پرواز کی عظیم‌الشان ساعتیں اس کی کمزور ساعتیں نہیں بلکہ زور و قوت کی ساعتیں ہیں اور بے شک یہی وہ اوقات ہیں جن سے اس کی شاعری بڑی قدر و منزلت حاصل کرتی ہے - لیکن حیرت کی بات ہے کہ تنقید نگاری (یعنی ہوستانہ بھی) عام طور پر اس کا مخالف پہلو پیش کرتی ہے اور اس آسمانی پرواز کی بے وقعتی اس ماتم سے بھی زیادہ کرتی ہے جو اس کے زمین کی طرف اتر آنے پر کیا گیا ہے —

شیلی اپنی رفیع ترین ساعتوں میں اپنے خدائے نور سے حاصل کی ہوئی یزدانی عظمت کو قریب قریب علی الاعلان ظاہر کر دیتا ہے جس کو تاریخ میں صرف دو یا تین شاعروں نے ظاہر کیا ہے —

میں وہ آنکھ ہوں جس کے ذریعہ کائنات اپنے آپ کو دیکھتی اور
جان لیتی ہے وہ ربانی ہے —

لیکن یہی وہ شاعر ہے جسکے متعلق ہماری بہترین تنقید نگاری کا یہ یقین ہے کہ اس کے پاس عقلی اور منطقی مضامین نہیں ہیں انھیں اوقات میں جبکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے غیر متاثر باز و خلامیں بیکار پر مار رہے ہیں وہ تاریخ کے تقریباً ہر ایک شاعر سے زیادہ خدائے ذوالجلال کی لازوال واحد حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور پیغمبرانہ معجز بیانی اسکے لبوں پر کھیلنے لگتی ہے —

یہ عظیم الشان کائنات اور سیارہ پوش آسمان پھٹ جاتے ہیں
اور میں خوف و دہشت کے ساتھ اوپر اُڑایا جاتا ہوں - یہاں
تک کہ آسمان کے حریم خاص کے پردوں میں سے شعلے نکلنے
لگتے ہیں اور اقنومی کی روح تک ستارے کی طرح لامکاں سے
جہاں روح ازل کا مسکن ہے جگمگا نے لگتی ہے —

ایسی کیفیتوں کے تحت ہم صاف سمجھ جاتے ہیں کہ شیلی کو نور کے ساتھ اسقدر محبت کیوں ہے ؟ اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ (Skylark) والی نظم کا ایک ثلث حصہ کیوں نور کا نغمہ بن جاتا ہے —

(اے چلتدول) ایک شاعر کی طرح ہے جو تخیل کے نور
میں گم ہو ' اور بلا استدعا کے نغمہ پردازیاں کرتا ہو '
یہاں تک کہ دنیا یاس و امید کی ان کیفیتوں سے مدہوش
ہو جاتی ہے جنکی اس سے قبل اس کو پروانہ تھی —

وہ آسمان پر اس طرح پرواز کرتا جاتا ہے جس طرح ایک پرندہ اپنے عالم مستی میں ' اور اپنے نغمے اس نور کامل پر قربان کرتا ہے جس کی طرف شیلی سے بھی زیادہ پر عظمت اس شاعر نے توجہ کی جس کی آنکھیں ان کم درجہ کی روشنیوں کو جو ہمارے لیل و نہار پر حکمراں ہیں دیکھنے سے محروم ہو گئی تھیں - اپنے نابینا ہونے کے باوجود بھی ملٹن نے اپنی پاک نظموں میں ان کی مقدس سرائی ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ نور اعظم کی معصوم جھلکیاں دیکھیں اور ان میں جلوہ یزدانی کا رنگ موجود ہے - وہ لکھتا ہے ——

آ - خوشی سے آ - اے وہ متبرک نور جو ایسے آسمان کا جگر
گوشہ ہے جس کی پیدائش تکوین عالم سے پہلے ہوئی ہے اے روح
ازل کے لخت جگر ' اے نور ' تو وہ شعاع ہے جو ازل کی ہمکنار
ہے ' کیا میں بلاخوف و خطر یہ کہہ سکتا ہوں کہ چوں کہ خدا
ابھی نور ہے اور ازل کے اس قصر متجلی میں رہتا ہے جس تک
کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی ' وہ تجھ میں بھی
جلوہ گر ہے —

شیلی کے سوائے کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کو کائنات سے خدا کا لہرا تا

ہوا ایسا ملبوس زریں نظر آتی ہے جو اپنے اندرورنی نور سے جگمگاتا ہو (Prometheus Unbound) میں کئی صفحات کے بعد ایسے ہیں جس کی ہر ترکیب بالواسطہ یا بلاواسطہ تخیل ربانی سے منور ہے آفتاب آسمان کا عکس فگن ہے ' وہ بلبلے تک بھی جن کو آفتاب کی ساحری شعاعیں جھیل کی سطح پر تیرنے والے پھولوں کے آغوش سے جذب کرتی ہے ایسے طاقہائے زریں کا منظر پیش کرتے ہیں جس میں روحیں رہ سکتی اور سبز سنہری فضا میں تیر سکتی ہیں - یہ فضا اس بہشتی دھوپ سے چمک اٹھتی ہے جو ہماری دنیوی زندگی کے گنجان جنگلوں اور پتوں میں بھی چھن کر گزرتی ہے - "ایشیا کہتی ہے - اے زمین تو کس قدر بارونق ہے —

اور اگر تو اس سے بھی زیادہ حسین روح کی ایک تصویر ہے
جس کو شرکی حکمرانی نے بد زیب کیا ہو ' حالانکہ اس کو
اپنی کائنات کی طرح نازک لیکن خوبصورت رہنا چاہیے تھا
تو میں تجھے اور اس کو سجدہ کرتی ہوں اور تم دونوں کی
پرستش کرتی ہوں -

وہ مرغزار جس میں ہلکی ہلکی شفق پھولی ہو ' وہ غار جس
میں چشمے نور افشانی کرتے ہوں ' وہ سیال گھرجو ہوا کے
طلسم کی گرفتار ہو ' - اور وہ بلندی پر نظر آنے والی شکاف
پہاڑوں کی چوٹیاں ' سب ملکر پھلوزدہ آفتاب آشام شعاعوں سے
جلوۂ سحر کو اس طرح پھیلاتے ہیں جس طرح آسمان پر اٹھائے
ہوے سمندر (یعنی ابر) کا جگمگاتا ہوا کف فضا میں چراغ
کی طرح ٹمٹماتے ہوے قطروں کی درافشانی کرتا ہے —

یہ کف اپنی اندرونی آگ سے جلتا ہے - اس کے جواب میں " پرامی تھیس " خود "ایشیا کو ان الفاظ میں مخاطب کرتی ہے —

اے نور زندگانی، اے فقط مشہود حسن کی تصویر —

اب ان لوگوں کے لئے جو اس پر بھی ایک زیادہ حقیقی منزل، چمکدار بازؤں کی پرافشانی کے لئے ایک زیادہ ٹھوس فضا، اس کے نغمہ ہائے نور کے ایک زیادہ صاف مفہوم کے طلبگار ہیں شیلی کی ان دو روحوں کے الفاظ پیش کئے جاسکتے ہیں جب کہ ایونی (Aone) اور پیانتھیا (Panthea) نے اپنے نہانے والے پروں کو جن کا رنگ آسمانی، نارنجی اور سبز ہو کر سنہری میں مبدل ہوجاتا ہے دیکھا تھا، ان کے ہلکے تبسم نے فضا کو ایک ستارے کے شعلے کی طرح منور کیا تھا، اور "پیا نہتیا" کے سوال کرنے پر انہوں نے جواب دیا تھا —

کیا تونے عشق کی شکل و صورت دیکھی ہے ؟

اگر کوئی شاعر دنیا میں اپنا کوئی حقیقی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا تو وہ شیلی تھا - اور یہ مقصد تھا انقلاب پیدا کرنا - لیکن اس انقلاب میں آج کل کی سستی اور آسان بغاوت کے عناصر، یا نور کے معصوم پرستاروں کے خلاف پاک بازوں کی فتنہ انگیز بغاوت، یا روح انسانی کی پرستاری اور اس کے آرٹ اور لٹریچر کی اعلیٰ ترین بلند پروازیوں کے خلاف دنیا، انسان، اور شیاطین کی مجنونانہ بغاوت کے عناصر شامل نہ تھے - اس میں اس جھوٹی بغاوت کے اجزا (جو آج کل "فیشن" میں داخل ہو گئی ہے اور جس کی سر پرستی انقلاب انگیز ہریس حریت کے پاک نام پر کر رہا ہے تاکہ اصل جگڑا پس پشت ہو جائے، اور سچے انقلاب انگیزوں کا اندھیرے میں گلا گھت جائے" بھی شامل نہ تھے - اس کی بغاوت خود اس دنیا کے طرز عمل کے خلاف تھی جو اصطلاح کی عام تبدیلیوں کی روشنی میں "بغاوت" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے - اس کی بغاوت فیشن کی موافقت میں نہیں بلکہ اس کی مخالفت میں تھی، اس کا یہ مقصد تھا کہ وہ کائنات کے کالبد خاکی میں روحانی نور دوڑا دے اور اس حسن ازل کا انکشاف کرے جو اس کو خلق کرتی،

قائم رکھتی اور ابر کی طرح چمکدار بناتی ہے - اس نے نور کی دنیا کی سیاہ نقاب کے پیچھے ورتس ورتھ سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ دیکھا ' اس نے ایسی " روح " کا پتہ لگایا جو " تخیل اور شعور کے تمام اجسام اور ان کے موضوعات کی محرک ہے " —

یہ وہی قوت ' یہ وہی ذات حی‌القیوم ہے جس کو شاعر Ode to the West Wind میں پکارتا ہے - وہ اس ہوا ' اس صحرائی آسمانی تنفس کو اس پوشیدہ ' غیر محدود روحانی قوت کی ایک نشانی بناتا ہے جو زمین ' آسمان ' دریا اور خود اس کی روح میں جاگزیں اور متحرک ہے - اس تنفس کی حرکت اور چلنے سے مادی کائنات شفات ہو جاتی ہے - بحر اطلانتک کی مسطح قوتیں توڑ دی جاتی ہیں اور اقوام دنیا کو انقلاب اور تجدید زندگی کا پیغام پہنچا کر اس کو خواب غفلت سے جگایا جاتا ہے یہ روح سمندر کے سینے پر رہتی ہیں - زمانۂ قدیم کی طرح لفظ " کن " کی تفسیر یہ ہے کہ " اس میں نور پھیلا دیا جاے " —

اس روح کی مشعل راہ بننا ' اگرچہ وہ پیغام جس کا وہ حامل ہے اس کے لئے بہت گراں ہے ' ایک " غیر متاثر فرشتہ " بننا نہیں ہے - اپنے سلسلے کے وہ شاعر زیادہ خوش قسمت ہیں جن کی آنکھوں اور اس نور کے درمیان جس کو نہ کوئی دیکھ سکتا اور نہ اس پر زندہ رہ سکتا ہے ایک زیادہ کثیف اور تاریک پردہ پڑا ہوا ہے ! - یہ نہیں ہے کہ شیلی کی‌شاعری کی دیوی ایک " پروانہ" ہونے کی وجہ سے دنیا کی سطح سے بلند و بالا پرواز کر سکی - وہ نور جس تک اس کے پروں نے پرواز کی ایک نور کامل تھا - شیلی اپنی دنیوی زندگی کی حد تک (جو اس شاعری میں پائی جاتی ہے) نا کامیاب رہا ' وہ اپنی مادی اور دنیاوی گردشوں میں حیران رہا ' پریشان ہو گیا ' اور کہیں خود اپنی مخالفت آپ کی ' لیکن اس لئے کی کہ وہ اپنے قریب تر ان دنیا اور اپنے تصور کامل میں

ہم آہنگی نہ پیدا کرسکا - ہم میاتوپو آرناڈ کے فیصلے کے ساتھ قطعاً متفق ہوں کہ شیلی کے اطوار ایک خاص طبقہ تھا اور اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے شیلی کو اپنی نا معقول حرکتوں سے قابل الزام قرار دیا - یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حرکتوں میں سے چند حرکتیں ' مثلاً اس کا وہ خط لکھنا جس میں " ہیاریٹ وسٹ " کو اپنے اور " میری گاڈون " کے ہمراہ سفر کرنے کی دعوت دی گئی ہے) ایسی غیر اصولی ' اندھی اور انسانی فطرت کے مذاق سلیم کے خلاف تھیں - کہ خصوصاً اس انسان کی حد تک جو غیر معمولی طور پر صاحب ہوش و خرد تھا ان سے اُس کے طرز زندگی کی بڑی ناکامی ثابت ہوتی ہے - اگر اس کی جودت طبع اور پختہ ہوتی تو وہ خود اپنی ہستی کے قوانین پر پورا قابو حاصل کر سکتا تھا' لیکن صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کی موت قدرے قبل از وقت واقع ہوئی اور جب وہ سلطنت فور کی سیاحتوں سے زمین کی طرف واپس ہوا تو اس کی نظر دنیا کی خشک اور غیر مہذب طرز روش پر پڑی نہ تھی اور نہ اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ جما تھا - ایسی صورت میں جس چیز کو غیر متاثر قرار دینا چاہئے وہ اس کا زمین پر ٹھوکر کھانا ہے نہ کہ آسمان کی طرف شاندار پرواز کرنا - اس زمانے میں جب کہ ایمان ملتوں میں ضم ہوگیا تھا ' اس نے مشکل اور آسان راستوں میں اپنا ایک خاص راستہ اختیار کیا ' اس نے وہ راہ نہ لی جو ایک بدکار ' ظالم اور مغموم انسان کی ہے بلکہ وہ جو آسمانوں کا مشکل زینہ ہے اور جہاں سے اس نے ایک یزدانی ساعت کی پہلی جھلکیاں دیکھی تھیں - پادریوں اور پیغمبروں کی کم نہ ہونے والی نزع میں اس نے پیغمبروں کی طرفداری کی - اس نے ایسے غیر مختتم مناقشے میں جو ایک طرف خواب دیکھنے والوں کے درمیان جن کا خیال ہے کہ اس کائنات کے پس پردہ کچھ نہیں ہے ' اور دوسری طرف ان ایمان والوں میں جو یقین رکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے سب کچھ ہے چلا آرہا تھا - اس نے ایمان والوں

کا ساتھہ دیا - ان لوگوں کی کش مکش میں جو مذہب اور سائنس کے اس ابتدائی اصول پر یقین رکھتے ہیں - کہ کمیت سے کثرت نہیں پیدا ہوسکتی ' اور ان جاہلوں میں جو سچے عشق کو باد و خاک میں ملادیتے ہیں موجود ہے اس نے یقین رکھنے والوں کا ساتھہ دیا - ان فرقوں کی ایک طویل جنگ میں جن میں سے ایک کا خیال ہے کہ اس منظم اور مستحکم کائنات کی ابتدا محض ایک اتفاق ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ اس کا خالق خدا ہے' شیلی نے ایسا جوشیلا اور کامل مذہب اختیار کیا جس کو ملٹن کے بعد کسی نے اس زور کے ساتھہ ظاہر نہیں کیا ہے - اس مذہب کی روح ایک متاخر شاعر میزینی (Mazzini) کی قول جس کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے - " خدا مکین ' منصف اور نیک ہے ' فرض شناسی ان تھک کوشش کی ترغیب دیتی ہے اور غیر محدود ترقی کا ثمر حاصل کرتی ہے - اور روح عروج پذیر سینوں میں سے گزر کر خداوند تعالیٰ کی وحدانیت تک پہنچ جاتی ہے جو سرحد ادراک سے پرے ہے " —

میں سمجھتا ہوں کہ اس شک کا جو " فرانسس تھامپسن " نے اپنے شیلی والے مضمون میں ظاہر کیا ہے یہی جواب ہوسکتا ہے - اس میں وہ نفیس اور خوبصورت جملے جو ایک تاریخی مذہب کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں شیلی کی بجائے زیادہ تر ان کے مصنف ہی پر روشنی ڈالتے ہیں یہ شیلی نہیں ہے جس کے نزدیک کائنات ایک کھلونے کا صندوق ہے - یہ شیلی نہیں ہے جو ستاروں میں ٹھوکریں کھاکر زور الفوز گرد و غبار اڑاتا ہے بلکہ یہ جملے خود "فرانسس تھامپسن" کی مصوری پر صادق آتے ہیں —

جیسا کہ میں نے شیلی کی " ابر " والی نظم پر تبصرہ کرتے ہوے کہا وہ قوانین اور اصول فطرت کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کو ایک سائنٹفک Ariel کی صنعت ایجاز کے ساتھہ اس نے قلمبند بھی کیا ہے لیکن " تھامپسن " شیلی کے

متعلق ,,غم آگیں مشرب ہمہ اوست کی حیات جاوید اور اس کے ناقابل اظہار افسردہ بیان کا ذکر کرتا ہے —

وہ اس دلکشی کا جز ہے جس کو اس نے ایک دفعہ زیادہ دلکش بنا یا تھا —

اس کے بعد وہ لکھتا ہے ۔ " وہ عذاب کی کونسی عمیق ترین گہرائی ہے جس کو اس حیات جاوید سے تسکین پہنچتی ہے ؟ ۔ وہ حیات جاوید جو تم کو موت یا قدرت کے شکم میں ڈھکیلتی ہے تاکہ تمہارے تحلیل شدہ اجزا اس کی رگوں میں گردش کرتے رہیں - اس تسکین کے باریک پردے میں سے مشرب ہمہ اوست کیوں غم واندوں کی آہ و زاریوں کو سنتا ہے " ؟

لیکن یہ نہ صرف شیلی کے مشرب ہمہ اوست " کی غلط فہمی بلکہ خود اپنے مذہب کے اعلیٰ ترین فلسفے کی غلط فہمی ہے - اور یہ اس وجہ سے واقع ہوی کہ ان بلند مناظر تصور تک جہاں شاعر اپنی خاص حالتوں میں مجموعہ کائنات کے درخشاں نور " میں گرفتار ہوجاتا ہے محض عقل کے زور سے پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ نا ممکن ہے ۔ ' فرانسس تھامپسن ' نے اپنے مضمون میں اس شاندار تصور —

وہ نور جس کی ضیاے تبسم سے فضاے دو کون منور ہوتی ہے '

وہ حسن جو کائنات کی ابتدا اور تنظیم کا سر چشمہ ہے

اور خدا کے اس ابتدائی تصور میں " جس میں ہم زندہ رہتے ' حرکت کرتے اور اپنا وجود حاصل کرتے ہیں " کوئی مشابہت نہیں دیکھی ' اس یزدانی فلسفے میں وہ امن و سکون جو تمام فہم و ادراک سے بالا تر ہے ایک خاموشی یا ایک خواب کی موہوم صورت میں موجود نہیں ہے بلکہ وہ ایک کامل ہم آہنگی اور موسیقیت ہے جو ہر ایک سر کو واضح ہے کرتی ' اس کو پورا پورا ادا کرتی

اور اس کو تنزل نہیں بلکہ ترقی عطا کر کے اپنا جیسا بنا لیتی ہے - " حساس پودے " کے گلستان میں جو آوازیں ' خوشبوئیں اور روشنیاں ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھہ ربط و تعلق میں مخلوط ہو کر الجھہ نہیں گئی ہیں ' ان کی اصلی صورتیں مٹی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی اجتماعیت میں زیادہ حقیقی اور واضح ہو گئی ہیں - وحدت و کثرت کے مکمل نغموں میں وہ اس طرح بہتی ہیں جس طرح ایک واحد چشمے کی سریلی آوازیں - بہر حال یہ طریقہ انفرادیت کا درجہ گھٹانے سے نہیں بلکہ اُن کو ہم آہنگ بنانے سے متعلق ہے —

یہ ضروری ہے کہ اس موسیقانہ فلسفے کو اصولاً پیش کرنے میں بد ترتیبی اور تضاد ہو کیونکہ اس کے کامل اور مصدقہ تشریح کے لئے ازلی سر گم کے ہر سر کو چھیڑنا پڑے گا - لیکن اصل یہ ہے کہ ہم صرف چند چیدہ سروں ہی کو چھیڑنے پر قادر ہیں جس طرح کہ براؤننگ نے اپنی نظم " ریشم بننے والے " میں چھیڑا ہے- چنڈول آسمان پر اُڑ رہا ہے ' گھونگا اپنی سیپی پر بیٹھا ہے ' اور اللہ آسمان میں موجود ہے " - اس چھوٹی سی نظم کے منطقی سلسلے میں جو کڑیاں چھوٹ گئی ہیں اس لئے کہ وہ ایک برق پیما منطق کا مظاہرہ ہے جس کی ہر جست میں زبردست غار چھوٹ جاتے ہیں دنیا کے جملہ بقیہ واقعات ہیں اور یاد رکھنا چاہئے کہ یہ شاعری ہی کی آگ ہے جو ان عمیق غاروں پر جست کرسکتی ہے ' لیکن اس کی آمد اور اس کی صداقتیں قلب و روح کے اندرونی تجربے پر منحصر ہیں —

ہلاس (Hellas) کے مصنف کا جو ایمان تھا اس کو منطقی طور پر نثر کی صورت میں جس شخص نے وسعت دی اور عمل کے ذریعے اس کی توثیق کی وہ اطالیہ کا " نجات دہندہ " تھا - " ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری تخلیق کر کے ہم کو یاد کیا ' اور اللہ کی یاد کبھی نہ کمزور ہو سکتی ہے اور جھوٹی - دلربائی جیسا ہم کہ سمجھتے ہیں ایک جوہر یا قابلیت ہے جو تصور کو

بتدریج سلموس کرنے کے لئے عطا ہوی ہے - اور جس چیز سے ہماری روح کا غیر فانی اصطباغ ہوا ہے وہ خدا وند تعالیٰ کا قانون ترقی ہے " —

یہ کلیہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ جملہ فلسفے چونکہ وہ صداقت کے قریب پہنچتے ہیں ایک دوسرے کے بھی قریب ہونے چاہیئں ' لیکن تعجب ہے کہ فیلسوف اِس کلیہ پر عمل نہیں کرتے ورنہ دیکھا جائے تو اُن کی آرائے مُتفقہ کی ایک سیدھی سادھی یاداشت ہماری پریشان دنیا کے لئے اُن کے آرائے مختلفہ سے زیادہ تشفی بخش ثابت ہوتی ہے " جو غور کرتے اور غور کرنے کو اپنا مقصد بناتے ہیں " - اگر وہ تین جملے جو ادھر مندرج ہوئے واضح کئے جائیں اور اُن کے روابط و مفاہیم کی جانچ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن کے مطلب و معنی کا انحصار اِن محدود صداقتوں پر ہے جو اعلیٰ ترین تاریخی مذاہب کے بعض پر مغز نظریات سے ما خوذ ہیں - اسی طرح شیلی کی نور والی شاعری اپنے کامل معنی اور کامل حسن میں اُس خیال کی کامل صداقت پر مُنحصر ہے جو ایک مقولے میں ظاہر کیا گیا ہے اور خیال رہے کہ یہ جملہ بشریت کے اعتبار سے زیادہ جرات آمیز ' اور اپنی یزدانیت کے اعتبار سے زیادہ سادہ اور دلفریب ہے اُن تمام جملوں سے جوکسی انسانی لب نے ادا کئے ہوں —— " میں ساری کائنات کا نور ہوں —

ہم نے اعلیٰ تنقید کےمتعلق بہت کچھہ سنا ہے ' اب ضرورت ہے کہ اِس قسم کے اِعلانات کے لئے اِس سے زیادہ اعلیٰ تنقید استعمال کی جائے - اِس استعمال کا نتیجہ یہ ہوگاکہ ہماری موجودہ روحانی زندگی کی قبر کی کڑیاں اُلٹ دی جائیں گی اور فرشتوں کا انکشاف ہوگا - اور اگر صرف معیار شاعری کے مطابق اِس کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے اِعلانات کے مقابلے میں اعظم ترین شعرا کے اعلیٰ ترین خیالات اِس طرح سوکھہ جاتے ہیں جس طرح آفتاب کی تمازت سے ایک پتنگا- لیکن وہ حسن کامل ہے جس کا شیلی اپنی نظم (Prometheus Unbound)

میں کرتا ہے —

ایشیاء - عشق نور کی طرح عام اور وسیع ہے اور اس کی مانوس
آواز ابد تک نا گوار نہیں معلوم ہوتی —
اس وسیع آسمان اور اُس عالمگیر ہوا کی طرح وہ نہنگ کو
خدا کے مقابل بناتا ہے —

پھانتھیا — سن ' غیب سے روحوں کی صدا آرہی ہے —
ایک آواز ہوا میں گاتی ہوئی اے نور کے معصوم لڑکے' تیرے اعضا اس نقاب اور
پردے سے جو اُن کو چھپائے ہوئے ہیں اس طرح جل رہی ہیں جس
طرح سحر کی کرنیں ابر کے ٹکڑوں میں جو ابھی
منتشر نہ ہوئے ہوں ' اور یہ بھترین ربانی فضا جس جگہ بھی
تو چمکے تجھے چادر میں ڈھانپ لیتی ہے —

Prometheus کے آخری شاندار باب میں جو موسیقی پائی جاتی ہے وہ اسی تصور اور تخیل کا الہامی نتیجہ معلوم ہوتی ہے ' اس موسیقی میں Ariel اور (Comus) والی خادم روح کے شیریں ترین نغموں کی جھنکار ہے - اُن کو شاعر نے ایک وسیع کونیاتی موسیقی کی پرواز عطا کی ہے جس میں روح انسانی کا کائنات کی ایسی کامل ترین آزادی حاصل کرتی ہو جو اِس سے قبل نہ تو کہیں پائی گئی اور نہ کسی کے سمجھ میں آئی ابتدا سے آخر تک یہ نظم نور کی نظم ہے پر یہ نور شیلی کے لئے وہی معنی رکھتا ہے جو بعض دوسرے شاعروں کے لئے سمندر رکھتا تھا - یعنی روح ازل کی نشانی - بعض وقت وہ اس کے حسن ظاہری پر نظر رکھتا ہے جس طرح دوسرے شاعر ایک پانی کی لہر یا شگن پر ' یا موج کے جزر و مد پر رکھتی ہیں اور بعض وقت وہ اُس کو تصویری حسن کے ساتھ استعمال کرتا ہے جو ایک نظر " ریا فیل " کے ماقبل مصورین کے نفیس ترین تخیلات

کی ابتدا اور انتہا معلوم ہوتا ہے ۔ (Prometheus Unbound) کے اِس ایکٹ میں (Panthea) کی تقریر ایک " بلند منزل دریچہ " ہے جو نقش و نگار سے مُزین کیا گیا ہو تاکہ وہ کائنات کے آئندہ کلیسا کے لئے کام آئے —

جنگل کی اس سمت سے ایک ستارہ زور کے ساتھ چلا آرہا ہے جس کی گردش میں طوفانی ہوا کا نغمہ شیرین پایا جاتا ہے - یہ ستارہ کئی ہزار ستاروں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے یہ کانچ کے قلعے کی طرح ٹھوس ہے لیکن اُس میں سے فضائے خالی کا نور اور نغموں کا دریا بہہ رہا ہے - کاسنی ' آسمانی ' سفید ' سبز اور سنہری رنگ کے بےشمار ستارے اور دس ہزار منور ایک دوسرے میں مخلوط اور مرتسم نظر آتے ہیں - اِن کی درمیانی خلا میں نالابل قیاس کئی اور ہستیاں ہیں ایک قوسی گردش کے ساتھ یہ عظیم الشان منور شفاف ندی کو ایک آسمانی رنگ کی شبنم میں جو نور کی طرح عنصری اجزا رکھتی ہے پیس دیتا ہے —

خود دو پہولوں کی صحرائی خوشبو ' نئی حیات سبزے اور ہوا کی سریلی تانیں ' گلستان درختوں میں سے چھننے والی شعاعوں کی زمردیں روشنی ' جو اس ستارے کی تیز لیکن پر کوشش رفتار کے اطراف ہالہ کئے ہوئے ہے ایک ہوائی ٹھوس سے معلوم ہوتی ہے جس سے روح بھی مدہوش ہوجاتی ہے - اس منظر میں موسیٰ ہاتھوں کا تکیہ بنائے ہوئے اور اپنے کاکل مشکمی بچھا کر زمین کی نیچی اس بھیگی کی طرح سوکھی ہے جو اپنے کھونٹے کو سے ٹیک جاتا ہے - یہ تکیہ اس کے ناک

ہونٹ ہل رہے ہوں جس طرح کوئی عاشق اپنے معشوق کو
نیند کی حالت میں یاد کرتا ہے اور اُن پر اس کے ضیاپاش
تبسم کی رنگ برنگی جھلکیاں نظر آتی ہوں —

اِس بند میں شاعر نے وحدت میں کثرت کے اِس خیال کو جو ایک " چشمے کی نغمہ اندوز روایتوں کی طرح " " حسابر پودے " اور " آسمان کے گیت " میں منکشف ہوا تھا زیادہ تصوری رفاقت کے ساتھ بیان کیا ہے - اُس نے سیارے کے اندر سیارے کی مصوری کو کسی اور مقام پر بھی اِس لئے استعمال کیا ہے کہ قبل از قبل "فرانسس تھامپسن" کے اِس اعتراض کا جو " انفرادیت کو مشرب ہمہ اُوست میں فنا کردینے " کے خلاف عاید کیا گیا ہے جواب دے سکے - لیکن یہ خیال آرائی محض اصول آرائش کے لئے تھی - اپنی اعلیٰ ترین کیفیتوں میں شیلی اس قوت کا آلہ کار بن جاتا ہے جو اس سے بالا تر ہے اور یہ تخلیقی اشارہ " نور پیدا کیا جائے " اُس کے لبوں سے ادا ہو کر کائنات کی نئی صورت بدل دیتا ہے - دنیا کے کالبد خاکی میں سے عشق کی روشنی چھن کر انسان کو ایک " ایسی مکمل اور شاہانہ روح بنا دیتی ہے جس کے اندر کئی اور حسن پوشیدہ ہوں " —

عالم کی جملہ ہستیاں اس کی قوت کو تسلیم کرتی ہیں
اس کے خواب مائے شیریں ' رنگ اور مرمر کے سرد اجسام سے
بھی گزر جاتے ہیں — یہ وہ ریشمی دھاگے ہیں جن سے ماں اپنے
نور نظر کے کپڑے بنتی ہے —

زبان ایک دوامی پیغمبرانہ راگ ہے جو بے شکل و بے جان
خیالات اور اشکال کے مجمع کثیر پر ایک موسیقانہ
حکمرانی کرتی ہے —

چوتھی اس کی خادمہ ہے - آسمان بحر ذخار اپنے ستاروں کو

اس کی آنکھوں پر قربان کرتا ہے جو جانوروں کے گلوں کی طرح
اس کے سامنے شکار ہوتے اور گذر جاتے ہیں —
طوفان اس شہ سوار کا گھوڑا ہے اور وہ ہوا پر قدم رکھتا
جاتا ہے ۔ غار اپنی گہرائی کے منکشف ہوجانے پر پکارتا ہے ۔
اے آسمان اگر تیرے پاس کچھ اسرار ہیں تو عطا کر ۔ انسان
نے مجھے بے نقاب کردیا ' اب میرے پاس کچھ نہیں —

اس بند میں " ابر " والی نظم کی طرح (جو ایک سادہ نظم ہے) کائنات کے باضابطہ قوانین کی پابندی کا احساس پایا جاتا ہے اور سائنٹفک وسعت نظر کی طرف چند اشارے بھی ہیں جو اس کی پیغمبرانہ نظم کو قوت اور پختگی عطا کرتے ہیں ۔اس شاعر کے شہپر بے انتہا پر تاثیر ہیں اور اب ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ گزشتہ تنقیدوں کی نظر ثانی کی جائے ۔ صرف ایک جملے کی سحر انگیزی سے اُن کی توثیق نہیں کی جا سکتی اس قسم کی غیرفانی شاعرانہ قوت موجودہ نسل کے دماغ و قلب کے لئے بے انتہا فائدہ بخش ہے ۔ ذرا اس کے چمکدار بازو کو پر افشانی کرنے دو اور معلوم ہوگا کہ اُن کی کوشش بیکار نہ جائے گی ۔ " پرامی تھیس " کا آخری بند آرنلڈ کے قول کا ایک عجیب اور مکمل جواب قبل از قبل ادا کر دیتا ہے اور اس بند کے آخری پانچ شعر شیلی کے کلام کی اس اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں جو موجودہ زمانے کے اعتبار سے اِن میں پائی جاتی ہے —

عشق بیدار قلب میں رہنے والا عشق اپنی مستقل قوت کے بارعب
تخت سے ' تحمل و برداشت کے تکلیف دہ آخری لمحوں '
سے کرب و اضطراب کی پھسلواں بلند اور نوکدار چوٹیوں سے ' جست
کرتا اور دنیا کو اپنے شفا بخش شہپروں میں چھپالیتا ہے —

شیلی کی پر نور روح کو آواز دیتے ہوئے براونگ نے اپنی ابتدائی نظموں

میں کہا تھا - " اے آفتاب پیما ' میں خداوند تعالے اور حق پر ایمان رکھتا ہوں " - حیرت کی بات ہے کہ کم عمر آنکھوں نے کم از کم اس ایک چیز میں ان آنکھوں سے زیادہ نور دیکھا جو پختہ اور تجربہ کار ہوچکی ہیں - تھامپسن نے شیلی کے جذبۂ امید کو ایک بیکار جذبہ امید" سے تعبیر کیا ہے جو یاس کا مترادف ہے- براوننگ نے اس نکتے کو زیادہ صفائی کے ساتھہ دیکھا اور اُس نے بالکل اس کا مخالف پہلو پیش کیا —

جس طرح کوئی شخص موت کے منھہ سے اتفاقاً بچ کر اپنے
دوستوں کی جماعت کے ساتھہ پیوست ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا
ہے کہ وہ حقیقت میں زندہ ہے ' اسی طرح میں تجھہ پر
بھروسہ کرتا ہوں - تجھہ کو ہمیشہ میرے ساتھہ خصوصاً اس
اس تاریکی میں جس کے پیدا ہونے کا امکان ہے رہنا چاہئے
بالخصوص اس وقت جب کہ میں دنیا سے گذر جاؤں --

ہماری زندگی کے کثیف تنازعات کے بعد کیا انسان اس سے زیادہ امید کی پاک روشنی حاصل کرسکتا ہے جس کو شیلی نے (Hellas) کے آخری بند میں آئندہ دنیا کے تصور کا آئینہ بتایا ہے ؟ با وجود اس کے کہ ان خیالات " کو ایام جہالت " اور فرسودہ ملت کے اعتقادات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیا طوفان کے بعد حسین کامل کی سنہری خاموشی سحاب کائنات کے پس پردہ چمکنے والی خوبصورت روشن کا انکشاف اللہ تعالی کی دنیا نشین ساختاروں کے ذہولناکی مظاہرے نہیں ہیں ؟ کیا اس نظم کی آخری دعا خود ہماری نسل کی وہ دعا نہیں ہے جس کی اس کو بے حد ضرورت ہے ؟ —

دنیا کی عمر ہزار ارسر نو شروع ہوتی ہے - عہدزریں اور
سالہائے نو واپس آرہے ہیں ' زمین اپنی سرما کی کنپھلیاں
اتار کر سانپ کی طرح جشم بدل رہی ہے - آسمانی مسکرا رہا ہے

اور سلطنتوں اور انسان ایک بھولے ہوئے خواب کی یاد کا رہین
بن کر چمک رہے ہیں ہاں ٹھہرنا کیا نفرت اور موت واپس
آ ے گی ؟ ہاں کیا انسانوں کا اسی طرح قتل و خون ہوگا ؟ ذرا ٹھہرنا
پیشین گوئی کے تلخ پیالے کا قطرہ قطرہ پی نہ جاؤ۔ دنیا ، گذشتہ
واقعات سے بیزار ہوچکی ہے -

ادب میں ایسے پر تاثیر مقام شاذ ہیں جہاں شاعر ایک شاندار تخیل سے گریز کرکے ایک پرسوز رنج اور بے چینی کے ساتھہ پکار اٹھا ہے " ذرا ٹھہرنا"۔ میاتھیو آرنلڈ کے اس خوبصورت اور عجیب لیکن مغالطہ آمیز جملے کا جواب جس میں اس نے پرافشانی کرتے ہوئے شہپروں کا ذکر کیا ہے خود شیلی کے الفاظ سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں دے سکتی - " رات کی تاریکی سے بلند و بالا اُڑ جانا " کوئی بیکار فعل نہیں ہے- وہ نظم شیلی کی ایسی سچی نظم ہے جیسی کیٹس کی متعلقہ نظم -شیلی کے ساتھہ اسکا اطلاق اس لئے زیادہ صادق ہے کہ اس نظم کی پاکیزہ نزاکت اُس نوجوان شاعر یعنی کیٹس کے لئے استعمال کی گئی ہے جو زیادہ شدت کے ساتھہ، نفرت، الزام اور تکلیف رسانی کے عذاب کا نشانہ بنایا گیا تھا - ہماری اس عجیب سرزمین میں ہماری تاریخ ادب کے نہایت درخشان ہستیوں کے ایک کثیر حصے کو ایک قسم کے جنون حیات میں مبتلا سمجھا جاتا ہے اور موت کی قلمرو میں اُن کو قابل نفرین قرار دیا جاتا ہے ، لیکن کم از کم ایک الزام کے خلاف شیلی نے خود اپنی حفاظت آپ کرلی ہے ، اور یہ فعل اس سے ایک دوسرے شاعر کی طرفداری میں غیرشعوری طور پر سرزد ہوگیا ہے - انگریز نقادوں کے بہت سچے اور صاف نقاد شیریڈن اور فور کے مجسم پرستار یعنی آرنلڈ کو شیلی کے چمکدار شہپر خلامیں بیکار پرمارتے ہوے نظر آرہے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے اس کا قبل از قبل جواب اس کا وہ یزدانی تبسم ہے جس میں چمکدار شیرینی اور آسمانی نور جلوہ گر ہیں - غور طلب امر یہ

ہے کہ کیا کہیں وہ غار جس میں ایک ایسی اصلی حقیقت جس کا شیلی نے اپنی نظم (Adonais) میں انکشاف کیا ہے - موجود ہو غار کہلایا جاسکتا ہے ؟ اور کیا کسی فانی یا غیرفانی شہپر ون کو قیام اور پناہ اس یزدانی قوت سے زیادہ کہیں اور مل سکتی ہے جس نے اپنی ملک کو اپنے پاس بلالیا ہے ؟ - وہ یزدانی قوت جس کی غیر مختتم محبت دنیا کو زندہ اور متحرک رکھتی ہے —

وہ نور جس کی ضیائے تبسم سے فضائے دو کون منور ہوتی ہے
وہ حسن جو ہر چیز کی ابتدا اور تنظیم کا سر چشمہ ہے —

انفرادیت کی ترقی مدعائے تعلیم قرار دی جائے

از

جناب محمد مرغوب الدین صاحب بی - اے - بی - ٹی ، مددگار
لکچرار ٹریننگ کالج حیدرآباد

ٹی پی نن ایم اے ، ڈی ، یس ، سی ، جامعۂ لندن کے پروفیسر شعبۂ تعلیم ، انگلستان کے حالیہ ماہرین تعلیم میں ایک سربر آوردہ ہستی مانے جاتے ہیں ۔ Education, Its Data and First Principles تعلیم ، اس کے مقدمات اور اصول اولیہ نامی کتاب ان کی ایک مشہور اور بلند پایہ تصنیف ہے جس میں مصنف نے مسئلہ تعلیم کے اکثر اہم پہلوؤں پر فلسفیانہ بحث کی ہے - اسی کتاب کے باب اول کا ترجمہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے —

مترجم

ارسطا طالیس اپنے مشہور خطبات میں لکھتا ہے کہ ہر فن کا مدعا کسی نہ کسی فلاح کا حصول ہوتا ہے - چنانچہ اس کتاب میں مسئلہ تعلیم کو اسی فنی نقطہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے - اب قدرتاً سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فن کس قسم کی فلاح کو اپنا مدعا ٹھیرائے ہوئے ہے ہمیں اس استفسار کے کئی معقول جواب ملتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ تعلیم کا مدعائے اعظم تشکیل سیرت ہے ، کوئی کہتا ہے یہ انسان کو ایک

مکمل اور اعلیٰ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے - کسی کی رائے ہے کہ تعلیم کا مقصود صحتور جسم میں صحتور دماغ پیدا کرنا ہے - اسی طرح کے اور بیسیوں جواب ہیں اور مزا یہ کہ بظاہر سب معقول اور تشفی بخش دکھائی دیتے ہیں مگر جب حقیقت کی مزید کریدکی جاتی ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تشکیل سیرت ہی کو مدعائے تعلیم فرض کرلیا جائے تو تعلیم کے ذریعہ ہمیں افراد میں کس طرح کی سیرت پیدا کرنی ہوگی - دوسری یہ کہ مکمل زندگی کے مفہوم میں کون کون اعمال واشغال شامل کئے جاسکتے ہیں یا توانا و صحت مند دماغ کی نشانیاں کیا ہونگیں - اس جگہ ہمیں ڈاکٹر کلینک کا وہ چلتا ہوا فقرہ یاد آتا ہے جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ تعلیم کے کسی ہمہ گیر مدعا کے تعئین کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئیں کیونکہ مدعاؤں کا دائیرہ مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اسی مفہوم کے حدود میں رہ کر بھی حسب منشا تاویلات پیدا کی جاسکتی ہیں - مثلاً جس چیز کو زید شائیستہ سیرت تصور کرتا ہے - ممکن ہے کہ وہی بکر کے خیال میں حد درجہ نفرت انگیز یا مضحکہ خیز بات ہو - یا ممکن ہے کہ عمرو جس کو کامل زندگی سے تعبیر کرتا ہے خالد کے نزدیک وہی غیر روحانی موت کے برابر ہو یا ممکن ہے کہ توانا جسم میں توانا دماغ کا مقولہ جو خالد کی نگاہ میں نہایت قابل احترام ہے ولید اسی کو ایک وحشی کے قالب میں شیطان کی روح باور کرے - ان امور کے مد نظر کوئی سرّی کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام مقولے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں اور ان کا منشا اس حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے کہ تعلیمی اعمال اور معتقدات کے اختلاف اس قدر بنیادی ہیں اور ان کا خلیج اس قدر وسیع ہے کہ ان کے اتحاد یا ان کے اظہار کا عمل خطرہ سے خالی نہیں —

ان ناگوار اختلافات کے آغاز کی ہم بآسانی دریافت ہوسکتی ہے - تعلیمی پروگرام جو بنیادی طور پر ایک خالص عملی فلسفہ ہے لازمی طور پر زندگی کے ہر پہلو اور ہر نقطہ سے مس کرتا ہے- پس ایسا تعلیمی مقرون مدعا جو ہماری باقاعدہ

رهنمائی اور هدایت کر سکے زندگی کے تمام (عیون) Ideals سے مربوط هوتا هے اور چونکہ زندگی کے عیون باهمدگر نقیض واقع هوے هیں ان کا باهمی اختلاف تعلیمی نظریوں میں بھی نمودار هو جاتا هے - مثلاً زندگی کا یوفانی زاویہ نگاہ پیورٹین مصلحین (Puritan Reformers) کے مدعائے حیات سے متحد نہیں هوسکتا - پس یہ هماری خام خیالی هوگی کہ هم ان تعلیمی تصورات میں یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کریں جو انھیں متضاد تصورات کی پیداوار هیں یہ واقعہ هے کہ زندگی کا کوئی نصب العین بھی بے چون و چرا صحیح نہیں تسلیم کیا جاتا بلکہ ماننا پڑتا هے کہ هر مہذب انسانی جماعت بلکہ خود ایک هی قوم اور اس کے فرقوں کے درمیان کسی نصب العین کے متبعین کے زمرہ میں بھی رقیبانہ گروہ - غیر مستقل حمایتی اور خفیہ باغی موجود هوتے هیں - تو کیا عجب هے کہ علم برداران تعلیم هميشہ ایک دوسرے کی تردید اور مخالفت کرتے رهیں اور ایک بے علم انسان کو صداقت کی راہ سجھائی نہ دے —

ان تمام خرابیوں کی بنیاد انسانی فطرت کی بوقلمونی هے اور یہ انسانی فطرت کا سب سے زیادہ حیرت ناک استبعاد Paradox هے - ایک طرح پر دیکھئے تو انسان ایسے جزیروں کے تنہا مکین معلوم هوتے هیں جو ایک دوسرے سے ناقابل عبور سمندروں کے ذریعہ جدا هوں مثلاً میری اور آپ کی روح کے درمیان باهمی تعارف اور اطلاع یابی ایک بہت هی بھدے اور ٹیڑھے طریقے سے هو سکتی هے یعنی میں یا تو کام و دهن کی چند حرکتوں سے آوازیں پیدا کر کے آپ کے گوش گذار کروں یا صفحات قرطاس پر اپنی انگلیوں یا چھاپے سے چند اشکال نقش کروں - بجز اس طریقے کے هم دونوں کی روحوں کے میل جول کا کوئی قریبی اور راست علاقہ هے اور نہ کوئی روحانی یا وجودی رشتہ " تم هميشہ تم هی هو اور میں میں هی هوں " ایک اور نظر سے دیکھئے تو جملہ انسانوں پر

ع) بنی آدم اعضاے یک دیگر اند ' کا پورا اطلاق ہوتا ہے- ہم اس دنیا میں بالکل اسی طرح معرا دماغ پیدا ہوتے ہیں جس طرح کہ عریاں بدن ہوتے ہیں - اور جس طرح کہ ہمارے بدن دوسروں کے ذریعہ ڈھانکے جاتے ہیں اسی طرح ہماری روح میں بھی جو کچھہ داخل ہوتا ہے وہ اوروں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے اگر ہماری یہ تمام مستعار چیزیں چھین لی جائیں تو ہم نہ تو زندہ رہیں نہ انسان ہی کہلائیں-

لوگوں میں عموماً یہ بری عادت ہوتی ہے کہ مسئلہ حیات کی نسبت فلسفاتے وقت اس کے مختلف فیہ پہلو ہی پر زور دیتے ہیں چنانچہ عیسائیت کے اصلاحی دور سے پہلے کے اکثر مفکرین یورپ کے نزدیک زندگی صرف منحصر بالذات (Self - Contained) ہی نہیں بلکہ مکتفی بالذات (Self - Sufficient) بھی تھی - اُن کا خیال تھا کہ انسان صرف اسی لئے معاشرے نہیں بناتے کہ زندگی قدرتاً منفرد (Solitary) واقع ہوئی ہے بلکہ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بقول شخصے " بے مایہ - ناپاک - وحشیانہ اور مختصر بھی ہے " صفحات تاریخ میں اپنا تمثیلی (Dramatic) دور پورا کرنے کے بعد اس پر مبالغہ انفرادیت کے جلو میں وہ رد عمل شروع ہوا جس کا نظری عروج ہیگل کے صفحات میں نظر آتا ہے - یہاں پر ہابز کی ترتیب بالکل زیر و زبر ہو جاتی ہے چنانچہ معاشرہ انسانی جدت کی پیدا وار کی بجاے اپنے ہی روحانی وجود کا سر چشمہ قرار پاتا ہے اور پھر جب اس کا تصور مملکت (State) کی مخصوص صورت میں کیا جاتا ہے تو وہ ایک ایسی " ماوراء شخصیت " (Super - personal) یا دیو پیکر ہستی بن جاتا ہے کہ جس کے مفہوم تک ہابز کی بھی رسائی نہیں ہوئی تھی - اور حیات منفردہ جس کا محض ایک گریزاں عنصر (Fugitive element) ہے - بالفاظ دیگر یوں خیال کیجئے کہ معاشرہ (Society) قرنہا قرن کی وہ روحانی حیات ہوتی ہے جس سے انفرادی روح اپنے اُس خاص ارادہ اور مقدار اصلیت کو مقتبس کرتی ہے جو اس

میں موجود ہے —

یہ دونوں تقاضای خیالات جیسا کہ عموماً فلسفیوں کا حال رہا ہے معاشرتی اور سیاسی حالات ہی کے زائیدہ ہوتے ہیں - نیز ان سے ان حالات اور تعلیمی عملوں (Educational Practices) کا ظہور ہوتا ہے جو انھی کے ثانوی گردنتہ ہیں - اول الذکر فلسفہ کے نتائج دیکھنے مظور ہوں تو ہمیں کو تاریخ سے مشورۃ کرنی ہوگی لیکن ہیگل کے خیالات کا زہریلا شجر خرد اس کی آنکھوں کے سامنے پھلا پھولا اور اس کے تلخ ثمر بھی مل گئے - یوں تو جنگ عظیم کا تمام تر الزام کسی ایک فلسفی کے سر چپپنا سخت ناانصافی اور بیہودگی ہوگی کیونکہ جیسا کہ ہم کسی جگہ بتا چکے ہیں فلسفی محض انہی خیالات اور تحریکات کی تحدید اور تشکیل کردیتے ہیں جو عام اذہان میں پہلے ہی سے پک رہے ہیں مگر بالکل غیر معین اور ہیولانی طرز پر بایں ہمہ جنگ عظیم اور فلسفۂ ہیگل * کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ پایا جاتا ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتا —

جرمن دل و دماغ میں مملکت کی قدر مطلق کے دیوانہ وار اعتقاد کی جاگزینی کا سبب محض ہیگل کا فلسفہ تھا اور اس کا یہ مہلک نظریہ کہ مملکت سے بر تر کوئی اخلاقی اقتدار (Moral Authority) قابل تسلیم نہیں اور اس کا یہ دم چھلا کہ نظام تعلیم از ابتدا تا انتہا ملک اور اہل ملک کے دماغ میں ان ہی خیالات کے متمکن کرنے کا محض ایک آلہ ہونا چاہئے - زمانۂ حال کے معلمین کے سامنے اس وقت نازک ترین حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا وہ اسی مذموم روایتی خیال کو تقویت دیں یا انسانیت کو اس سے بچانے اور کسی بہتر چیز کے حصول

---

* ہیگل مشہور جرمن فلاسفر - سنہ ۱۷۷۰ ع میں پیدا ہوا - انیسویں صدی میں اس کا فلسفہ جرمنی کے مابعدالطبعی افکار کا سرتاج تھا - جرمن قوم کے استحکام اور جنگ آزمائی کے ارادہ کو اسی فلسفہ کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے -

میں اس کے معاون ہوں - یہ طے شدہ ہے کہ اب ہم ہابز (Hobbes)* کا نظریہ اختیار نہیں کرسکتے - اس کی رہنمائی بھی ہمارے لئے ہیکل ہی کی طرح ہلاکت آفریں ہوگی - یہ خیال کہ معاشرتی قیود خارج سے عاید کئے جاتے ہیں اور انہیں بطور ایک معاشری معاہدہ (Social Contract) کے قبول کیا جاتا ہے کب کے بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں - اب تو انہیں بالعموم انسانی فطرت کا اقتضاء اور اس کی ذات کے تار و پود کا جز لا ینفک تصور کیا جاتا ہے حرمت نفس کے (Self - regarding impulses) زبردست ترین محرکات بھی کوئی ایسی زندگی مرتب نہیں کرسکتے جو معاشری عناصر کے جدا کئے جانے کے بعد بھی قائم رہ سکے - اور بڑی سی بڑی جدت نہاد ہستی (Original Personality) کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اُس کی نشو و نما کے لئے کوئی ذریعہ یا واسطہ (Medium) ہی نہ ہو —

تھوریو (Thoreau) انسانوں سے بھاگ کر کتنے ہی گنجان جنگلوں جا چھپے لیکن اس کی ذہنی معاشری فضا ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے گی - ہم در اصل ان واقعات نفس‌الامری کی تردید نہیں کرنی چاہتے بلکہ ہمیں ایک ایسے نظریہ کی تلاش ہے جو ایک جانب ان کی اہمیت کا اعتراف کرے تو دوسری طرف فرد کی اہمیت اور اس کے ناقابل انکار حقوق کی حفاظت کا ضامن ہو —

صفحات ذیل میں ہم ایک ایسا نظریہ مرتب کرنا چاہتے ہیں جو نظام تعلیم کے لئے ایک غیر متزلزل بنیاد کا کام دے اب ہم شروع سے آخر تک اس امر کو مسلم قرار دیں گے کہ ذکور و اناث کے انفرادی اور بے قید اعمال و افعال کی وساطت کے بغیر انسانی دنیا میں کوئی فوز و فلاح دخل نہیں پا سکتی اور ہمیں جملہ تعلیمی اعمال (Practices) اور طریقوں کو اسی کسوٹی پر کسنا چاہئے - یہ یاد رہے کہ اس

---

* ہابز - ایک مشہور انگریزی فلسفر - پیدائش سنہ ۱۵۸۸ ع - اس کی شہرت کا باعث اس کا یہ نظریہ ہے کہ مملکت بہ مقابل فرد مختار کل ہے -

نقطہ نظر کے اختیار کرنے سے اپنی نوع کی نسبت انسان کی ذمے داری ذرہ برابر نہیں گھٹتی کیونکہ حیات منفردہ (Individual life) اپنی ہی افتاد مزاج کے مطابق ترقی کرتی ہے اور اس کی یہ افتاد طبعیت میں میل ملاپ کا عنصر بھی ہوتا ہے - اور پاس نفس اور کنارہ کشی کا جزو بھی شامل پایا جاتا ہے - غرض کہ ہمارا یہ نظریہ رواج و روایات فقہ و بند یا نفوذ مذہب کسی کا منکر نہیں - البتہ وہ کسی ایسی بالاتر شخصیت کے وجود کا قائل نہیں جس میں حیات منفردہ کی حیثیت محض ایک ناقابل شمار عنصر کی سی ہو جاے - ہمارا نظریہ فرد واحد کی بے انتہا اہمیت کا پرزور حامی ہے - اس کو اپنی قسمت کا مختار کل گردانتا ہے اور اس کے جملہ نتائج و عواقب کو صحیح تسلیم کرتا ہے —

جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر کہیں اس خیال کا اظہار کیا ہے ہم اپنی حجت کو ایک اور طرح سے واضح کرنا چاہتے ہیں - اگرچہ ہر شخص کا طبعی میلان یہی ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا نصب العین اور اس کی امنگ اوروں سے جذب کرے تاہم یہ بھی درست ہے کہ ہر ایک شخص کا نصب العین انوکھے طرز کا ہو - فن لطیف یا آرٹ کا ہر ایک عمل بجنسہ اسی مفہوم میں اپنا ایک خاص آئیڈیل (نصب العین) رکھتا ہے - اگر کسی شاعر کی قوت تخلیق اپنے نصب العین کے حصول میں ناکام رہے تو وہ ہرگز کسی دوسرے کی نظم دکھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کو میں سرانجام دینا چاہتا تھا - خود اس شخص کا کوئی مقررن نصب العین ضرور ہوگا لیکن وہ متشکل ہو سکتا ہے تو خاص اسی کی نظم میں نہ کہ کسی اور کی - اور یہی نصب العین اس کے ولولۂ حصول کمال کی وہ آخری منزل تھی جس تک اس کے عمل کی دسترس نہ ہوسکی - نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کا کوئی ہمہ‌گیر مدعا نہیں بن سکتا اگر ہم اس مدعا میں زندگی کے کسی خاص نصب العین کو شامل کرنا چاہیں کیونکہ جتنے اشخاص ہونگے اتنے ہی نصب العین ہوں گے - بالفاظ دیگر

تعلیمی جد و جہد اُن ہی حالات اور لوازم کی بہم رسانی تک محدود ہونی چاہئے جس کے زیر اثر اشخاص کی انفرادیت کامل نشو و ارتقا پاسکے یعنی فرد کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ حیات انسانی کی بوقلمونی کو اپنے ذاتی افادات اور سیرتی خصوصیات سے صحیح ترین اور کامل ترین طور پر مستفیض کر سکے - یہ امر کہ افادہ کی کیا صورت ہوگی فرد کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو ہر شخص اپنی طرز زندگی کے طابق اپنے ہی دوران حیات میں بطور خود تشکیل دیتا ہے - ابھی ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ انسانی ارتقا کے واقعات ہمارے اس نقطۂ نگاہ کے موئید ہیں کہ نہیں - یعنی اس نظریے کی بنیاد قدرت کے مضبوط اصولوں پر قائم ہے یا یہ محض ایک فریب نظر ہے - آئندہ ابواب میں اسی دشوار مسئلہ کا حل کیا جائے گا مگر بہت مفید ہوگا کہ قبل از قبل اس کے ممکنہ نتائج کا اظہار اور غلط فہمیوں کا ازالہ کردیا جائے—

سطور بالا میں ہمارے نظریے کا کچھ اس ناقص طور پر ذکر ہوا ہے کہ اس میں زندگی کے نیک و بد نصب العین میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے اور نہ تو انفرادیت کی قابل تائید صورتوں کو قابل تردید اشکال سے جدا کیا گیا ہے- تو کیا معلم کو لازم ہے کہ وہ کسی بچے کو سیزرے بورجیا (Ceasare Borgia) * کا سا سفاک و فریب کار فاضل یا ایمل پیسچور (Emile Pasteur) † کا سا کامل الخصائل انسان بننا یکساں طور پر مباح

---

* پیدایش سنہ ۱۴۷۸ع یہ ڈیوک آف ویلنٹائنے کا نام ہے یہ علم و ہنر کا بڑا سرپرست اور ایک تعلیم یافتہ فصیح البیان اور خوبصورت نوجوان تھا- مگر ساتھ ہی ساتھ بڑا ہی سفاک اور ظالم بھی تھا چنانچہ اپنے بھائی کو قتل کرکے ڈچی کا مالک بنا اور فریب و مکر سے وسطی اطالیہ کو زیر نگیں کرکے اپنی موروثی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی

† تعلیم کے متعلق روسو کی مشہور زمانہ تصنیف ایمیل کا ہیرو - اس میں روسو نے ایمل کی سیرت کامل انسان کی سیرت کے نقطۂ نگاہ کے مطابق بتائی ہے —

رکھے - جواب یہ ہے کہ ہر ایک بچہ اپنی شخصیت کا خود آپ ذمہ دار ہونے سے یہ لازم نہیں آتا اس کی نسبت دوسروں کی ذمہ داری بھی بالکل اٹھ جائے - کوئی معلم مجاز نہیں کہ وہ کسی بڑی زندگی کی تشکیل و تکمیل میں اس بنا پر اعانت کرے کہ اس زندگی سے کسی اعلیٰ نظم کی ندرت (Originality) ہاتھ آجائے گی - پریسک ایسڈ (Prussic acid) صرف جسم کے لئے سم قاتل ہے مگر دنیا میں اسی طرح روح کو کامل طور پر برباد کرنے والی بہت ساری چیزیں پائی جاتی ہیں - زندگی کے اطراف ممنوعات کا ایک کٹہرا بنا ہوا ہے جس کا ہر نوجوان راہ عمل کے چلنے والے کو لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے - مقررہ حدود کے اندر ہی اس کی سرگرمیوں کے لئے کافی میدان عمل ہوتا ہے - دنیا کو ہر طرح کا آدمی چاہئے اور وہ اُتنی ہی بہتر بنتی جائے گی جتنا کہ اُس کا ہر فرد اپنی طرز کا بہترین انسان بنے —

ایسی صورتوں میں بھی جب کہ اخلاقی احکام محض اجازتی نہیں بالکل قطعی ہوں تعمیل حکم کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں - کسی کا کیا اچھا قول ہے کہ ایک شوفر اپنے ہمسایہ کے ساتھ، بہترین طور پر یوں اظہار محبت کرسکتا ہے کہ وہ موٹر ہمیشہ سڑک کی بائیں جانب چلایا کرے - غرض کہ یہ ایک کھلی بات ہے کہ اچھے اور برے افعال سے ترکیب دے کر زندگی کے قسم قسم کے نمونے تیار کئے جاسکتے ہیں مگر ان کے حسن و قبح کی نسبت قبل از قبل کوئی مقررہ اُصول یا نظریہ بنا لینا تقریباً ناممکن ہے —

اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہم یہ بھی جتا دینا چاہتے ہیں کہ ہر پیش بین معلم کو اس کی بھی خاص احتیاط کرنی چاہئے کہ استثناعات کی بے ضرورت بھرمار نہ کی جائے - کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ ہم ابتدا ہی سے جان لیں کہ یہ نئے قسم کی انفرادیت، یا خیال و عمل کے اظہار کی یہ نئی صورت، دولت عالم میں اضافہ کرے گی یا اس کی قدر و قیمت کو اور گھٹا دے گی - اس معاملہ میں ہم

ہلاکت انگیز آسانی کے ساتھہ کسی چیز کو حسن و جمال ' یا صداقت دینے کے منافی قرار دیدیتے ہیں حالانکہ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ ہمارے قدامت پسند میلانات کے خلاف واقع ہوئی ہے - ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ انسان نے زمانۂ ماضی میں بیسیوں دفعہ تمام تخلیقی کارگذاریوں اور اعمال کا گلا گھونٹنے کی پیہم کوشش کی ہے حالانکہ بعد ظاہر ہوا کہ یہی اعمال و افعال انسانی دولت کے بیش بہا خزانے تھے - یہ بات زیادہ تر معلمین کو ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ " قدیم - بعید اور ناخوشگوار واقعات " کا کبھی تو ادنیٰ اور ناقابل لحاظ اُمور میں اور کبھی اہم ترین معاملات میں ہمیشہ تکرار یا تتبع ہوا کیا ہے - چنانچہ اسی عہد کے نوخیزوں نے جب مستقبلئین (Futurists) کو روایتی رنگ آمیزی سے انحرات کرتے دیکھا تو اس کو ایک شگون بد تصور کرتے ہوئے اس کا خوب مضحکہ اُڑایا - کہیں اس پر خفگی کا اظہار ہوا اور کسی جانب سے لعنت و ملامت کی بوچھار ہوئی - ان کے بزرگوں کو یاد ہے کہ ویگنر (* Wagner) اور موسیقی مستقبل (The musie of the future) کے ظہور کے وقت بھی اسی قسم کے مظاہرے ہوئے تھے اور کچھہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ عورتوں کے شعبۂ طب میں داخلہ کے خلاف ایسا شور شغب بپا ہوا تھا کہ معززین و عمائدین انگلستان کی بنیادیں ہل گئی تھیں —

غرض کہ مدرس کے لئے مناسب ہے کہ گیملیل (Gamliel) کے اس انتباہ کو دلنشین رکھے کہ وہ کہیں اقتضائے فطرت یا مشیت ایزدی کے خلاف تو جنگ آزما نہیں ہے - معاشری وظائف (Social duties and obligations) کی تدریس میں

---

* Wagner ایک مشہور جرمن ڈرامہ نویس اور شاعر گذرا ہے - سنہ ۱۸۱۳ ع میں بمقام لیپزک پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۸۲ ع میں فوت ہوا - اس نے اطالوی ڈراما کے برخلاف اپنے ڈراموں میں ایک خاص جدت پیدا کی یعنی نظم - موسیقی - حرکات و سکنات اور مناظر کے اثرات کو دمبدم و گریبان کردیا - ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اس کے نظریہ کو اس زمانہ میں حقارتاً موسیقی مستقبل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا - مگر اسی صدی کے نصف آخر میں تمام ڈراموں میں یہی خصوصیات نمودار ہوگئیں —

خصوصاً احتیاط چاہئے تاکہ مدرس اپنے شاگردوں کو محض کسی پارینہ نصاب کا پابند نہ کردے۔ معاشری وظائف کے انصرام کی صدہا صورتیں ہیں - ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس قدر پیش بیں ہو یا اس کا تعین کردے کہ انسانی روح عمل کس جانب یا کس رخ میں کیا کچھہ کرے گی - ممکن ہے کہ ایک دلیر اور طاقتور روح اپنے ہی وجود کو مٹانے والی انفرادیت کے اظہار کے ذریعہ قصر معاشرت کی پوری اخلاقی سطح کو پہلے سے کہیں بلند و برتر کردے - ایک بزدل روح اسی وقت معاشرہ کی خدمت انجام دے سکتی ہے کہ وہ خود کو اپنے اصلی اور سچے ذاتی خصوصیات کا حامل بنائے معاشرہ کے خود اپنے ارکان کے حقوق کی پا بجائی اس طرح نہیں ہوتی کہ ہر انسان کو امکانی حدتک اپنے دوسرے ابنائے جنس کا مثل بنایا جائے بلکہ بقول ڈاکٹر بوسانکوئے (Dr Bosanquet) جب وہ اپنی ذات کو اُس ماحول اور اُن عطایائے الٰہی کا جواس میں ودیعت ہیں وارث سمجھتے ہوئے انہیں طاقت کی اعلیٰ بلندیوں پر پہنچانا اپنا فرض جانے —

قارئین نے معلوم کیا ہوگا کہ ہم اب تک ایک نہایت دشوار مسئلہ کو معرض بحث ہی میں نہیں لائے - یعنی معاشرہ یا مملکت اس کی مجاز ہے یا نہیں کہ خاص اور نازک موقع پر اپنے ارکان سے ایسی خدمات طلب کرے جو خود انہی کے انفرادی ارتقاء کو مسدود یا تباہ کرنے والے ہوں-اگر اس کا جواب اثبات میں دیا جائے تو اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ انسانیت اپنے موجودہ اسقام و معایب کی لعنت میں ہمیشہ گرفتار نہیں رہے گی بلکہ ان سے بچنے کا عزم صمیم کر لیا جائے تو نوع انسان

---

*(Gamliel) یہ یہودی فرقہ کے ایک بڑے سردار کا نام ہے جس کو (Patriarch) (اسقف) کا عہدہ بھی حاصل تھا - اس کے قوانین نہایت نرم اور آزاد خیالی کی روح لئے ہوئے ہیں —

کے برگزیدہ اور پاک نفوس کو ضرور صراط مستقیم مل جائے گی پس اگر ایسی دنیا کا خواب دیکھنا بجا ہے جس میں افراد کی بھلائی جماعتی بھلائی کی نسبت قریب تر اور مساوی ہو تو ہمیں اس خواب کو حقیقت سے بدلنے کی امکانی سعی کرنی چاہئے - بہر حال تعلیم کا اس سے بڑا کیا کارنامہ ہوگا کہ وہ انسانی دماغوں میں انفرادیت کی قدر و قیمت جاگزیں کردے - انسانوں کو افراد کی حیات کا احترام سکھائے - خانگی ملکیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اسی کی بدولت دنیا میں حقیقی قدور داخل ہوتے ہیں - دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہی امر آزادی کی پناہ گاہ اور جابرانہ حکومت کے خلاف ایک مستحکم ضمانت ہے —

ممکن ہے کہ بعض لوگ ہمارے نظریئے کے منشائے نیک کے تو قایل ہوں لیکن اس کے قابل عمل ہونے میں انھیں شک ہو - یہاں اعتراض ہوگا کہ اس قسم کی تعلیم کے لئے جدا گانہ درس گاہیں یا ہر ایک طالب علم کے لئے جداگانہ نصاب کی ضرورت ہوگی - تو ہم پھر اس امر کی وضاحت کردینا چاہتے ہیں کہ ہمارا زور تمام تر اس پر ہے کہ ہم انسانی ہستی کے ناقابل تبدیل حالات کو بدلنا نہیں چاہتے بلکہ صرف اُن کا بہترین استعمال کرنا چاہتے ہیں - انفرادیت کے ارتقا کے لئے معاشری فضا درکار ہوتی ہے جس میں کہ انسان کو تمام دل چسپیوں اور علم سرگرمیوں کی غذا مل سکے - ہماری غرض صرف یہ ہے کہ انفرادیت کو حیات عامہ کے اندر کامل آزادی عمل حاصل رہے تاکہ وہ اپنے ہی طور پر نشوونما پائے اور دوسری کوئی سخت سے سخت طاقت اس کو اپنے نصب العین سے منحرف نہ کرسکے بعض لڑکے لڑکیاں ایسی صورت میں فطرتاً عزلت پسند اور زاویہ نشین ثابت ہوں گی- پس فلاح عامہ کا مقتضا یہی ہے کہ انھیں بارِ ہی جبوڑ دیا جائے لیکن عامۃالناس اور فاید یا ہیرو کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ راہ ارتقا پر بہت کم لوگ ملیں گے جو مقررہ راستہ سے ہٹ کر

نئی راہ اختیار کرتے ہوں - مختصر یہ کہ انفرادیت ' سنک (Eccentricity) کے ہم معنی نہیں ہے معلمین سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ انفرادیت کو عموماً معنوبات کی طرح ڈھالنے لگیں بلکہ اس کو بچہ ہی کی طبیعت اور قدرتی میلانوں اور قوتوں کے بل پر بے روک ٹوک نشوونما پانے دیں —

انگریز اس پر ناز کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تاریخ میں شروع سے آخر تک انفرادی آزادی کے اصول کی تاریخ وقتی سے حمایت کی ہے اور کسی نمایشی اور برفریب فلاح کو اس کے مبادلہ میں اپنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے مگر بدترین الزام اُن پر یہ عاید ہوتا ہے کہ انہوں نے اوروں کو مساوی آزادی عطا کرنے سے انکار کر کے بسا اوقات اپنے ہی انفرادی نور ہدایت کے خلاف جرم کا ارتکاب کیا ہے اس تاریخی ادعائے حریت کی بنیاد محض یہ صداقت ہے (جس کو کسی نے صاف اور کسی نے دھندلا دیکھا ہے کہ زندگی کی مہم اپنے ہی طور پر سر کرنے اور اس کا بہترین استعمال کرنے کے لئے ہر شخص بالکل آزاد رہے - یہی ایک نصب ہے جس کو عقل صحیح مانتی ہے اور جس پر قدرت مہر توثیق ثبت کرتی ہے دوسرے - سب نصب العین اور اُن کی تنویر اسی نور کے حصہ ہیں - سچ یہ ہے کہ اسی قسم کی آزادی یا حریت تمام اعلیٰ نیکیوں کا منبع نہیں تو لازمہ ضرور ہے ورنہ فرض منصبی کوئی معنی رکھتا ہے نہ ایثار کو کوئی وقعت ہوسکتی ہے نہ کوئی اقتدار قابل تسلیم قرار پاتا ہے بین الاقوامی برادری کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے تو اسی پر اور تمام انسان متحد ہو کر مدینۃاللہ (The city of God) کی تعمیر کر سکتے ہیں تو اسی ایک اساس پر - عہد حاضر کی ساری بیچینیوں کا سبب اسی کے حصول کی پوشیدہ خواہش ہے - یہ نہایت ہی مہتمم بالشان مگر غالباً نہ استبعاد ہے کہ ہمارے لاکھوں ہمزبان اور شریک آرزو

انسان آزادی کے انفرادی حقوق سے صرف اس لئے دست بردار ہوگئے ہیں کہ دنیا بھر میں اسی کا قانون جاری کریں - کیونکہ اگر " دنیا کو جمہوریت کے لئے محفوظ کرنے " کے قول کا منشا یہ نہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم ایک استبداد کی جگہ دوسرا استبداد قبول کرتے ہیں - تعلیم میں ہماری رہبری اور روح افزائی کے لئے اس سے کوئی کمتر نصب‌العین قابل قبول ہے نہ اس سے اعلیٰ تر دستیاب ہو سکتا ہے —

نیل کی ناگن

از

جناب سید وزیر حسن صاحب

اگلے وقتوں ایک ملکہ تھی - "کلوپترا" نام تھا - مصرقدیم کی دلاری اور اپنے زمانے کی ایک گنی جاتی تھی - دوھزار برس سے اوپر ھوئے کہ دنیا اس سے روشناس ھوئی - قریب قریب ھر رو دار ادب میں اس کا مذکور ھے - گزرا زمانہ تخیل کی سیر بیں ھوتا ھے - امتداد کی جھلملیوں سے آئیے ! آج ھم بھی اسے دیکھیں —

اس ملکہ پر یہ مثل اصل ھے : جتنے منہ اتنی باتیں - کوئی اسے اچھا کہتا ھے کوئی برا کہتا ھے - دنیا کا کچھہ یہی رنگ ھے - یہاں ایک ھی چیز ایک کو بری ایک کو بھلی معلوم ھوتی ھے - اور یہ اپنی اپنی سمجھہ ھے ورنہ کوئی بات بذات خود بری ھے نہ بھلی - یہ نرا خیال ھی خیال ھے جو ھر شے میں نمک مرچ لگ جاتا ھے- اس طرح اس خوبصورت ناگن کی انوکھی باتیں بھی نیرنگ واقعات کی ایسی دھوپ چھاؤں میں رھیں جیسے منف کے اھرام فجر کے گلابی تبسم میں تو نور کے مخروط دیکھائی دیں مگر جب شام میں شفق پھولے تو وھی اھرام اک گلنار سطح پر سیاہ مثلث بن جائیں - خوش دل کارنیل معمولی آدمی نہیں - وہ اسے پاک دامن کہتا ھے - چہ جائے کہ اس کا چال چلن بالعموم اچھا نہیں سمجھا جاتا بعض کی نظروں میں یہ پاکدامنی کارنیل ھی کی نیکی کی پرچھائیں ھے - اصلیت

خدا جانے - البتہ سرزمین حسن و عشق کا یہ جید شاعر اس شہرت کی پتری کو اپنے سندر دل و دماغ سے سچ دیتا ہے - اس کے ہاں یہ فطرت کی لاثانی زندگی کی ستیج پر تربیتی کا اعلیٰ نمونہ ہے - اور اس طرح بطلیموسی گھرانے کی یہ آخری شہزادی گویا اس کے شوق ذوق کی چیز بنی ہوئی ہے - جن صاحبان ذوق کی نظروں میں بھلائی سما جاتی ہے - ان کے علو مرتبت کا یہی عالم ہو جاتا ہے - ان کی واردات آتما کی موتی سی کرن ہوتی ہے - انہیں بھلائی میں بھلائی دکھائی دیتی ہے - سنا ہے : کار ذیل کی بھی یہی شان تھی - بڑے سے بڑے جذبات اسے سستے سے سستے داموں پڑتے جو سدا اس کی روشنائی میں کھرل ہوتے تھے - وہ اس دنیا ' دنیا والوں کی آن بان پر لوٹ اور منچلی شہزادیوں کی دھج پر مٹا ہوا تھا —

شیکسپیر کا رنگ جدا ہے - ہونا بھی چاہئے کہ یہ فطرت کا رازدار اور شاعر انسانیت ہے - اس کی جگہ تو ان رسیاؤں کے دل میں ہے جو حسن و صداقت پر ہمیش کو مٹ چکے - اس کی ازلی کلوپٹرا کی ساری باتوں میں یہ بات بڑی بھلی لگتی ہے کہ وہ جیتی جاگتی بولتی چالتی چلتی پھرتی تصویر حسن و کمال ہے - ایک دفعہ کا ذکر ہے - انطونی جل دیکے غائب ہوگیا - کلوپٹرا کی نظروں میں دنیا اندھیر ہے - انطونی نہیں تو گویا سارا شاہانہ عیش گرد ہو گیا - اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے بس اسی کی لوگی ہوئی ہے - طبیعت زیادہ پریشان ہوتی ہے -اور بہت دم گھٹتا ہے تو دل کو یوں تسلی دے لیجاتی ہے —

" ——— اچھی چارمیاں ! تیرے خیال میں وہ کہاں ہوں گے ؟ کھڑے ہوں گے - یا بیٹھے ہوں گے - یا چل پھر رہے ہوں گے - یا اپنے گھوڑے پر ہوں گے - اللہ رے گھوڑے تیرا نصیب ! کہوہ تجھ پر سوار ہیں !! " —

واقعی ' جس طرح میرزدا شاعرانہ الہام کی پتری ہے - کلوپٹرا کمال فن کا معجزہ ہے - یہ دونوں کی دونوں سادگی اور پیچیدگی کی دو ایسی انتہائیں ہیں

جن کے بین بین شاعری کا تخلیقی سمندر جان کی موجیں مار رہا ہے۔یوں بورژھاپلوٹارک افاطول ' کاٹیر اور اور بھی بہت سارے منچلے ہیں جنھوں نے کلوپٹرا کی رونمائی کی ہے - لیکن ایک یہی کیا - جو کوئی اس کا ذکر کرے گا - اس کی انوکھی باتوں سے اثر لے گا - یہی ایک چیز اس کے غیر معمولی ہونے کی نشانی ہے - اور چونکہ انسان کے شمائل نفسی (استائل) کی جھلکیاں فطرتاً جدا جدا ہوتی ہیں اس لئے اس راج دلاری کی داستانوں میں بھی کائنات کے بے گنتی سورجوں کی سی رنگینیاں آگئی ہیں —

خیر تو کلوپٹرا کی بڑی لاجواب سرگزشت ہے - ایک ہی وقت میں موہن بھی دلگدازبھی - اس کی آپ بیتی فلسفۂ حیات کا ایسا نادر واقعہ ہے - جس سے شکسپر کازبردست آرٹ بھی نمایاں اضافہ نہ کر سکا - یہ ملکہ در اصل کوئی حور یاپری نہ تھی کہ دیکھتے سے انسان کی بھوک بھاگے - آدمی کا بچہ تھی - گندمی رنگ - بڑی بڑی غلافی آنکھیں - کالی کالی روشن پتلیاں - کتاراسی ناک - بوٹا سا قد - گداز جسم چہرہ پر تندرستی کی لالی - لیکن اس زمانے کے مسکوکات میں اس کا نقشہ بڑا بھونڈا دیا ہے - کتنی ہی لمبی تو اس کی ناک بنائی ہے - لیکن پاسکال کی بھی کیا بات ہے - اس کذھب ناک پر اوازے تو ازے کسے گئے توکیا گہرا اور بھاری بھرکم جواب دیا ہے : کلوپٹرا کی لمبی ناک اگر چھوٹی ہوتی تو دنیا کی شکل بگڑ جاتی ! یوں بھی جس آنکھ ناک نے دنیا کی پاشاہت چھین کر سیزر کو دیوانہ بنا دیا ہو - بھلا اسے کون مضحکہ خیز کہے گا - مگر ان ساری باتوں پر بھی اس کا حسن و شباب اس آک تی ویا سے نرساہی کہا جاتا ہے - جس سے عمرعمر کو افطونی چھین لیا گیا تھا۔ہاں ! اس کی باتیں قیامت تھیں جن میں ظاہر باطن کی سج دھج اوربلاکی متھاس ہوتی تھی - شاہانہ دماغ پایا تھا - مگر ہمیشہ جھک کے ملتی - غریبوں کا دل ہاتھ میں لیتی - امیروں سے مردانہ وار وقار منواتی - اس کی نقرئی گھنٹیوں

کی سی نفیس آواز اور دلربا انداز گفتگو ہی بجائے خود نسائیت کا وہ منتر تھا کہ اجڈ سے اجڈ بھی موم ہو جاتا - باتیں کرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ستار کے میٹھے بول نکل رہے ہوں یا انجان (سب کون شس سائنٹ) کی بدلی سے گیان کے روشن تارے چمک پڑیں - ایک سے زیادہ زبانیں آتیں - جس میں چاہتی ترنم کی گنگا بہاتی - اس پر بھی اجنبی دیہاتیوں کی باتیں سمجھ میں نہ آتیں تو اوروں سے سمجھتی - مگر جواب خود دیتی کہ بن بولے نہ دل مانتا تھا نہ کام بنتا تھا —

علم کی رسیا - روشن خیال تھی - عاشق کتاب' سسرو ' سے اکثر گاڑھی چھنتی - ' پرگیمس ' کا کتاب خانہ - جس میں لاکھوں ہی کتابیں ہوں گی - ' انطونی ' کا وہ تحفۂ نیاز و محبت تھا جسے اس شہزادی نے خوشی خوشی قبول کیا - اس کی بد چلنی کے بیہانک قصے آگسٹس اور ان سپاہ دلوں کا بیشتر خبث باطن ہے - جنہیں اس عورت ذات نے تھرا دیا تھا - غریب خود کچھ نہ کرسکا تو دوسروں کو ہلسایا - ' پامپئی اعظم ' - ' تیلی آس ' - اور خوبصورت ' ہیراڈ ' سے اسے رسوا کیا - اس میں شک نہیں وہ خطرناک تھی - یوں ہر عورت خطرناک ہوا کرتی ہے - ایک ملکۂ زمانی؛ نسائیت کی ایک غیر معمولی جادوگرنی جتنی بھی خطرناک ہو کم ہے - لیکن اس خطرے کا ذمے دار عورت سے زیادہ خود مرد ہے - جنس لطیف کی سچی حسیات اور جذبات کے ہم آغوش ہونے کی صلاحیت اگر مرد میں نہیں تو سمجھو خیر نہیں اس وقت عورت ایک خوبصورت ناگن ہے جو ڈس کر رہے گی - ورنہ ایک نغمۂ مستانہ جس کا جذبہ اضطراری یعنی محبت عنصر حیات بن جاتی ہے - غیر معمولی 'کلو پیٹرا' کے ہاں یہ بات بڑی شاندار تھی - کم سواد ' آگسٹس ' اسے نہ سمجھ سکا - رہیں سیزرز اور انطونی کی واماندگیاں تو یہ کلو پترا سے زیادہ خود ان کے کوتکوں کا پھل ہیں - یہ ملک و اقلیم کے اندھے فطرت کی عزیز ترین نعمت یعنی محبت کو دھوکہ کی ٹٹی بنا کر نہ اپنے کام نکالتے نہ فطرت جلد تر انہیں مٹاتی -- قیامت یوں بڑی دلچسپ

چیز بن جاتی ہے کہ وہاں حسن و عشق کے ناقدروں کا حشر بھی دکھائی دے گا!

بھلا خیال کیجئے! پچاس سال سے اوپر تو سیزر کی عمر اور پر شباب کلوپترا سے چار ہفت کا اوساط اُچھلتا ہے۔ ظاہر ہے یہ برس حب جاہ سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی یہ اسے پیار کرتی ہے۔ محبت کا بول بالا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جو فجر کی فوراتی دیوی کی طرح نمودار ہوکر دل کی کالونس دور کردیتی ہے۔ کلوپٹرا کا پیار رنگ لایا۔ سیزر سا بوالہوس بھی آخر بن داموں غلام بن گیا۔ آگے چل کر سیزر کی ہوس اس سونے کی چڑیا کو روم لے گئی۔ یہ اس سے بھی پیچھے نہ ہٹی یہاں کلپرنیا نے اسے ٹائبر کے کنارے دلوا دیا۔ سیزر کو بھی اپنے پاس سے اُکسنے نہیں دیا۔ پردیس میں یہ مقتدر ملکہ یوں سوت بھرتی ہے۔ جو عورت ذات کے لئے موت ہے مگر محبت بڑی بلا ہے۔ عورت پھر عورت ہی ہے۔ یہ راضی بہ رضا ہے کہ مہاما سیزر آزردہ ہو یا گز برکرنے سے ہمیشہ کو چلی جائے۔ ہاں سرد مہریوں سے جی البتہ بجھ سا گیا۔ اکثر من کی بھول بھلیوں میں گم رہتی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے واقعی یونان دیس کی یہ چاتر پتری ہیلانی (ہیلی نک) گرد و پیش میں پروان چڑھی ہو۔ وہی سج دھج وہی میٹھی گھلاوٹ کی باتیں۔ وہی ملنساری۔ وہی بےباکی۔ وہی حوصلہ۔ وہی تخلخہ۔ گویا فلپ اور اسکندر سے پہلے والی مقدونی شہزادیوں کی وہ ایک ایسی اجاگر پرچھائیں ہے۔ جس کی مسکراتی روح پر مصر کے دیوتا یا افریقہ کے دیوؤں کا کوئی اثر نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کنار ٹائبر باغ میں صنوبر کے سایہ سایہ خوش بیان سسرو سے عالمانہ دو بدو نظر آتی لیکن زمانہ کروٹ بدلتا ہے۔ بروٹس کے خنجر کی خون آشامی سیزر کے خرمن آرزو پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ وہ قتل ہوتا ہے۔ اور یہ بےبسی ملکہ اس خونی ماحول سے آزردہ پھر مصر آجاتی ہے —

اچھا! اور سنیے۔ مارک انطونی کوئی پندرہ کے سن سے کلوپترا کو جانتا

بلکہ اس کا ہوچکا ہے - روان کی زبان میں گویا یہ گل شباب کے کھلنے کا زمانہ تھا - جوانی کی راتیں مرادوں کے دن تھے - مگر کسے خبر تھی کہ پہلے پہل یہ سماجی سیزر کے ہاتھ لگے گا - میٹھے ہو کے لگ بھگ ابھی مسند سلطنت پر بیٹھی نہ بیٹھی تھی کہ بخت و اتفاق کی مشاطہ نے اٹھا اسے مسند عروسی پر بٹھا دیا - یوں کچھ روز سیزر سے سہاگ رہا - سیزر کے بعد انطونی حلیف بنا یہ سپاہی تھا فوجی نفسیات جاننا افسر اور روشن خیال سردار تھا - خوش مزاج ایسا کہ ساتھی رنج و فکر بھول جائیں - لسان ایسا کہ ایک ایک سپاہی کو دس بیس پر بھاری بنادے - کبھی دیکھو تو سپاہیوں میں بیٹھا کھا پی رہا ہے - کبھی انھیں گھیرے مزے مزے کی باتیں ملاکر ہنستا اور ہنساتا ہے - بات بات سے یونانی فصاحت کی مٹھاس ' استعارے اور مبالغہ کی چاشنی آج کل کا رومانی (رومان تک) شہد بن بن کر ٹپک رہی ہے - غرض پلوٹارک کی زبان میں انطونی ناز و انداز کا رسیا بنا ہوا ہے - یہ سب باتیں سہی - مگر وہ بہادر نہ تھا - ہر سپاہی کا بہادر ہونا ضروری نہیں - وہ بہادر ہوتا تو چالباز نہ ہوتا یہ اس کی چالبازی ہی ہے کہ ہر کی ماری کلوپترا مایوس ہوکر جب اس کی طرف بڑھی تو وہ جل دینے پر اتر آیا - یہاں مرد کو کم زوری بیشتو نریا چرتر سے بھی گئی گزری اور گھناؤنی ہو جاتی ہے - اس مرتبہ بھی فطرت نے جب اصناف مقابل کو سلک مصمت میں گوندھا تو بحیثیت صنف قوی انطونی نے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے - ایک پردیسن کو نت نئی اُمید دلائی - مگر جب مصر پہنچے تو یہ پیسہ کا میت وہ انطونی ہی نہ تھا - پہلے تو آک تے وین سے دوستانہ کیا - یوں سارا اخلاص مفاد ذاتی کے بھینٹ چڑھایا - پھر آک تے ویا سے شادی رچا وفا کے عہد و وعید پر خاک ڈال دی - کلوپترا نے سنا تو دل مسوس کے رہ گئی —

لیکن فطرت نے اس بے مروتی کا انتقام لیا - کلوپترا کو گویا صبر کا پھل ملا انطونی کو تخت و تاج کے خناس نے دھکیل پھر کلوپترا کے قدموں ڈال دیا - یہاں اس

اس عورت ذات کا ظرف قابل دید ہے - انطونی جھوٹے منہ ملاقات کے لئے کہلا بھیجتا ہے - تو یہ سارا غصہ تھوک قارسس نکل کھڑی ہوتی ہے - اور وہاں اس کو ' اس کے دوست احباب کو لب ساحل اپنے نفیس شاہی بجرے (گیلی) میں دعوت دیتی ہے - بجرا ہلال نما ہے - دونوں سروں پر دو حجرے ہیں - ان میں کہیں مصری نقش و نگار ہے تو کہیں عربی بیل بوٹے بنے ہوے ہیں - نیل کا پانی صاف اور ساکن ہے - سطح پر کنول ایسے کھلے ہوے ہیں - جیسے آب رواں پر کسی نے کشیدہ کیا ہو - اس میں کبھی کبھی چاندی کی سی مچھلیاں تڑپ اُٹھتی ہیں - ساحل پر جا بجا لق لق ایک پیر پہ کھڑے ہیں - کسی نے گردن پروں میں دے لی ہے - کوئی کھڑا کھڑا تھک گیا تو پھڑ پھڑانے لگا - کوئی اُڑنے کے لئے پر تول رہا ہے - کوئی پر تولتے تولتے اچھی گردن کرکے اُڑ کھجور کے اونچے سے درخت پہ جا بیٹھا ہے - بجرے کے بیچ کے حصے میں شاہی شامیانہ لگا ہوا ہے - زردوانی چھت ہے - اجلو پھلو زری کے رنگ برنگ طرے جھالریں جگر جگر کررہی ہیں - ایک طرف شاہی میز چنی ہے جس پر گنگا جمنی جڑاؤ ظروف جگمگ جگمگ کرتے ہیں - میز کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا مرمریں گلدان ہے - جس پر چین کے کام کا شاہیں بنا ہوا ہے - گلدان میں آبی کنول اور حسن کی دیبی کے رخساروں کے سے تروتازہ گلاب سجے ہیں - میز کے ارد گرد زرکوبی نفیس کام کی زرق برق کوچیں لگی ہیں - تھوڑی تھوڑی دور پر مرمریں تپائیاں رکھی ہیں - ان کے اوپر اگر دان روشن ہیں - جن سے مصر کی منتخب خوشبو کی لپٹیں چلی آتی ہیں فرش پر دو فٹ اونچے گلاب کے پھول بچھے ہیں - ان پر ریشم کا مہین جال تان دیا ہے - یہاں کچھ خوش رو کنیزیں گلاب پاشوں سے ایشیائی عطریات چھڑک رہی ہیں - کچھ اپنی ملکہ کو پوشاک پہنا رہی ہیں - فرض بال بال موتی پرو دئے گئے تو سنگار ختم ہوا - اور اب یہ مہتاب محبت اپنے چکور کے انتظار میں ہو بیٹھی —

خدا خدا کرکے وقت کٹا - انطونی احباب کو لئے آن پہنچا - شامیانے میں قدم رکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں - گزری باتیں یاد آگئیں - اُدھر شکایت تھی - ادھر ندامت تھی - مگر آنکھیں چار ہوئیں تو مروت نے لاج رکھ لی - بات نہ بڑھی - انطونی کو کوئی اور بات نہ سوجھی تو لگا ایک ایک چیز کی تعریف کرنے - مگر وہ متانت کی دیبی خاموش تھی - کہا تو یہ کہا : خوشی تو اس کی ہے کہ آپ ان چیزوں سے خوش ہیں - مگر اصل خوشی اس سے ہو کہ جو کچھہ حاضر ہے وہ بطور نذرانۂ نیاز قبول ہو - ذرا دیکھئے گا - باتوں باتوں میں کیا کہہ گئی - کنایہ یہ کہ خوش نظر سامان کے ساتھہ خوش ادا میزبان بھی نذر شباب ہے ! اصل پوچھو تو یہ باتیں اسی سمجھہ دار ملکہ کا حصہ تھیں جو مصر کے اینٹ پتھر نہیں ! جرار دلوں پر حکومت کرنا جانتی تھی —

قصہ مختصر کلو پترا بہترا جھکی - انطونی کی سرشت بدلنی تھی نہ بدلی - آخر وہ وقت آیا کہ آک تی ویں سے لڑائی ٹھن گئی - اس لڑائی کے لئے بڑی بڑی تیاریاں ہوئی تھیں - کوئی تین سو جہاز تو انطونی ہی نے ساتھہ لئے تھے - ساتھہ کلو پترا نے بھیجے - اسلحۂ حرب کے ساتھہ ساتھہ انطونی نے بھی پوری قوت صرف کی کہ میدان اس کے ہاتھہ رہے - مگر جہاں عروج ہے - وہاں زوال بھی ہے - لڑائی کا رنگ بگڑتا ہی گیا - کلو پترا نے یہ طور دیکھے تو بہت گھبرائی - اور انطونی کے ایما سے مصر کا رخ کیا - کہتے ہیں : اس کے بعد ہی ایک معرکہ کارن پڑا - اس پر انطونی نے چاہا تھا : جاں توڑ کوشش کر کے بگڑی بنا لوں گا - مگر بخت بھی تو یاور ہوتا - آخر اسے جب بالکل مایوسی ہو گئی تو یہ بھی بھاگ نکلا - دیکھا کہ دور کلو پترا کی کشتی کے ارغوانی بادبان اڑ رہے ہیں - اور کشتی خوشی کی گھڑی کی لوح قیاس نہیں ٹھہرتی ہے - ایک تیر ہے کہ پانی کو پھاڑتا چلا جاتا ہے - جہاں سے گذرتا ہے ' پیچھے پیچھے پانی پر لکیر سی بن جاتی ہے -

انطونی نے کشتی کا پیچھا کر شاموں شام ایسے جا لیا اور کلو پترا کو جہاز میں بٹھا اسکندریہ جا پہنچا - یہاں یہ شاہی محل میں داخل ہوے تو دیکھا عیش و عشرت کا وہی سماں ہے - میرا ثنیں گا رہی ہیں - ناچ ہو رہا ہے - روشنی کا یہ عالم ہے کہ رات دن بن گئی ہے - اور محل کے در و دیوار سے ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے خوشی کی ایک لہر آئی ہوئی ہو - ارض شام کی دو شیزہ لڑکیاں کافوری ہاتھوں میں کافوری شمعیں لئے دروازے سے دیوان خاص تک دورویہ کھڑی ہیں - ان کی کالی کالی کاکلیں گورے گورے شانوں پر پڑی ہیں - نصف سینہ برہنہ ہے - نصف پر چپتے کی کھالیں حمائل ہیں - اجلو پہلو سندر کیاریاں ہیں - کیاریوں میں مرمریں حوض - جن میں اے سیتس دیبی کے برہنہ مجسمے اس طرح بنائے گئے ہیں جن کے اسفقتے سینوں سے فوارے چھوٹ رہے ہیں - غرض کلو پترا انطونی کے ہاتھ کے سہارے ساون بھادوں میں ہوتی ہوئی اس کمرے میں آئی - جہاں عموماً یہ آرام کیا کرتی تھی - اس وقت چاند کی روشنی اس طرح چھن چھن کے آرہی تھی - جیسے سوتے میں صبح کی پیاری کرنیں روز اس کے رخساروں سے کھیلتی تھیں یا سنہری تیتری کی طرح اس کے اوپر منڈلانے لگتی تھیں —

لیکن حواس بجا ہوتے تو یہاں دل لگتا - تھوڑی ہی دیر میں طبیعت اکتا گئی - یہ یہاں سے نکل اب ساحل والے مقبرے میں چلی گئی - اور تہیہ کر لیا تھا کہ ادھر آک ٹی وین نے اسکندریہ فتح کیا اُدھر وہ جان دے یگی - آک ٹی وین پھر تعاقب کرتا چلا آتا تھا - وہ دھن کا پکا بھی مارا مارا اسکندریہ آن پہنچا - انطونی نے پھر مقابلہ کیا اور جان توڑ دی کہ اس وقت شاہی و فقیری - عزت و ناموس اور موت و حیات کا تصفیہ تھا - لیکن ہرے وقت کو کیا کرتا - سارے جتن گئے - کوئی تدبیر پیش نہ گئی - آخر یہاں بھی ہزیمت اٹھائی اتفاق دیکھئے

کہتے ہیں: معرکہ کارن پڑ رہا تھا - گھمسان کی لڑائی تھی - ایکا ایکی یہ خبر اڑ گئی کے انطونی مارا گیا - اب کیا تھا پیر اکھڑ گئے - ساری فوج تتر بتر ہو گئی - غنیم کو موقع ملا - وہ فتح کا پھریرا اڑاتا درانہ شہر میں گھس پڑا - کلو پترا کو بھی منت سمت کی خبریں مل رہی تھیں - اس نے جو سنا کہ پاشاہت کے ساتھہ چاہت کا بھی مزہ گیا - تو دل کے بند ٹوٹ گئے - غم کے فاسور پھوٹ نکلے - سونچا ہوگا : بے آبروئی کے جینے سے عزت کی موت بھلی ہے - اور ہوا بھی یہی کچھہ دیر بعد غنیم کی سپاہ داخل ہوئی تو دیکھا کہ سمر کی یہ عزیز سالکہ شاہی ملبوس پہنے ' دلہن بنے ' سہاگ سیج پر موت کی میٹھی نیند سو رہی ہے - اراس وفا داری کی مثال بھی اس شہزادی کے قدموں میں مری پڑی ہے - چار میاں دم توڑ رہی ہے - ادھر یہ درد انگیز منظر ہے - اُدھر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں انطونی تلوار بھونک کے خاتمہ کئے لیتا ہے - غرض اقبال کا رنگ اڑ رہا ہے - زوال کا سکہ بیٹھہ گیا ہے - عشرت کی طویل کہانی گویا عبرت کا امت سبق دیرہی ہے !

سچ ہے : تاریخ عالم کا یہ زرین ورق بھی بڑا پیارا مگر دنیا کی چاشنی لئے ہوے ہے - کون ہے جس کے منہ سے اس پر واہ کے ساتھہ آہ نہ نکلے گی - کون سا شاعر اور آرٹسٹ ہے جس کا فن و کمال اسکندریہ کے اس منظر لطف و یادگاری کو سراہ کر کلو پترا کا منت گزارنہ ہو گا - کون سا قصہ نویس ہے جو اس کے دم کو برکت سے آشنائی و بے وفائی کی دلچسپ چالنی تصویر نہ کھینچ سکے گا - مخالفین اسے شر مجسم بناتے ہیں - بنایا کریں - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا ہے : دنیا میں حسن بھی بجاے خود ایک بھلائی ہے —

آرٹ کو آرٹ کی خاطر دیکھنے کی اجازت ملے تو عرض کروں - کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اردو سٹیج پر بھی کوئی صاحب فن و کمال اس نیلی ناگن کو

زندہ کر دکھاے - سٹیج پر جہاں اور سندر مناظر دکھائی دیں - وہاں یہ بوی نظر افروز ہو کہ شام ہو رہی ہے - تو بتے سورج نے رنگ و نور کے دریا بہا دئے ہیں - اس سمے کلو پترا میدان جنگ سے گہرا کے شاہی کشتی میں آرہی چلی جاتی ہے - انطونی کی یاد چٹکیاں بھر رہی ہے - کبھی اٹھتی ہے - کبھی بیٹھتی ہے - کبھی ٹہلنے لگتی ہے - یوں بھی چین نہیں آیا تو کشتی کے پچھلے حصے میں آ گئی - یہاں کسی کا اس طرح انتظار ہے جیسے کوئی آبی پرند شکار کی تاک میں ہو - رخساروں پر ہلکا ہلکا پسینہ ہے - آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوے ہیں - گوری گوری برہنہ بانہوں اور افقی سینہ، پر دن کی واپسی روشنی لوٹ رہی ہے - شاہی لباس کا اُجلا اُجلا ریشمی آنچل شانہ سے اتر کر یوں پیروں میں آ پڑا ہے - جیسے وینس دیبی کے قدموں میں بادل یا ایڈا دیبی کے قدموں میں راج ہنس آگرا ہو - ارض شام کی کنیا پتریاں بانسری کی سریلی آواز پر ناچ کار ہی ہیں - چارسیاں کھڑی باتوں سے جی بہلا رہی ہے - لیکن اس ملکۂ حسن و عشق کے دل کو کسی طرح قرار نہیں - اور تو اور آنکھوں سے اوجھل قسمت نے موت و محبت کے دو فرشتے اس پر تعینات کر دئے ہیں - یہ مسکراتے جاتے ہیں اور یاس و آس کے پھول برساتے جاتے ہیں!

سید عبدالولی "عزلت"

از

شیخ چاند مدیر

گجرات میں مسلمانوں کی کم و بیش تین صدیوں تک ایک باجبروت حکومت رہی ہے - اس دور میں وہاں بے شمار اہل کمال گزرے ہیں - گجرات کے اسلامی شہروں میں احمدآباد اور سورت کو خاص اہمیت حاصل ہے - سورت میں سید سعداللہ نام ایک صاحب دل اور ذی علم بزرگ گذرے ہیں ' جن کا عالمگیر معتقد خاص اور مرید باصفا تھا ' چنانچہ عالمگیر نے اپنے رقعات اور فرامین میں ان کا ذکر جگہ جگہ بڑی تعظیم سے کیا ہے - سیدسعداللہ دراصل قصبۂ سلون (من مضافات صوبہ الہ‌آباد) میں پیدا ہوے تھے - گردیزی کا بیان ہے کہ " اصلش از معمورۂ بریلی است " سلون میں ان کے والد سید غلام محمد کے نانا شیخ پیر محمد مشائخین کبار سے تھے سیدسعداللہ نے نشوونما اور تعلیم سلون ہی میں پائی تھی - وہاں سے حرمین شریفین کا عزم کیا - چند روز ام‌القریٰ میں مقیم رہے - جہاں ان کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوی - وہاں کے چھوٹے بڑے آپ کے معتقد ہو گئے تھے شیخ عبداللہ البصری المکی (متوفی ۱۱۳۴ ھ) بھی ان کے طریقہ قادریہ پر مرید ہوے تھے - شیخ عبداللہ بڑے بلندپایہ‌عالم تھے - ان کو بالا تفاق استاد جہانیان کہا جاتا تھا - عرب و عجم کے علما ان سے فیض پاتے تھے - مکہ معظمہ سے

بندر سورت آے اور یہیں اقامت گزیں ہو گئے - شاہ عبدالشکور گجراتی کے مرید اور آخر عمر میں خلیفہ مقرر ہو گئے تھے ۲۷ جمادی‌الاول ۱۱۳۸ ھ کو سورت میں سپرد خاک ہوے —

سید عبدالولی " عزلت " سیدسعداللہ کے فرزند تھے - ان کی ولادت ۱۱۰۴ ھ میں بمقام سورت ہوئی ' ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد سے پائی ' اس وقت تک علوم عقلی و ذہنی تعلیم کے ساتھہ ساتھہ باطنی تربیت بھی ہوتی رہی - اہل دل بزرگوں کی صحبت و تعلیم کے فیض واثر سے ان کے کردار میں بلندی اور سیرت میں پاکیزگی پیدا ہوتی گئی —

گارساں‌دتاسی کا بیان ہے کہ والد کی زندگی میں (یعنے ۱۱۳۸ سے قبل دہلی خطاطی کی تعلیم پانے گئے تھے - والد کے ارتحال کے بعد طلب علم میں گھر سے نکلے - اورنگ‌آباد آئے جو علم و فن کا مرکز اور شعر و سخن کا گہوارہ تھا - دولت‌آباد کی بھی زیارت کی تھی چنانچہ عبدالوہاب افتخار دولت‌آبادی اپنے تذکرہ تالیف بے نظیر میں لکھتا ہے " از بندر سورت با اورنگ‌آباد و وارد قلعہ دولت‌آباد گردید و راقم الحروف را ملاقات دست داد " —

اورنگ‌آباد سے سورت گئے - سورت میں ۱۱۵۲ میں علامۂ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان سے ملے تھے چنانچہ علامۂ آزاد سرو آزاد میں لکھتے ہیں " فقیر را بعد مراجعت از سفر بیت‌اللہ (۱۱۵۲) در بندر سورت ملاقات او افتاد - خوش صحبت است ' موسیقی هندی خوب می داند " —

بندر سورت سے عازم شاہ جہاں آباد ہوے ۲۰ جمادی‌الاول ۱۱۶۴ ھ کو وہاں پہنچے اور ایک عرصہ تک مقیم رہے —

شاہجہاں آباد کے دوران قیام میں کئی اہل علم سے میل جول اور ربط ضبط رکھا جب تک وہاں رہے ارباب کمال کی آنکھہ کا سرمہ بنے رہے - ہر شخص نے قدر کی

کہا جاتا ہے کہ ان کو خان آرزو سے خاص عقیدت تھی اور غالباً ان کے تبحر و جامعیت سے بہت کچھ فیض پایا - میرتقی ' میر ' جن کی دنیا ہی الگ تھی ' عزلت سے بڑی عقیدت رکھتے تھے - چنانچہ ' میر صاحب ' نے نکات الشعرا میں ان کا ذکر جگہ جگہ بڑے احترام سے کیا ہے - نکات الشعرا کے سال تصنیف سے کچھ ہی قبل (۱۱۶۴ میں) عزلت شاہجہان آباد پہنچے تھے لیکن اپنی طبیعت اور کردار سے انھوں نے لوگوں کو جس طرح متاثر کیا اس کا حال ' میر صاحب ' کی زبانی سنئے :—

" عزلت . . . . . درویش ' عالم ' فاضل ' اور متوکل ہیں فارسی میں مشق سخن کرتے ہیں ' لیکن ان کا میلان طبع ریختے کی طرف زیادہ ہے - ہندوستان میں کہ عبارت ہے شاہ جہاں آباد سے تازہ وارد ہوے ہیں سخن سے پوری مناسبت رکھتے ہیں - ان کے اسالیب کلام سے واضح ہوتا ہے کہ درد مندی سے بہت بہرہ رکھتے ہیں - اس کمال کے باوجود ان کے مشرب میں اس قدر وسعت ہے کہ پانی کی طرح ہر رنگ میں گھل مل جاتے ہیں - فقیر سے گرم جوشی سے پیش آتے ہیں - مرد با استقامت ہیں خدا ان کو سلامت رکھے " —

(ذاتی ترجمہ از نکات الشعرا)

شاہ جہاں آباد کے دوران قیام میں عزلت کو اپنی طبیعت کی جولانیوں کے دکھانے کا کافی موقع ملا وہاں ان کے فضل و کمال کے حقیقی قدردان تھے - عزلت پر اس قیام کا خاص اثر پڑا ' جس کو وہ بہت کم بھول سکے چنانچہ ان کا ایک شعر ہے :—

گلشن دہلی میں الفت کا یہ آب و رنگ تھا
اے خدا وہاں ایک بت ہر شیشۂ دل کے سنگ تھا

دو شعر اور ہیں جن میں دلی کی تعلیمی عظمت کی بربادی کو رویا ہے —

تھے دلی کے لونڈے مرد و ارباب تمیز
جب بیٹھتے تھے سب عاقل و اہل تمیز
اب ایک زمانہ نہیں خرد مند و شجاع
وہاں کا رکن ہیں اب بس کہ سب احمق وحیز

یہ اشعار ان کے دل کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں جس میں دلی کی عظمت کی یاد دفن تھی —

عزلت دہلی سے بنگالہ گئے اور وہاں نواب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ کی رفاقت حاصل کی - وہ اپنی زندگی بھر ان کے حال پر بطور خاص مہربان رہا - یہ بھی اس کی وفات تک وہیں رہے - بنگالہ میں بعض سخن سنج جمع ہو گئے تھے جن میں فقیہ ' دردمند اور گیری (دکنی) قابل ذکر ہیں جو شاہ ولی اللہ کے مرید اور مظہر جان جاناں کے عزیز شاگرد اور ایک باکمال سخن ور تھے - ان کے ساقی نامہ کو ایک زمانہ میں غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل تھی حسان الہند علامہ آزاد جیسے استاد فن اس کے معترف و معترف تھے - درد سنہ دہلی سے ۱۱۶۴ میں بنگالہ پہنچے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ عزلت کے بنگالہ پہنچنے تک وہ وہیں تھے اور غالباً عزلت کی ان سے معاصرانہ چشمک بھی رہی ہے جس کا بڑا ثبوت عزلت کی مثنوی " بیان ظہور " ہے جو محض ساقی نامہ دردمند کے جواب میں تقریباً معاندانہ حیثیت سے لکھی گئی تھی —

صاحب محبوب الذمن کا بیان ہے کہ وہ اکبرآباد بھی گئے تھے - تفصیلات معلوم نہیں - دیگر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ۱۱۷۱ھ میں بنگال سے اورنگ آباد آئے - اس کو اپنی سکونت کے لئے پسند کیا - نواب ناصرجنگ بہادر نے مایحتاج سے بے فکر کر دیا - جب نواب موصوف شہید ہوئے تو حیدرآباد آئے جہاں نواب

نظام علی خاں ان کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آتے رہے - بقول مولف تکملہ بہارستان سخن جاگیر اور بقول شفیق صاحب گل رعنا مدد معاش میں ایک موضع مرحمت فرمایا جس کی آمدنی سے وہ بسر بسر کیا کرتے تھے - حیدرآباد میں وہ ہمیشہ درویشانہ اور صوفیانہ گزارا کرتے تھے -ان کے گرد ہمیشہ شوق مند اور اہل طلب جمع ہوا کرتے تھے - وہ درس دیا کرتے تھے - ہر طبقے اور ملت کے لوگ ان کے اطراف جمع رہتے تھے ' خصوصاً امرا ان کے بڑے معتقد تھے ان کی صحبت میں ہمیشہ علما ' شعرا اور ارباب فضل و کمال رہا کرتے تھے —

خطاطی ' موسیقی ' مصوری ' شاعری ' حفظ قرآن ' معقول ' منقول میں خاص پایہ رکھتے تھے ' اس لئے ان کے فیض سے کثیر التعداد شوق مند مستفید ہوتے تھے چنانچہ ہر فن میں ان کے کثرت سے شاگرد تھے - اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر علم مطلق جہاں سے اٹھ جائے تو میں اس کو از سر نو مرتب کرونگا - فن مناظرہ کے بڑے دلدادہ اور اس میں یکتا تھے -علما سے ہمیشہ مناظرہ کیا کرتے تھے - علمائے وقت ان کو ارسطوئے زماں کہا کرتے تھے —

عزلت بڑے رنگین مزاج ' زندہ دل ' یار باش پابند تسلیم و رضا اور صلح کل کے جوگی صوفی منش اور فقیرے رہا تھے - اس لئے ہر ملت و مشرب کے لوگوں کے ساتھ بڑا پرلطف ربط ضبط رکھتے تھے ' صحبت پرست ' وضع دار ' مسافر دوست اور مہمان نواز تھے —

ربیع الاول میں بارہ روز تک میلاد مبارک کی مجلس کرتے تھے - عمدہ عمدہ کھانے پکواتے تھے - عمائد شہر اور مشائخین وقت جمع ہوا کرتے تھے ' مدعوین کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے خود آقا بابر اور میلاد پڑھ کے بزرگوں کے ہاتھ دھلاتے تھے ' محرم میں دس روز تک شہدائے کربلا کے بیان میں خوش الحانی سے مرثئے اور نوحے پڑھتے تھے —

غلام علی موسوی قادری نے مشکوۃ النبوۃ میں لکھا ہے کہ امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور قاقسال اورنگ آبادی کا بیان ہے "ملامتیہ مشرب دارد" ان کے تشیع کی نسبت جو خیال ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا - عزلت کے آبا و اجداد پکے سنی تھے - خود ان کے والد ایک سنی عالم اور عالم گیر کے تقریباً مرشد تھے، اور شاہ عبدالشکور گجراتی کے طریقہ قادریہ پر مرید اور خلیفہ ہوئے تھے - عزلت کی تعلیم و تربیت بھی ایسی جگہ ہوئی تھی جہاں تشیع کو بہت کم دخل ہو سکتا تھا - اصل یہ ہے کہ عزلت مذہب و ملت کے شرمناک تفرقوں اور حیا سوز جھگڑوں سے بہت دور تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر مذہب و ملت اور مشرب و مشغلہ کے لوگوں کے ساتھ بہت ہی پر خلوص میل جول رکھتے تھے - غلام علی موسوی قادری کو ان کے تشیع کی طرف جو گمان ہوا ہے غالباً اس کی وجہ اہل تشیع سے میل جول اور ان کے وہ اشعار ہیں جو حضرت علی اور آل علی کی منقبت میں فرط محبت و عقیدت سے بے خود ہو کر لکھے گئے ہیں —

عذاب قبر سے وے گا نجات عشق علی
کہ زیر خاک ہے آخر ابوتراب سے کام
سر جھکے، تن جھکے، اعضا جھکے ہے
حشر میں آویں گے سارے مصطفیٰ کے سامنے

لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ وہ اہل تشیع سے تھے اور سنی نہ تھے - حق یہ ہے کہ ان کا آئینہ دل ان کدورتوں سے بہت پاک تھا ان کے مشرب میں بہت وسعت تھی - ایک جگہ انہوں نے بالکل سچ لکھا ہے:—

دلوں میں رہئے جہاں کے ولے خدا کے تھب
کہ ہو جہاں پہ نہ ظاہر یہ ہے میرا مذہب

عزلت بڑے رند مزاج اور آزاد منش تھے - وہ ظاہری رسمی جکڑ بندوں سے

ہمیشہ آزاد رہنا چاہتے تھے - لباس کے معاملہ میں بھی عام رواج اور رجحان کی پروا نہ کرتے تھے - داڑھی مونچھوں کا صفایا کرتے تھے - لباس بھی بدل دیا تھا ' خرقے کو گیروانہ (بگھوے) رنگ ' میں رنگ کر پہنا تھا - چنانچہ اپنے اردو دیوان میں ایک جگہ لکھتے ہیں :—

" وقتیکہ فقیر لباس خرقہ را رنگ بگھوہ کردہ پوشید حضرت سید قدس سرہ ایں دوھرہ گفتہ :—

گپت بھلو رنگ پیم کو پرگھت جوگ کیوں لیں
من نرنگو کپڑے رنگو ' نرگن ' یہ کیا کیں

فقیر ' عزلت ' ایں دوھرہ در جواب گفتہ نمود ' ھماں روز ھمہ نعمت ھا بخشیدند

پیم چھپاؤں نرگن من گپت جوگ رنگ لیں
روم روم وہ رنگ ابچ پس بھگوھی کیں

اس پر نظر کرتے ہوئے غالباً قاقشال اورنگ آبادی نے لکھا ہے : "عزلت . . . . . ملائمیہ مشرب دارد ' ریش و بروت تراشیدہ بوضع رندان می باشد " —

' عزلت نے اپنی طبیعت ' کردار ' علم ' فضل اور کمال سے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی تھی ' ہر شخص ان کو غنیمت جانتا تھا - اور شفیق نے جو صائب کا یہ شعر ان کے حق میں لکھا ہے بالکل سچ ہے ' اساتذہ وقت اس کی نسبت یہی رائے رکھتے تھے —

دریں زماں کہ عقیم است جملہ صحبت ھا
کنارہ گیر و غنیمت شمار ' عزلت ' را

' عزلت ' نے ۲۶ رجب ۱۱۹۸ ھ کو پچاسی سال کی عمر میں رحلت فرمائی - اور حیدرآباد میں میر مومن کے دایرہ میں سپرد خاک ہوے —

' عزلت ' کے علم و ہنر اور فضل و کمال سے بہت کم چیزیں یادگار ہیں

تذکروں میں اس کا مختصر ذکر ملتا ہے - معقول و منقول میں ان کو جو تبحر حاصل تھا اب اس کے تحریری نشاں ہیں اور نہ مصوری ' خطاطی وغیرہ کے نمونے - البتہ ان کی شاعری اور ایک حد تک موسیقی کے کمال کا اندازہ ان کی بعض تصانیف سے ہوتا ہے جس کو ہم ذیل میں حوالہ قلم کرتے ہیں - " عزلت " کے لئے شاعری کوئی ذریعہ عزت اور وجہ امتیاز نہ تھی - ان کا مرتبہ بحیثیت ایک عالم کے بہت بلند ہے ان کے معاصرین ان کے علم و فضل کے زیادہ قائل و معترف تھے ' شاعری وہ اپنے ذوق کے تقاضے سے کرتے تھے - " قائم " نے لکھا ہے " شاعر دوستی در مزاج او بہ مرتبہ بود بلکہ برائے مناسبت ایں طایفہ گاہ گاہ خود ہم دو سہ بیت موزوں می‌کرد " یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ وہ کبھی کبھی دو تین بیتیں موزوں کر لیا کرتے تھے ' اس لئے کہ ان کے دو ضخیم دیوان موجود ہیں ' ایک فارسی اور ایک اردو —

' عزلت ' فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے ' لیکن ان کا میلان طبع ریختہ کی طرف زیادہ تھا - دوہے ' جھولنے ' وغیرہ بھی بہت خوبی اور بے تکلفی سے کہتے تھے - ان کے دونوں دیوان موجود ہیں - ہمیں دونوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے —

فارسی دیوان جس میں بقول شفیق کم و بیش چودہ ہزار ابیات ہیں میری نظر سے گزرا - یہ دیوان اسلامیہ لائبریری احمد نگر میں موجود ہے - محفوظ حالت میں نہیں ہے ' اور نہ اس کی حفاظت کا کسی کو دماغ ہے —

اردو دیوان کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ایک تو اسلامیہ لائبریری احمدنگر میں اور دوسرا مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے کتب خانہ میں - احمدنگر والا نسخہ اچھی حالت میں نہیں ہے آخر کے دو تین ورق خراب جارہے ہیں مولوی صاحب مدظلہ کے کتب خانہ کا نسخہ اب اچھی حالت میں ہے - شروع کا ایک ورق

اور آخر کے چند ورق غائب ہیں درمیان سے بھی ایک ورق تلف ہوگیا ہے جس کی وجہ سے " بیان ظہور " کے گیارہ شعر کم ہو گئے ہیں - اس دیوان میں - دو ہزار اور چند سو ابیات ہیں - ساقی نامہ (بیان ظہور) رباعیات ' بارہ ماسی' پہیلیاں ' مکرنیاں ' کبت ' دوہے ' جوڑنے ' سورٹھ ' سوال جواب سب کچھ ہے —

عزلت کی فارسی شاعری کی نسبت اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اس دور کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں فارسی کا ٹمٹماتا چراغ آخری سنبھالا لے رہا تھا - فارسی کو اردو بے دخل کرتی جا رہی تھی - شعرا فارسی میں رسماً طبع آزمائی کرتے تھے ورنہ ریختہ کا بازار گرم تھا اور ہر چھوٹا بڑا شاعر اسی میں طبع آزمائی کرتا تھا - اس میں شبہ نہیں اس زمانہ میں خان آرزو آزاد بلگرامی ناصر علی سرہندی' ایجاد' سامی' شفیق' حاکم' واقف وغیرہم جیسے اساتذہ فن موجود تھے ' جن سے فارسی شاعری کی محفل گرم اور بارونق تھی ' لیکن عام طور پر ریختہ کا زور شور تھا —

عزلت کی فارسی شاعری کا بحیثیت مجموعی وہی رنگ ہے ' جو اس زمانے کی شاعری میں پایا جاتا ہے - آزاد بلگرامی کا اس زمانہ کی شاعری اور اس کی آئندہ ترقی کی نسبت خیال ہے : " از عہد سلطان محمود (غزنوی) تا زمان موجود رتبۂ شعر فارسی از کجا تا بکجا رسید و این نہال بلند اقبال از زمین تا فلک الافلاک بالید لما این کہ گویند کہ مضمون نماندہ غیر مسلم است زیرا کہ فیض مبداء فیاض لاستناہی است اگر مضامین تمام شود نقصان این کس سہل است ' نقصان مبداء فیاض می آید کہ تہیدست شدہ از فیض رسانی باز ماند " —

بلاشبہ آزاد بلگرامی اور ان کے بعض امثال و اقران فارسی کے مسلم الثبوت اُستاد اور فن کے کامل ماہر تھے لیکن زمانہ کی روش اور عام بہاؤ نے ان کے اثر کو وسعت پذیر ہونے نہ دیا - عزلت بھی ابتداً فارسی ہی میں طبع آزمائی کرتے

تھے چنانچہ ان کے دیوان کی ضخامت (۱۴ ہزار ابیات) سے اس کا ثبوت ملتا ہے ' لیکن ان کا رجحان طبع ریختہ ہی کی طرف تھا - فارسی میں بھی وہ بڑا تبحر رکھتے تھے - ہم ذیل میں وہ شعر نقل کرتے ہیں جو علامہ آزاد کے منتخبہ ہیں ' عزلت ' نے اپنے دیوان کا منتخب علامہ آزاد کو بھیجا تھا ' جس سے سرو آزاد میں یہ چند شعر درج کئے گئے ہیں :—

نشود مرا کسی کوہ گر از جا برداشت رستم است آنکہ دل دوست ز دنیا برداشت
بر گرم جوشی یاران عصر تکیہ مکن کہ چوں معانقۂ عید اعتمادی نیست
دوستان از دوستان مروم و دشمن کامیاب چیدہ ام گل خار از نہال شمع کل پروانہ سوخت

دلم افسردہ خواہد ماند تا وامی شود روزے
ندانم غنچہ ام در دست گلچیں یا صبا افتد
خدا نا کردہ گر صیاد از دامم رہا سازد
اسیر حلقۂ بر گردد سر گردیدنش گردم
سر بر نداشت نکہت گلشن ز شرم او
بوئے گلے نبود کہ پا در حنا نداشت

عزلت جس طرح بحث مباحثہ اور مناظرہ کے دلدادہ تھے اسی طرح شعرا پر بھی کبھی اعتراضات کرتے تھے - ان کی بعض شعرا سے معاصرانہ چشمک ہوتی تھی چنانچہ تذکروں میں یہ سب مذکور ہے —

شفیق اورنگ آبادی کا ایک فارسی شعر ہے :—

ہلال عید خم خم بر سر کوے تو می آید
کتاں پرچہ را نازم کہ بروے تو می آید

عزلت نے اعتراض کیا کہ کتاں کو ہلال سے کوئی مناسبت نہیں بلکہ ماہ سے ہے شفیق نے اپنے استاد علامہ آزاد کو لکھا ' آزاد نے میرزا محمد علی دانابن سلا

محمد سعید اشرف سازندہ رافی اور مرزا مبارک واضح دونوں کے دو شعر سند میں لکھ بھیجے —

دانا :— چوبدر شود با دلم چہ خواهد کرد
هلال یک شبہ ابروت کتانم رفت

واضح :— مہ نو چاک کتاں چوں شد عجب نبود
لب زخم دلم از دور بوسد رکابش را

یہ خود شفیق کا بیان ہے جس کو اپنے تذکرہ میں بحیثیت مولف اس واقعہ کے ذکر سے فایدہ اٹھانے کا کافی موقع تھا ورنہ عزلت کی جامعیت و تبحر کے مقابلہ میں شفیق طفل مکتب ہی تھا —

عزلت کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ان کے اردو دیوان کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے - دیوان خود مرتب کیا تھا - تدوین دیوان کی وجہ دیباچہ میں بتائی ہے جو اردو نثر میں بہت دلچسپ طریقے سے لکھا گیا ہے اس کا ایک حصہ ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے اس سے اس دور کی نثر کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور عزلت کے اسلوب بیاں کا بھی پتہ چل جائے گا :—

" اما بیچھے عجز و درود کے فقیر سید عبدالولی عزلت بخشے اسے الی الحقیقۃ پتر حضرت سید سعداللہ قدس سرہ کا زبان بیچوہری سے عرض کرتا ہے کہ کیتے جلے ہوے دم آتش خانہ دیواں ہندی سے نکال کر اوراق پریشاں بیانی میں جمع کئے ہیں تا دوستوں مابیں ہم چہاں فراموشوں کا یادگار رہے ' اور اس کے سب مصرعے سوختگی مضامیں سے بزم سخن کی شمع کئے ہیں تا چراغ معنی کے پروانہ صورتوں کے آنکھ ہمارے خیال میں اشک

باری رہے اور اس کی ہر بیت بہار جنوں میں مصرعوں کے
دو ہاتھ سے گریباں پھاڑ رہی ہے - اور ہر سطر ایک دیوانہ
مضموں جنوں کو زنجیر کر سرمۂ سوختگئی بیاں سے خموشی
کے نالے پکار رہی ہے - درست فکروں کے ٹوٹتے ہوے دلوں کے
پسند کر اے رب العباد بمحمد و آلہ الا سجاد "

عزلت ایک جدت طراز اور نازک خیال شاعر تھے ' ان کے کلام میں جابجا اس کے آثار پائے جاتے ہیں - وہ تقلید کے رسمی جکڑ بندوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ماحول سے ہٹ جاتے ہیں اور اپنی جدت نہاد طبیعت کی جولانیاں دکھاتے ہیں - ان کے کلیات میں غزلیں بکثرت موجود ہیں - جن میں خیال زبان اور بیاں کی بڑی ندرت اور جدت ہے - نمونہ کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں لیکن زبان کی قدامت اور اس کی ابتدائی سیال حالت بھی ملحوظ رہے - عزلت کی شاعری کم و بیش دو سو سال قبل کی زبان کا نمونہ ہے :—

اسیری بے مزہ لگتی ہے بن صیاد کیا کیجے
قفس کے کنج میں تنہا عبث فریاد کیا کیجے

اہل درد نہ آیا نظر جہاں دیکھا
جرس کے نالے سے خالی یہ کارواں دیکھا

بگولا بن کے آئیں وجد میں عشاق کی خاکیں
بجز فریاد عزلت کون یہ دھومیں مچا جانے

عبث تو رہا میرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہ آئینہ تھا ' تجھ خودبیں کے اترانے کے کام آتا

غنیمت بوجھ لیویں میرے درد آلود نالوں کو
یہ دیوانہ بہت یاد آویگا شہری غزالوں کو

ہاتھہ کھجلاتے ہیں سینہ رک گیا آئی بہار
ہم ہیں دامن گیر صحرا اے گریباں الوداع
میں وہ مجنوں ہوں نہ آباد نہ اجڑا سمجھوں
مشت خاک اپنی اڑا کے اسے صحرا سمجھوں

معلوم ہوتا ہے آخر عمر میں دوست احباب کے اس دار فانی سے کوچ کرنے کا ان کو خاص صدمہ ہوا تھا - ان کے اشعار میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں یاس کی جھلک نمایاں ہے :—

مقام زندگی سے کوچ کرگئے جلد یار اپنے
وہ منزل پہنچ گئے اور ہم باندھتے رہ گئے بار اپنے
کب لگ احباب کا غم مجکو دکھاوے گا فلک
خاک ہوگئے ہیں بہت اور ہیں چلن ہار کئی
بجز رفاقت تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

دو قطعے ہیں ' امید ہے کہ پسندخاطر ہونگے —

ملی تھی خلد میں ' عزلت سے کوہ کن کی روح
کہا میں اس کو ارے سر چڑھے یہ کیا تھی ہوس
ترے تو سر میں بھرا تھا خیال شیریں کا
نہ مار نا تھا تجھے تیشہ اس پر اے بیکس
کمال عشق نہیں کھونا جان کا ورنہ
مریں ہیں شیریں پہ ہر روز لاکھہ مور و مگس

گیا میں فصل گل میں ' میکدے ' عشرت کے ساماں تھے
ادھر تو زمزمے قلقل کے ' ادھر شور باراں تھے
نہ تنہا سبحہ گرداں سبھیچے تھے دور ساغر سے
کہ ساجد چوطرف سے قبلہ گاہ خم کے مستاں تھے
سنا جب میں نے یغما محتسب کا ' پھر گیا ایک دن
تو کیا دیکھوں کہ چاروں گوشے میخانے کے ویراں تھے
بھر آئی چھاتی میری دیکھہ وہ عشرت کدہ خالی
کہا میں کیا ہوا کیدھر گئے وہ یہاں جو میہماں تھے
گریباں پھاڑ رو رو کر کہا مجھکو گلابی نے
کہ یہاں پیالے تھے ' وہاں شیشے تھے یہاں خم تھے سبو وہاں تھے

' عزلت ' کے کلام میں جہاں صاف سیدھے اور بے تکلف اشعار ہیں صنایع سے مملو اشعار بھی پائے جاتے ہیں - ممکن ہے کہ صنعتوں کا ایسا التزام جس سے شعر کی خوبی زائل ہو جاتی ہو اس زمانہ میں پسند ہو - لیکن اب تو اس میں صاف تصنع اور آورد کا عیب نمایاں ہو جاتا ہے - کہیں کہیں صنعتوں کے التزام سے اشعار میں دل کشی پیدا ہو گئی ہے —

' عزلت ' کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ہے - کہیں کہیں یہ بہت لطیف اور پاکیزہ ہے - لیکن کہیں کہیں اس میں ہزل کی شان پیدا ہوگئی ہے - یہ عزلت کی جدت پسند طبیعت کا ایک دوسرا رخ ہے - ہزل اور تمسخر آمیز مضامین اس زمانے میں کچھہ زیادہ معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے - یہ کچھہ تو زمانے کے مذاق اور کچھہ عزلت کی آزاد فطرت کا اثر ہے - تاہم ایسے فاضل اور یگانہ روزگار کے کلام میں یہ عیب موجب حیرت ہے - مجھے صاحب گلزار ابراہیم کی رائے کا یہ حصہ بہت صائب معلوم ہوتا ہے عزلت . . . . . باوصف فضیلت

اقوالش خالی از سبکی و هزالی نه بود " —

' عزلت ' کے کلام کی ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے ان کے کلام میں جابجا ٹھیٹ ہندی کے الفاظ اور اصطلاحات بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوے ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ اس دور میں ہندی الفاظ کا بے تکلف استعمال ہوتا تھا لیکن اس میں عزلت نے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے -اس کی وجہ ان کی ہندی دانی ہے وہ ہندی زبان کے بڑے ماہر تھے - خود بھی ہندی شاعری کرتے تھے - ہندوستانی تلمیحات اصطلاحات اور ہندو دیو مالا کے ذخیرہ سے بڑی مدد لیتے ہیں —

بیان ظہور :—

یہ ساقی نامہ ہے جو فقیہ درد مند کے ساقی نامہ کے جواب میں سنہ ۱۱۷۴ میں لکھا گیا تھا - اس میں ۳۴۱ اشعار ہیں-بیان ظہور دیوان عزلت(مخزونۂ کتب خانہ مولوی عبدالحق) میں میری نظر سے گزرا ہے اس کا ایک درمیانی ورق تلف ہوگیا ہے جس سے ۱۱ شعر گم ہوگئے ہیں - درد مند کا ساقی نامہ بہت مقبول و مشہور رہ چکا ہے - اساتذۂ وقت نے اس کی بڑی تعریف کی ہے چند شعر نمونے کے لئے ملاحظہ ہوں —

ارے ساقی اے جان فصل بہار — یہی تھا ہمارا و تیرا قرار
ہماری بسر نے کی یہ فصل ہے — فراموش کرنے کی یہ فصل ہے
کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح — لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح
ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم — نشے سے بہکنے کی تجھ کو قسم
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں — تجھے اپنے سوگند کھانے کی سوں
تو نے کیا ہے مجھ پر حرام — تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
نہ اس سر کشی سے نہ کر پائمال — میرے خون کو مے کی طرح کر حلال
تیری جاں کی سوں فقیہ ہوں میں — سلیقے میں پیارے قیامت ہوں میں

میرا عقل میں کوئی انباز ہے　　ارسطو میرا ایک دوا ساز ہے
نظر کرتک چمن کی طرف　　شگوفے کو مستی سے آیا ہے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یہاں تلک　　کہ نرگس کی جاتی ہے گردن ڈھلک

عزلت نے اس کے جواب میں " بیاں ظہور " کیوں لکھا ؟ اس کی وجہ خود انھوں نے بتادی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اور درد مند سے بنگالہ یا شاہجہاں آباد میں معاصرانہ چشمک رہ چکی ہے :—

رفیقوں کی خاطر میں ایک شب گیا　　چمن میں کہ وہاں زور مہتاب تھا
چمن یار بن تھا مجھے زخم زار　　نمک چھڑکے تھی چاندنی بے شمار
چلا ذکر یاروں میں ہے " درد منہ "　　تیرا معنی ایجاد و اندازہ بلند
کہ ' مظہر ' کا شاگرد ہے ظاہرا　　تب اس کی حکایت کسی نے پترسا
پڑا آج کی رات کو اتفاق　　کہ سب ہوگئے جمع اہل وفاق

اس چشمک سے خود ' عزلت ' متنفر ہوگئے چنانچہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :—

عداوت کے چاند سے تھی امید
و لیکن ہوا مجھ کو معلوم بھید
کہ واقع ہوے ہم سے از بس گناہ
کئے نامہ کی طرح چہرے سیاہ

راگ مالا :—

یہ ایک مثنوی ہے جو ہندوستانی موسیقی پر لکھی گئی ہے اس میں تمام راگ اور راگنیوں کی کیفیت تفصیل سے بیان کی ہے - ہندو دیو مالا کی رو سے راگنیوں کی جو تصویریں فرض کی جاتی ہیں اور جو خواص بیان کئے جاتے ہیں ان کا ہوبہو

فوٹو الفاظ میں کھینچ کر دکھا یا ھے اس سے ' عزلت ' کے زور بیاں اور قدرت زبان کا اندازہ ھوتا ھے - اس مثنوی میں ایک خصوصیت یہ ھے کہ یہ خاص دھلی کی زبان میں لکھی گئی ھے - اس میں شبہہ نہیں اس زمانہ میں ادبی زبان کا مقامی فرق زیادہ نہ تھا تاھم روز مرہ میں بڑا اختلاف تھا - راگ مالا کے الفاظ ' اصطلاحات ' محاورات غرض زبان کا پورا خاکہ دھلی کا ھے زبان کی یہ خوبی اور نزاکت ن کی دوسری تصانیف میں کم پائی جاتی ھے - کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ھے - جس پر لکھا ھوا ھے :—

" مثنوی راگ‌مالا بہ زبان ریختہ روز مرہ اردو ے معلاے شاہ جہاں‌آباد از حضرت سید عبدالولی عزلت مدظلہ‌العالی " اس مثنوی سے عزلت کے ذوق موسیقی کا پورا اندازہ ھوتا ھے اور یہ صحیح طور پر معلوم ھوتا ھے کہ اس میں اس کو کیا رتبہ حاصل تھا اور یہ کہ وہ اپنے ذوق کے تقاضے سے یا حقیقی طور پر موسیقی کا فنون لطیفہ میں کیا درجہ قائم کرتے تھے —

انھوں نے راگ مالا کی ابتدا حمد کے بعد " عظمت سرود " سے کی ھے :—

خدا نے جب تن آدم بنا کر　　کہا " اے روح تو جا اس کے بھیتر "
کیا عرض آہ بھر کے روح نے یوں　　اندھیاری کھوتری میں جاوں کیوں
کہا تب ایک ملک کوں بیٹھہ تن میں　　تو بول ایک راگ آدم کے بدن میں
ملک بس سن کے تانیں . . . لے گئی　　ھو کے تن میں روح آگئی
سرود سے ھوا جیتا انسان　　جو سچ بولوں تو تھا وھی جان
نظام‌الدین ولی خسرو کو بولا　　کہ اے خسرو سار روحیں کر کے پیدا
الست بربکم سب کو سنایا　　میری جب روح کے کانوں میں آیا
وہ پرچہ پورے کا تھا یقیں‌جاں　　مجھے تو سوا ے ھے راحت جا ن
روایت ھے فیثا غورث اعلم　　مراقب جب ھوا وہ بند کر ' دم

کیا پرواز روحی قید تن سے گیا تا چرخ وہ اڑ کر بدن سے
سنا آہنگ افلاک اور ستارے تب اس کی روح نے کئی نعرے مارے
جب آیا ہوش سے اس کا بجادل لکھا تب موسیقی فن کو کامل
غرض فن موسیقی کا ہے عبادت جو یاد حق میں ہو اس کی سماعت

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ مسٹر ولسن کے پاس راگ مالا کا ایک نسخہ ہے جو دیو ناگری رسم الخط میں لکھا ہوا ہے —

ہندی شاعری :—

عزلت ہندی زبان کے بڑے ماہر تھے ان کے کلیات میں پہیلیاں مکرنیاں ' سوال جواب بارہ ماسی ' کبت دوہے ' جھولنے سورٹھ وغیرہ سب کچھ موجود ہے - ہندی میں وہ نرگن تخلص کرتے تھے - تذکروں میں اور حال میں بعض اصحاب نے غلطی سے اسے نرگس سمجھا ہے - صاحب محبوب الزمن نے اس کو ترکمن لکھا ہے - اور اس کی عجب مضحکہ خیز توجیہ کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ ترکلو (مسلمان) سے یہ ترکمان ہے ' جس کا مخفف ترکمن ہے —

عزلت کی جدت طبع ہندی میں بہت زیادہ جلوہ گر ہوتی ہے اس میں وہ بہت آزادی سے طبع آزمائی کرتے ہیں - ان کے تبدیل لباس کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو ہندی شاعری سے خاص لگاؤ اور مناسبت تھی - اور ہندی شاعری سے اور رسوم ترک دنیا (یوگ) سے وہ بڑی دل بستگی رکھتے تھے - ان کی طبیعت میں بڑی قلندریت تھی وہ شانتی میں مگن تھے - ان کے فطری ذوق نے ان کی شاعری میں غیر معمولی حسن پیدا کردیا تھا - ان کا ہندی کلام نہ معلوم کس مقدار میں تھا ' جو کچھ ہمیں دستیاب ہوتا ہے وہ ان کے اردو دیوان میں ہے عزلت رسمیات سے بہت دور رہتے ہیں - اس سے ان کی طبیعت ہمیشہ ابا کرتی ہے - وہ اپنی جودت ذہن اور جدت طبع سے گل

افشانیاں کرتے ہیں - پنکھہ ہندی نظم کی ایک صنف ہے اس کا ایک خاص وزن اختراع کیا تھا ' چنانچہ خود لکھتے ہیں :—

" ایں وزن پنکھہ مخترع عزلت است غفرہ‌الہ تعالے "

میں نے دیا تھا یہ دل تمہیں غنچہ سا تا کہ لطف کے نسیموں سے گل ہوگا
نہ کہ جیسے خزاں توڑکے اڑا ہی دوکے دیا خلق سما چار کا بھی گل ہو گا

اخیر میں بیاض عزلت کے متعلق اس قدر عرض‌ضروری ہے کہ ان کی ایک بیاض تھی جس میں شعرائے حال و متقدم کے حالات اور کلام کے نمونے درج تھے - اس بیاض سے میر تقی‌میر' قائم ' اور دیگر تذکرہ نویسوں نے بڑی مدد لی ہے - قدیم شعرا کے اکثر حالات اور کلام کے نمونے محض عزلت کی بدولت ان کو معلوم ہوے ہیں ' افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا —

عزلت‌ایک‌عالم فاضل بزرگ تھے - وہ بحیثیت شاعر اتنا بلند رتبہ نہیں رکھتے ہیں ان کا اپنے امثال و اقراں پر خاص اثر تھا - میرتقی میرعلامہ آزاد وغیرہم جیسے اساتذہ وقت ان کے معترف وقائل تھے ' یہ تھا ان کی حیات سیرت اور شاعری کا مختصر خاکہ جو بہت روا روی میں پیش کیا گیا —

کیا پرواز روحی قید تن سے　　گیا تا چرخ وہ اڑ کر بدن سے
سنا آہنگ افلاک اور ستارے　　تب اس کی روح نے کئی نعرے مارے
جب آیا ہوش سے اس کا بجادل　　لکھا تب موسیقی فن کو کامل
غرض فن موسیقی کا ہے عبادت　　جو یاد حق میں ہو اس کی سماعت

گارسان دتاسی کا بیان ہے کہ مسٹر ولسن کے پاس راگ مالا کا ایک نسخہ ہے جو دیو ناگری رسم الخط میں لکھا ہوا ہے —

ہندی شاعری :—

عزلت ہندی زبان کے بڑے ماہر تھے ان کے کلیات میں پہیلیاں مکرنیاں ' سوال جواب بارہ ماسی ' کبت دوہے ' جھولنے سورٹھ وغیرہ سب کچھ موجود ہے - ہندی میں وہ فرکن تخلص کرتے تھے - تذکروں میں اور حال میں بعض اصحاب نے غلطی سے اسے فرگس سمجھا ہے - صاحب محبوب الزمن نے اس کو ترکمن لکھا ہے - اور اس کی عجب مضحکہ خیز توجیہ کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ ترکلو (مسلمان) سے یہ ترکمان ہے ' جس کا مخفف ترکمن ہے —

عزلت کی جدت طبع ہندی میں بہت زیادہ جلوہ گر ہوتی ہے اس میں وہ بہت آزادی سے طبع آزمائی کرتے ہیں - ان کے تبدیل لباس کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو ہندی شاعری سے خاص لگاؤ اور مناسبت تھی - اور ہندی شاعری سے اور رسوم ترک دنیا (یوگ) سے وہ بڑی دل بستگی رکھتے تھے - ان کی طبیعت میں بڑی قلندریت تھی وہ شانتی میں مگن تھے - ان کے فطری ذوق نے ان کی شاعری میں غیر معمولی حسن پیدا کردیا تھا - ان کا ہندی کلام نہ معلوم کس مقدار میں تھا ' جو کچھ ہمیں دستیاب ہوتا ہے وہ ان کے اردو دیوان میں ہے عزلت رسمیات سے بہت دور رہتے ہیں - اس سے ان کی طبیعت ہمیشہ ابا کرتی ہے - وہ اپنی جودت ذہن اور جدت طبع سے گل

افشانیاں کرتے ہیں - پنکھہ ہندی نظم کی ایک صنف ہے اس کا ایک خاص وزن اختراع کیا تھا ' چنانچہ خود لکھتے ہیں :—

" ایں وزن پنکھہ مخترع عزلت است غفرہ‌الدہ تعالے "

میں نے دیا تھا یہ دل تمہیں غنچہ سا تا کہ لطف کے نسیموں سے گل ہوگا
نہ کہ جیسے خزاں توڑکے اڑا ہی دوکے دیا خاک سما چار کا بھی گل ہو گا

اخیر میں بیاض عزلت کے متعلق اس قدر عرض‌ضروری ہے کہ ان کی ایک بیاض تھی جس میں شعرائے حال و متقدم کے حالات اور کلام کے نمونے درج تھے - اس بیاض سے میر تقی‌میر، قائم ' اور دیگر تذکرہ نویسوں نے بڑی مدد لی ہے - قدیم شعرا کے اکثر حالات اور کلام کے نمونے محض عزلت کی بدولت ان کو معلوم ہوے ہیں ' افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا —

عزلت‌ایک‌عالم فاضل بزرگ تھے - وہ بحیثیت شاعر اتنا بلند رتبہ نہیں رکھتے ہیں ان کا اپنے امثال و اقراں پر خاص اثر تھا - میرتقی میرعلامہ آزاد وغیرہم جیسے اساتذہ وقت ان کے معترف وقائل تھے ' یہ تھا ان کی حیات سیرت اور شاعری کا مختصر خاکہ جو بہت روا روی میں پیش کیا گیا —

تبصرے

از

شیخ چاند مدیر

(۱)	اردو شہ پارے	(۳۳۰)
(۲)	گلشن گفتار	(۳۳۴)
(۳)	تلاش حق	(۳۳۷)
(۴)	رہنمائے صحت	(۳۴۱)
(۵)	قدیم افسانے	(۳۴۲)
(۶)	چینی اور جاپانی افسانے	(۳۴۲)
(۷)	اسلام کی امن پسندی	(۳۴۳)

تبصرے

اُردو شہ پارے

(مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری 'ایم' اے' عثمانیہ' پی ایچ ڈی (لندن) تقطیع کلاں ' صفحات ۳۵۶ ' لکھائی چھپائی اچھی ' کاغذ عمدہ قیمت چھ روپیہ بارہ آنے - ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن)

ہر شخص کی تعلیم میں اس کے ملکی ادب کو خاص جگہ ملنی چاھئے اور جو شخص ادب کے وسیع میدان میں قدم رکھنا چاھتا ھے اس پر لازم ھے کہ وہ پہلے اپنے ملکی ادب کے شہ پاروں سے واقف ھو جائے - یہ ھماری بد نصیبی ھے کہ اردو ادب کے شہ پارے منتشر ' پراگندہ اور نہ معلوم کس گنج خمول میں ھیں کہ ان تک ھماری دسترس آسانی سے ممکن نہیں ' یہی وجہ ھے کہ ان کو روشناس کرانا بہت دشوار ھے - مقام مسرت ھے کہ ھماری جامعہ کے بعض فارغ التحصیل طالب علموں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ھے اس کی پہلی جلد ھمارے پیش نظر ھے اس کے مرتب ڈاکٹر محی الدین قادری زور ھیں - یہ ابتدائے ادب اردو سے ' ولی ' تک کے اردو شہ پاروں پر محتوی ھے - اِس کی ترتیب زیادہ علمی اور اصولی نہیں ' اس کو ادب کے رجحانات کے اعتبار سے مرتب نہیں کیا گیا ' بلکہ ایک آسان راہ اختیار کی گئی ھے ' مختلف ادب پرور درباروں کے تحت شعرا اور

ادبا کا مختصر ذکر کیا گیا ہے - ان کے کلام پر رائے دی گئی ہے اور کلام کے نمونے دئے گئے ہیں - جن حضرات نے اردوے قدیم کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ ترتیب اسی بنیاد پر کی گئی ہے - اس کے چار باب ہیں - پہلے باب میں اردو ادب کی ابتدائی کوششوں کا حال ہے دوسرے میں دربار بیجاپور کی سرپرستی میں جس قدر ادب نے نشوونما پائی ہے اس کا ذکر ہے - تیسرے میں دربار گولکنڈہ کی ادب نوازی کا بیان ہے اور چوتھے میں عہد مغلیہ کا - گجرات کے شعرا اور مصنفین کا بھی ذکر ہے ' ہر باب کے متعلق مختلف ضمیمے ہیں - ایک ضمیمہ خاص طور پر ان مرثیہ گو شاعروں اور ان کے مرثیوں کی فہرست پر مشتمل ہے جن کا حال اور کلام اقتباسات کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے - اخیر میں ان سنین کا اندراج ہے جن میں خاص واقعات ظہور پذیر ہوے ہیں - فرہنگ اور اشاریہ بھی ہے —

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے شوق اور محنت پسند طبیعت کے تقاضے سے بہت اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ اس خدمت کو کماحقہ انجام نہ دے سکے —

اس جلد پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصد سے فاضل مرتب اس کو روشناس کرانا چاہتے ہیں اس کا حق پورا نہیں ہوتا اس میں بے شمار لغزشیں ہیں - پہلے تو بیچارے ڈاکٹر صاحب نے جو نمونے پیش کئے ہیں ان کو پورے طور سے نہیں سمجھے - اس کا بڑا ثبوت فرہنگ پر ایک نظر ڈالنے سے مل جاے گا - قدیم اردو کی لفظیات سے ڈاکٹر صاحب بہت کم واقف ہیں ' وہ الفاظ صحیح طور سے پڑھ نہیں سکتے ہیں تو ان کے معانی و مضامین کو سمجھنا اور بات ہے - ہم

چند الفاظ پیش کرتے ہیں جن کے صحیح تلفظ اور شکل سے ڈاکٹر صاحب قطعاً ناواقف ہیں انھوں نے یونہی اٹکل پچو نقل کردیا ہے —

پرگت کو ڈاکٹر صاحب نے پرکت ' کھرگ کو کھورک ' گگن کو گمن ' رگت کو رکت ' جاگرت کو جاگرت ' جگ کو جگ ' سنگل کو سنگل ' کنٹھ کو کنٹھ ' لوچن کو بوجن ' بوڑے کو بوڑھے اور سرپ کو سرپ لکھا ہے - اس قسم کی غلطیوں کا باعث قدیم فارسی رسم الخط ہے ' قدیم اردو کی کتابیں اسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور اس میں ہندی کے حروف مثلاً ' ت ' ' ن ' ' ر ' وغیرہ ظاہر نہیں کئے جاتے تھے - اس کے علاوہ ' گ ' کے دو مرکز کی بجائے صرف ایک مرکز ظاہر کیا جاتا تھا ' قدیم کتابوں کو صحت کے ساتھ پڑھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی شخص پوری لغظیات سے واقف نہ ہو ' ڈاکٹر صاحب الفاظ کے معنی بھی نہ سمجھ سکے اور بعض مشکل اور حل طلب الفاظ کے معنی بھی فرہنگ میں نہیں ہیں -

تر لوک کو وہ جن کہتے ہیں حالانکہ اس کے معنی تین لوک یعنی سورگ ' پرتھوی اور پاتال کے ہیں - اسی طرح تربھون کو زمین لکھتے ہیں حالانکہ اس سے مراد یہی تینوں لوک ہیں - بعض الفاظ کے معنی فرہنگ میں نہیں - مثلاً چتپتی پلچی ' سنسار ' ابھال وغیرہ —

ایک طرف تو ڈاکٹر صاحب کی لاعلمی اور ناواقفیت کی یہ شان ہے اور دوسری طرف ان کے " تنقیدی بحران " کا یہ عالم ہے کہ بے روک ٹوک غیر ذمہ دارانہ رائیں صادر ہوتی رہتی ہیں ' ظاہر ہے کہ ایسی رائے اور تنقید ادھوری ' ناقص ' قیاسی اور فرضی ہوگی ' چنانچہ اس کے آثار اس کتاب میں جا بجا پائے جاتے ہیں - ڈاکٹر صاحب نے ' ولی ' اورنگ آبادی کے متعلق لکھا ہے " ایک شخص جس نے خاص طور پر خوبصورت لڑکوں اور شراب

خواری کے متعلق غزلیں لکھی ہوں کس طرح مذہب کا پرستار تصور کیا جا سکتا ہے ؟ وہ ایک دنیا دار آدمی اور شاعر تھا" ڈاکٹر صاحب کے ذوق کی طرف سے بد گمانی ہوتی ہے اور یقین ہوتا ہے کہ وہ ہماری شاعری کی روح کو نہیں پہچانتے ہیں۔ اسی رائے سے تو اہل مغرب کا انداز تنقید ظاہر ہوتا ہے جن کے اور ہمارے مذاق شعری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی اور ادبی ماحول کو بتانے کے لئے ہر دربار کی تاریخ مختلف تاریخوں کی مدد سے لکھی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا ' کہیں کہیں ان سے بہت افسوس ناک غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں مثلاً ان کا یہ قول "قدیم مورخ فرشتہ بہمنی سلطنت کے دفتروں میں ایک ہندی زبان کے مستعمل ہونے کا ذکر کرتا ہے یہ ہندی اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہوسکتی" صریحاً تاریخی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ فرشتہ نے عادل شاہی دفاتر میں ہندی زبان کے مستعمل ہونے کا ذکر کیا ہے ' اس غلط بنیاد پر انھوں نے اردو ادب کی ابتدا کے متعلق بڑا زبردست استدلال کیا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس جلد کو اپنے شوق کے شدید تقاضے سے بہت عجلت میں مرتب کیا ہے اس میں بعض ایسی کتابوں کا ذکر اور ان کے نمونے درج نہیں ہیں جو غیر معمولی طور سے اہم اور مقبول رہ چکی ہیں۔ قاضی محمود بحری کی "من لگن" بڑی مشہور اور اپنے دور کی بے مثل کتاب ہے اور اب بھی ہر جگہ آسانی سے مل سکتی ہے حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس کا کوئی نسخہ نہ مل سکا۔ خود حیدرآباد میں اس کے کئی نسخے موجود ہیں —

ڈاکٹر صاحب نے کہیں کہیں بعض موجودہ محققین کے متعلق لکھا ہے

کہ انھوں نے حوالے نہیں دئے، لیکن خود ڈاکٹر صاحب نے اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کی ہے کہ حوالے دینا تو کجا انھوں نے اپنے ماخذات کی طرف اجمالی اشارہ بھی نہیں کیا —

اس مختصر تبصرے میں ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ تفصیلات سے بحث کی جائے تو اس کتاب میں طرح طرح کی غلطیاں ہیں، اس پر بھی تاریخ ادب کے متعلم کے لئے اس میں کافی ذخیرہ موجود ہے، کئی کتابوں اور مصنفوں کا حال اور ذکر یکجا مل جاتا ہے —

کتابت کی لکھائی چھپائی اچھی ہے، کاغذ بھی عمدہ ہے۔ کہیں کہیں کتابت اور طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بعض مشہور مصنفوں کی تصویروں، قطعوں اور مختلف تحریروں کے عکس بھی ہیں۔ جن سے کتاب کی خوبصورتی بڑھ گئی —

گلشن گفتار

مصنفۂ خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی مرتبہ سید محمد صاحب ایم اے چھوٹی تقطیع ضخامت ۱۰۰ صفحات و اشاریہ ۷۴، قیمت ۱۲ آنے ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن —

یہ اردو زبان کے (۳۰) قدیم شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس کا مصنف خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی ہے جو عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی (متوفی ۱۱۷۸ھ) کا شاگرد تھا۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے، اور چونکہ ابتدائی تذکروں میں اس کا شمار ہے اس لئے لائق وقعت ہے۔ اس سے بعض ایسی اطلاعیں ملتی ہیں جو دوسرے تذکروں میں نہیں ہیں —

ایک قلمی نسخہ سے جناب سید محمد صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے۔ ترتیب میں انھوں نے ہندستان شعرء مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب کی طرح یہ التزام کیا ہے کہ ہر شاعر کے ضمن میں اس کے حالات کو پورا اور مکمل مواد یکجا فراہم کرنے کے لئے نکات الشعرء، تذکرہ گردیزی، مخزن نکات، ہندستانی شعراء، گلزار ابراہیم اور تحفۃ الشعرء سے لے کر حاشیہ پر درج کردیا ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا اگر وہ غیر مطبوعہ تذکروں سے استفادہ کرتے۔ مطبوعہ تذکرے آسانی سے مل سکتے ہیں لیکن قلمی تذکروں کا دستیاب ہونا دشوار ہے۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں سے حالات نقل کرنے سے ایک فائدہ تو ضرور ہوا۔ گلشن گفتار کے حصے کا عیب چھپ گیا ورنہ اصل تذکرہ دس پندرہ صفحوں سے آگے نہ بڑھتا فاضل مرتب نے شروع میں ایک دلچسپ اور پر از معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس میں گلشن گفتار کی اہمیت جتانے کے لئے بعض باتیں ایسی لکھ گئی ہیں جو دوسرے تذکروں کے بارے میں بھی صادق آتی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف اشارہ کردیا جائے —

۱ — فاضل مرتب نے اس کو اردو شعراء کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے پہلے تو اس کو تذکرہ کہنا ہی صحیح نہیں وہ تو ایک مختصر سا ارد اس طور سے لکھا گیا ہے جیسے عموماً بیاضیں مرتب ہوتی تھیں۔ اس کا سن تصنیف ۱۱۶۵ ھ ہے جیسا کہ خود مصنف نے "گلشن بزم گفتار" سے تاریخ نکالی ہے۔ 'میر' نے بھی اپنے تذکرہ اسی سن میں لکھا ہے۔ گردیزی کا تذکرہ بھی اسی سن کی تصنیف ہے۔ ان دو تذکروں کی موجودگی میں ایک بیاض کو کیسے تقدم بخشا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قائم قائل اورنگ آبادی نے اپنا تذکرہ تحفۃالشعراء ۱۱۶۳ھ میں لکھا ہے، جس میں شعراء کے کسی قدر تفصیلی

حالات اور ان کے اردو اور فارسی کلام کے نمونے بھی درج ہیں - یہ کافی ضخیم ہے اور خاص حیثیت رکھتا ہے - پھر گلشن گفتار جیسے مختصر تذکرۂ بالکہ بیاض کو قدیم ترین تذکرہ کہنا کس طرح روا ہو سکتا ہے -

۲ - میر اور قائم کے تذکروں کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے قدیم شعراء کے حالات تمام تر 'عزلت' کی بیاض سے لئے ہیں - 'قایم' نے سب سے بڑھ کر مرزا طالب اورنگ آبادی کی بیاض سے اور ان کی زبانی اطلاعیں بہم پہنچائی ہیں جس کا 'قایم' نے خود متعلق دکنی کے حالات کے تحت اس کا ذکر کیا ہے —

۳ - "برہان پور کسی زمانہ میں اُردو شاعری کا مرکز رہ چکا ہے - اس وقت تک یہاں کی بزم شعرا کا کوئی علم نہیں صرف اس تذکرے میں ان چار قدیم شاعروں کے ذکر سے گمان ہوتا ہے کہ اس مقام کا بھی اُردو شاعری کی نشو و نما میں کوئی حصہ ہے"- فاضل مرتب کے اس بیان سے بڑی حیرت ہوتی ہے - معلوم ہوتا ہے وہ دکن کی تاریخ سے کماحقہ واقف نہیں برہان پور ایک زمانہ میں بڑا علمی مرکز رہ چکا ہے - وہاں بعض بڑے ارباب کمال گزرے ہیں - ان میں شیخ علی متقی جیسے مشہور آفاق بزرگ کا نام لینا کافی ہے - چمنستان شعراء' تذکرۂ تمنا اور مخزن نکات وغیرہ میں کئی برہان پوری شعراء کا ذکر ہے - پھر یہ کہنا کہ "صرف اس تذکرے میں چار قدیم شاعروں کے ذکر سے گمان ہوتا ہے" موجب حیرت ہے - برہان پور ہی پر کیا موقوف ہے جہاں کہیں مسلمانوں کی ذی اثر' مقتدر اور مہذب آبادی رہی ہے وہاں شعر و سخن کے چرچے رہے ہیں - اسی دور میں احمد نگر میں بھی اُردو کے کافی شاعر تھے —

اور قسم کی چند باتیں ہیں جن کا فاضل مرتب کے قلم سے نکلنا باعث تعجب ہے —

اس میں شبہ نہیں ان چیزوں سے تذکرہ تو بہت اہم معلوم ہونے لگتا ہے لیکن اگر فاضل مرتب اسے اپنی اصل حیثیت میں روشناس کراتے تو مناسب تھا ورنہ ایک علمی مقدمہ اور کتب فروش کے اشتہار میں فرق باقی نہ رہے گا —

اخیر میں اس طرف اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے ممکنہ مواد فراہم کرنے کے لئے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں سے شاعروں کے حالات تو جمع کرلئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں ضروری چیزیں چھوڑدی ہیں - مثال کے لئے ملاحظہ ہو : ذکر عزلت چمنستان شعراء میں ان کی مثنوی " بیان ظہور " کا مفصل ذکر ہے ' نمونہ کے لئے اس کے کئی اشعار درج ہیں لیکن فاضل مرتب نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے - نہ معلوم اس میں کیا مصلحت تھی ' عزلت کا تخلص (ہندی شاعری میں) نرگس بتایا ہے نرگس کے لفظ کو ہندی سے کیا مناسبت ہے - یہ دراصل نرگُن ہے —

اس قسم کی چند چیزیں ہیں جن سے ہم بعجوت طوالت در گزر کرتے ہیں اس قدر تفصیل بھی محض بفرمایش مرتب برداشت کی گئی ہے —

تلاش حق

(مصنفۂ مہاتما گاندھی ' مترجمۂ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے ' بی ایچ ڈی ' دو جلدیں ' تقطیع چھوٹی - صفحات تقریباً سات سو ' اوسط درجہ کی لکھائی چھپائی قیمت دو روپے کلدار ملنے کا پتہ :— انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

مہاتما گاندھی اس وقت ہندوستان کے بڑے مقتدر اور ذی اثر سیاسی

رہنما اور آزادی وطن کے علمبردار ہیں - ان کی اس وقت تمام دنیا میں شہرت ہے - وہ اپنے پر خلوص ' پاکیزہ اور بےلوث طرز زندگی کے سبب ہندوستان کی کثیر آبادی کے دلوں میں گھر کئے ہوے ہیں - انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے جس میں اپنی زندگی کے واقعات اور سوانح کو بڑی بے تکلفی اور صاف گوئی سے بیان کیا ہے - یہ بڑے دل گُردے کا کام ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کو اس طرح بے خوف و خطر بے نقاب کردے —

اس کتاب میں مہاتما گاندھی نے اپنی پیدائش سے لے کر تقریباً موجودہ زمانے تک کے سوانح قلم بند کئے ہیں ' اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جامعیت کے ساتھ واقعات پیش کئے ہیں - ان سوانح کے پیش کرنے میں ان کے پیش نظر ایک چیز رہی ہے اور وہ حق کی تلاش ہے - انھوں نے ہرواقعہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ جس سے تلاش حق کی جھلکی نظر آتی ہے ' کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل موضوع تلاش حق ہے - وہ اپنی حیات کے ہر شعبہ کے واقعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جن سے موضوع کو کچھ نہ کچھ، تعلق رہتا ہے —

مہاتماجی کی حیات کے مطالعہ کے بعد جو چیز ہمارے دل پر شدت سے نقش کرتی ہے وہ ان کا استقلال ہے-حق پر ثابت قدم رہنے میں اگر ان کو سخت سے سخت تکلیف ' ظاہری ذلت ' نقصان اور ضرر بھی نصیب ہوتا ہے تو ان کے پاے ثبات میں لغزش نہیں آتی - جس چیز کو وہ بزعم‌خود حق سمجھتے ہیں اس پر برابر اڑے رہتے ہیں اور اس کی خاطر بدنامی ' گمنامی ' نقصان اور ذلت سب کچھ برداشت کرلیتے ہیں ان کی زندگی میں صدہا واقعات ایسے پیش آے ہیں جن سے اگر معمولی آدمی دو چار ہوتا تو ہمت ہار کر اپنے مقصد سے ہاتھ دھو بیٹھتا - ان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ تمام ہندوستان

کے اوتار سمجھے جانے لگتے ہیں اور پھر بہت جلد حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ ان کی آواز سنائی نہیں دیتی - اس سے ان کے حوصلوں میں پستی نہیں آتی ' وہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس سے دست بردار نہیں ہوتے ہیں اور چاہے زمانہ ان کی مانے نہ مانے وہ برابر اپنی گائے جاتے ہیں لیکن اہمسا (جس کو وہ " عجزوانکساری کی آخری حد " کہتے ہیں) کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے - یہ محض ان کے خلوص اور استقلال کا نتیجہ ہےکہ اب پھر انھوں نے غیر معمولی سیاسی اقتدار اور اثر پیدا کرلیا ہے —

یوں تو مہاتما جی کی زندگی کا ہر شعبہ کسی نہ کسی حیثیت سے ایک اجتہا دی شان رکھتا ہے ' لیکن اس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز ان کا خلوص ' ضبط ' تحمل اور صداقت ہے ' جس سے پڑھنے والے کو بڑا سبق ملتا ہے اور اس کا دل اعلیٰ جذبات سے معمور ہوجا تا ہے —

کتاب کا اسلوب بیان رنگین نہیں ' اس میں لفاظی نہیں ' تشبیہہ و استعارہ کی بھرمار نہیں ' صنعتوں سے پاک ہے - ممکن ہے کہ یہ طرز کوتاہ نظر اور بے تہہ قارئین کو پسند نہ آے ' ان کو لفاظی کے شور و غل میں لطف آتا ہے یہاں شور و غوغا کا نشان نہیں ' ادائے بیان میں جوش و خروش نہیں ' ایک کہانی ہے جو بڑی سادگی اور بے تکلفی سے بیان کی گئی ہے اس میں سادگی اور خلوص کی لازوال خوبیاں ہیں ' اور یہی وجہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت بڑا اثر ہوتا ہے اور دل میں گدگدی ہوتی ہے کہ استقلال اور صداقت سے زندگی کی مہم سر کی جائے —

گو اس وقت اس کتاب کا ہمیں ٹھیک طور سے اندازہ نہ ہوسکے لیکن پڑھنے سے دل گواہی دیتا ہے کہ اس کا حسن عارضی نہیں ' وہ تادیر درد مند دلوں میں گرمی و الفت پیدا کرتا رہیگا - بعض جماعتیں ملک میں ایسی ہوی ہیں جو مہاتما جی کی سیاسی قیادت و سیادت کی قابل نہیں اور

ان کے خیالات سے سخت اختلاف رکھتی ہیں تاہم ان کے ہم خیالوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ ضرور ہے یہ در اصل کم و بیش چہل سالہ سیاسی جد و جہد اور سر گرمیوں کے ذکر کا نچوڑ ہے —

اصل کتاب گجراتی میں لکھی گئی تھی ' اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا انگریزی سے جناب ڈاکٹر عابدحسین صاحب نے اردو میں منتقل کیا ہے ' ترجمہ بڑا شگفتہ اور پاکیزہ ہے - اس میں سلاست ' روانی اور شستگی ہے - ترجمہ کی اس خوبی کے بر قرار رکھنے میں ڈاکٹر صاحب کی قابلیت کے علاوہ اصل کتاب کی زبان کو بھی دخل ہے ' اصل کتاب کی زبان ہندوستان کی ایک شاخ ہے ' اس کا انگریزی ترجمہ ہوا - ترجمہ میں گو زبان کی فطرت بدل جاتی بلکہ مسخ ہو جاتی ہے تاہم پورے طور سے زایل نہیں ہونے پاتی - یہی حال اس کتاب کا ہے - گو انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا لیکن اس کی اصل فطرت اور خد و خال نہ مٹ سکے اور پھر جب اردو میں منتقل ہوی تو اس کی ہندوستانی فطرت فوراً ابھر گئی —

کتاب میں بعض جدید اصطلاحات استعمال ہوی ہیں جن کا ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ کیا ہے مثلاً برتھہ کنٹرول کا انضباط ولادت - ہندی الفاظ و اصطلاحات کا ترجمہ اور تشریح و توضیح بھی کردی ہے - مارگ کا لفظ صحیح نہیں کیا انگریزی رسم الخط کی وجہ سے انھوں نے مرگ لکھدیا ہے - بعض اصلاحات کا ترجمہ نہیں کیا مثلاً اکوٹی کا ترجمہ نصفت اور ریل پراپرٹی کا ترجمہ جایداد مادی ' جامعہ عثمانیہ میں ہوا ہے - فرہنگ اصطلاحات میں ڈاکٹر صاحب جدید اصطلاحات کے ترجمے آسانی سے معلوم کرسکتے ہے —

رہنمائے صحت

مصنفۂ مہاتما گاندھی ، مترجمۂ جناب اعظم خاں صاحب ۔ چھوٹی تقطیع ، صفحات سعہ دیباچہ و مقدمہ ۱۲۴ - مترجم کے پتہ (نصیرولا - عثمان پورہ حیدرآباد دکن) سے بقیمت ۱۲ مل سکتی ہے

مہاتما گاندھی کی یہ کتاب دراصل گجراتی میں لکھی گئی تھی ، اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا جس سے وہ کافی مقبول ہو چکی ہے ۔ مہاتما جی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک اجتہادی شان رکھتے ہیں - ان کی صحت کے اصول بھی امتیازی پہلولئے ہوے ہیں - اس کتاب میں انھوں نے ایسی باتیں لکھی ہیں جو ان کے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں - ان میں بعض ایسی ہیں جن پر بہت سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے ، جو باب انھوں نے برہم چاریہ پر لکھا ہے خصوصاً بہت کچھہ اختلاف رائے کا باعث ہو سکتا ہے —

تعجب ہوتا ہے کہ مہاتماجی نے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور سماجی مشغولیتوں کے باوجود کس طرح حفظان صحت کی طرف بطور خاص التفات کیا ، اور اہل ملک کے لئے اپنے ذاتی تجربوں کا نچوڑ پیش کیا - کتاب پڑھنے کے لائق اور مفید ہے - خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کالج کے ایک قدیم صاحب ذوق طالب علم جناب اعظم خان صاحب نے مہاتما جی کی کتاب کے پہلے حصہ کو (جو بہت اہم اور ضروری ہے) انگریزی سے اردو میں منتقل کیا - ترجمہ بہت سلیس اور پاکیزہ ہے ، اس میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا ، ہم خاں صاحب کو اس کامیاب ترجمہ پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس سے زیادہ مفید اور مستقل کام میں ہاتھہ ڈالیں گے —

قدیم افسانے

(مرتبہ جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے، اہل اہل بی (عثمانیہ)
صفحات ۱۹۴ - چھوٹی تقطیع قیمت ڈیڑھ روپیہ
ملنے کا پتہ - مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن)

سروری صاحب ہمارے کلیہ کے فارغ التحصیل ہیں - انھوں نے اپنی کتاب دنیا کے افسانہ کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کی ہے - افسانوی ادب کے متعلق وہ بڑا گراں قدر کام کر رہے ہیں - اس کتاب میں انھوں نے مصر، یونان، ہند، ایران اور عرب کے قدیم مختصر قصوں کو جمع کیا ہے - قصے بہت دلچسپ ہیں - اکثر انگریزی ترجمہ کی مدد سے اردو میں منتقل کئے گئے ہیں - بعض اصل سے ترجمہ ہوئے ہیں - ترجمہ میں کافی احتیاط اور محنت سے کام نہیں لیا گیا - یہی وجہ ہے کہ اس میں روئیداد (پلاٹ) کی دلچسپی تو موجود ہے لیکن زبان اور بیان میں شگفتگی اور بے ساختہ پن نہیں - تاہم جو لوگ افسانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کو ضرور پڑھیں، امید ہے کہ ان کے مذاق میں اس سے وسعت اور انقلاب پیدا ہوگا —

چینی اور جاپانی افسانے

یہ اسی سلسلہ کی ساتویں کڑی ہے - اس کے مرتب بھی سروری صاحب ہیں اور معاونین جامعۂ عثمانیہ کے دو قدیم طالب علم - اس میں چھ قصے

ھیں - تین چینی اور تین جاپانی - یہ کتاب مرحوم مولوی سلیم کے نام منسوب کی گئی ھے - چھوٹی تقطیع کے ۷۱ صفحوں پر مشتمل ھے - قیمت ۹ آنے - ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن —

اسلام کی امن پسندی

(از الحاج لارڈ ھیڈلے) مترجمۂ جناب سیدوقار احمد صاحب ایم اے اہل اہل بی ، عثمانیہ - مدیر نظام گزٹ

یہ لارڈ ھیڈلے کے ایک خطبہ کا ترجمہ ھے ، جس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ھے کہ اسلام بے امن پسندی کی تعلیم کس طرح دی اور امن و صلح کا پیغام سنا کر کس طرح عملی تعلیم دی ھے - ترجمہ اچھا ھے اور مترجم کے پتہ سے مل سکتا ھے -

کلیہ کی خبریں

سرسپرو کا لکچر

بزم قانون کی جانب سے سر تیج بہادر سپرو کے ایک لکچر کا انتظام کیا گیا تھا جس میں عالیجناب محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ نے صدارتی فرائض انجام دئے ۔ مولوی حمیداللہ صاحب نائب صدر بزم قانون نے تحریک صدارت پیش کرتے ہوئے ایک دلچسپ تقریر کی اس موقع پر آپ نے اس تعلق کو ظاہر فرمایا جو سر سپرو کو بہ حیثیت قانونی پرچوں کے ممتحن کے جامعۂ عثمانیہ سے رہا ہے ۔ جب آپ نے جامعۂ عثمانیہ کے طالب علموں کے متعلق سر موصوف کی حسب ذیل اہم رائے کا ذکر کیا کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں یہاں کے طلبہ بہ لحاظ فن دانی فوقیت رکھتے ہیں تو پورا ہال پر زور چیرز کی آوازوں سے گونج اٹھا ۔

لکچر کا موضوع قانون اور پیشۂ قانون تھا ۔ سر سپرو نے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے جامعۂ عثمانیہ اور اس کی اہمیت پر کچھ دیر تک روشنی ڈالی ۔ آپ نے ارشاد فرمایا " میں پورے اذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ سارے ملک ہند میں درست طور پر جامعاتی تعلیم اگر کہیں دی جارہی ہے تو وہ صرف آپ کی یونیورسٹی میں دی جارہی ہے ۔ اور میں حیدرآباد میں یہ جو انقلاب کُن تجربہ کیا جا رہا ہے اس سے بہت خوش ہوں ۔ مجھے کامل یقین ہے کہ یہ تجربہ آخر کار کامیاب ثابت ہو گا "

آپ نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوے فرمایا " بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمیں انگریزی جیسی غیر زبان میں کمال حاصل کرنا چاہئے اور اس میں اپنے لافانی کارنامے آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جانا چاہئے۔ لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے خیالات رکھنے والے حضرات ایک خاص قسم کے سالیخولیا میں مبتلا ہیں " —

اس موقع پر آپ نے نہایت لطیف پیرایہ میں انگلستان کے مایۂ ناز شاعر ملٹن کے اس سبق آموز واقعہ کا حوالہ دیا کہ اس نے اپنی لاجواب تصنیف فردوس گمگشتہ " لکھنے کے لئے بجاے لاطینی کے جس پر اسے قدرت کاملہ حاصل تھی اپنی مادری زبان یعنی انگریزی کا انتخاب کیا جس کی وجہ سے اس کا نام آج تک انگریز مشاہیر شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے —

اس کے بعد آپ نے اپنے موضوع سے بحث کی اور نوجوان طالبعلموں کو پیشۂ وکالت کے متعلق نہایت کارآمد اور گرانقدر مشورے دئے جن کی آپ جیسے کامیاب تجربہ کار اور ذکی وکیل سے توقع کی جا سکتی تھی - آپ کی دلچسپ تقریر پُر زور نعرہ ہاے تصفیق کے درمیان ختم ہوی اور جناب صدر کی اختتامی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا - اس جلسہ میں علاوہ موجودہ اور سابقہ متعلمین کُلیہ کی کثیر تعداد کے ارکان عدالت العالیہ ' حضرات اساتذہ و نیز دیگر عہدہ داران جامعہ شریک تھے —

ہم بزم قانون کو جلسۂ مذکور کی غیر معمولی کامیابی پر دلی مبارک باد دیتے ہیں —

عصرانہ اس جلسہ کے دوسرے روز عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں سرسپرد کو ایک عصرانہ دیا گیا جس میں مدیرین مجلہ بھی شریک

رہے - موقع سے فائدہ اٹھا کر مدیرین نے آپ کی خدمت میں مجلہ کی جلدیں تحفۃً پیش کیں جن کو آپ نے بڑی مسرت اور گرمجوشی کے ساتھہ قبول فرمایا - مدیرین نے اس امر کو مسرت کے ساتھہ محسوس کیا کہ کُلیہ کی علمی سرگرمیوں سے سر سپر و غایت درجہ دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں —

کلیہ میں توسیعی لکچر

گذشتہ میقات کے آغاز میں دو معزز میہمانوں نے کلیہ کو اپنی آمد سے مفتخر کیا - حسن اتفاق سے یہ دونوں میہمان مشرقی فنون لطیفہ کے مشہور اور ممتاز ماہرین میں سے تھے - ان میں سے ایک ڈاکٹر اسٹیلا کرامرش (Dr Steela Kramrisch) تھیں جو کلکتہ یونیورسٹی میں فنون لطیفہ کی خاتون لکچرار ہیں - ڈاکٹر اسٹیلا نے کُلیہ میں حسب ذیل عنوات پر تین لکچر دئے —

(۱) شمالی ہند کے ازمنۂ وسطیٰ کے مجسمے —

(۲) اجنٹہ سے مغلیہ نقاشی کی طرف —

(۳) مغلیہ نقاشی —

ڈاکٹر اسٹیلا کا انداز بیان حد درجہ دلکش اور مسحور کُن تھا - آپ نے اس سے پیشتر لندن اور آکسفورڈ میں متعدد لکچر دئے ہیں اور ہندوستانی آرٹ پر کئی اہم کتابوں کی مصنف ہیں - آپ پروفیسر جوزف اسٹرزگوسکی (Prof. Joseph Strzygowski) (جو وائنا (آسٹریا) یونیورسٹی کے مشہور و معروف پروفیسر اور فنون لطیفہ کے ایک خاص تنقیدی اسکول کے بانی ہیں) کے تلامذہ میں سے ہیں —

دوسرے ڈاکٹر ارنسٹ ڈیٹس (Dr. Erust Diez) تھے - آپ نے اسلامی فن تعمیر پر ایک دلچسپ لکچر دیا —

ڈاکٹر ڈیٹس کلیولاڈ (Clevelaud) یونیورسٹی (ممالک متحدۂ امریکہ) سے تعلق رکھتے ہیں اور ڈاکٹر اسٹیلا کی طرح پروفیسر اسٹرائکوسکی کے شاگرد رشید ہیں - آپ نے دنیا کے بڑے حصے کی سیاحت کی ہے اور خراسان کے اسلامی فن تعمیر اور اسلامی فنون لطیفہ پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں - حیدر آباد میں مختصر سے قیام کے بعد ڈاکٹر ڈیٹس پروفیسر اسپیٹ کی معیت میں بیدر اور بیجاپور تشریف لے گئے تاکہ وہاں کی تعمیری یادگاروں اور آثار کا مطالعہ کریں —

مسٹر شفیع احمد

مسٹر شفیع احمد (عثمانیہ) کُلیہ کے مشہور پیراک کے لئے حکومت نے پانچ ہزار کی امداد منظور کی ہے تاکہ وہ رود بار انگلستان کو عبور کرنے کی کوشش کریں - موصوف آج کل انگلستان میں مقیم ہیں اور پیراکی کی مشق کر رہے ہیں - انہوں نے ایک خط عالیجناب صدر صاحب کُلیہ کے نام سے لکھا تھا جس میں اس امر کی شکایت کی تھی کہ جو رقم حکومت کی طرف سے انہیں دی گئی ہے وہ ان کے لئے بالکل نا کافی ہے - عالیجناب صدر صاحب نے ان کی مشکلات کا صحیح اندازہ کر کے تحریک کی تھی کہ ان کی امداد میں مناسب اضافہ کیا جائے - چنانچہ اس تحریک کی بنا پر ہماری فیاض حکومت نے ان کی امداد میں مزید دیڑھ سو پاؤنڈ کا اضافہ منظور کیا ہے —

ہم امید کرتے ہیں کہ مسٹر شفیع احمد بہت جلد نمایاں کامیابی حاصل کر کے وطن مالوف کی طرف لوٹیں گے —

مجلس علمیہ

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ طلبائے قدیم کُلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے ایک مجلس بنام "مجلس علمیہ" قایم کی ہے جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں : —

(۱) کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے قدیم طلبہ میں ذہنی اور علمی رابطہ پیدا کرنا۔

(۲) ملک میں عام طور پر علمی فضا پیدا کرنا۔

(۳) اُردو زبان و ادب میں توسیع و اضافہ۔

پہلا مقصد گو کسی قدر محدود ہے لیکن اس کی اہمیت اور ضرورت میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ خدا کے فضل سے کُلیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس وقت بھی ان کی خاصی تعداد نہ صرف مستقر بلدہ بلکہ اضلاع میں بھی موجود ہے۔ ایک عرصے سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان تمام فرزندان کُلیہ کے درمیان ایک ذہنی اور علمی رابطہ قائم ہونا چاہئے۔ مقام مسرت ہے کہ اس کام کو مجلس نے اپنے ذمے لیا ہے —

دوسرے مقصد کے متعلق ہمیں کچھہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ملک میں علمی فضا پیدا کرنے کے لئے جد و جہد کرنا ایک نہایت مہتم بالشان کام ہے۔ مجلس کے مقاصد میں اس کا شامل ہونا مجلس کی علمی دور بینی پر دلالت کرتا ہے —

تیسرا اور آخری مقصد ایسا ہے جس کے بغیر مجلس ایک جسد بے روح معلوم ہوتی۔ اس وقت ملک میں دو اور ادارے ہیں جو مذکورۂ بالا مقصد کو پیش نظر رکھہ کر کام کر رہے ہیں یعنی دارالترجمہ اور انجمن ترقیٔ اردو۔ اول الذکر کے فرائض بڑی حد تک محدود ہیں۔ وہ صرف نصابی کُتب کو ترجمہ کرانے پر اکتفا کرتا ہے۔ یہ کام گو کیسا ہی گراں قدر اور اہم ہو لیکن محدود ضرور ہے۔ آج کل ملک کو صرف نصابی کتب ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی بلند پایہ کُتب کا شوق بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اب رہی انجمن ترقیٔ اُردو۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا دائرۂ عمل کافی وسیع ہے

اور اس نے اب تک اس سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ ہماری تعریف و ستائش کا محتاج نہیں - لیکن ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں محض ایک دو اداروں سے پوری نہیں ہوسکتیں - اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اس قسم کی متعدد مجلسیں اور ادارے قایم ہوں تاکہ ترقی کی دوڑ میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں - ہمیں بڑی مسرت ہوئی جب مجلس کے مقاصد میں ہم نے اس مقصد کو بھی شریک پایا —

خوشی کی بات ہے کہ مجلس علمیہ نے جوش اور سرگرمی سے اپنا کام شروع کردیا ہے چنانچہ اس وقت ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب رکن جماعت عاملہ کی حسب ذیل دو مترجمہ کتابیں زیر طبع ہیں جو عنقریب مجلس کی جانب سے شائع ہوں گی —

(۱) مقدمۂ ما بعد الطبیعیات (Introduction to Metaphysics) از ہنری برگسان —

(۲) نظریۂ صداقت عمل (Pragmatism) از ولیم جیمس —

ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتب تیار کرائی جارہی ہیں جن کو ممکنہ عجلت کے ساتھ شائع کیا جائے گا —

ہم مجلس علمیہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی کامیابی کی نہایت خلوص سے دعا کرتے ہیں —

مولوی سعید الدین صاحب | مولوی سعید الدین صاحب مددگار پروفیسر حیاتیات جو کچھ عرصہ پیشتر رخصت تعلیمی حاصل کرکے ولایت تشریف لے گئے تھے اب واپس آگئے ہیں - آپ نے اڈنبرا یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا ہے - ہم موصوف کو اس کامیاب مراجعت پر دلی مبارک باد دیتے ہیں —

قاری کلیم اللہ صاحب

قاری کلیم اللہ صاحب ایم اے - ال ال بی (عثمانیہ) مددگار پروفیسر فارسی بھی اعلیٰ تعلیم کے شوق میں ولایت تشریف لے گئے تھے - ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اوریئنٹل اسٹڈیز سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے اور عنقریب واپس ہونے والے ہیں - ہم قاری صاحب کو مبارک باد دیتے ہوے توقع کرتے ہیں کہ وہ بہت جلد واپس ہوکر کُلیہ کو اپنی علمی خدمات سے مستفید فرمائیں گے —

مولوی حبیب الرحمن صاحب

مولوی حبیب الرحمن صاحب ایم اے - ال ال بی مددگار پروفیسر معاشیات نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے حکومت سے قرضہ حاصل کیا اور راہیء انگلستان ہوئے —

مولوی ابن حسن صاحب

مولوی ابن حسن صاحب ایم اے مددگار پروفیسر تاریخ کے لئے بھی تعلیمی قرضے کی منظوری مل گئی ہے اور وہ بھی عنقریب انگلستان روانہ ہونے والے ہیں —

ہم کُلیہ کے ان دونوں فاضل پروفیسروں کی کامیابی کی خلوص قلب سے دعا کرتے ہیں —

مولوی فضل احمد صاحب

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم سابق مددگار پروفیسر عربی کے انتقال کی وجہ سے جو جائداد خالی ہوئی تھی اس کے سلسلے میں مولوی فضل احمد صاحب کا تقرر کیا گیا ہے - ہم موصوف کو اِس تقرر پر مبارک باد دیتے ہیں —

ڈاکٹر بابر میرزا صاحب

ڈاکٹر بابر میرزا صاحب مددگار پروفیسر حیاتیات نے اپنی خدمت سے استعفاء دیدیا - ہم اُمید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جہاں کہیں بھی رہیں ان کی دلچسپی کُلیہ سے برابر قائم

رہے گی —

کلیہ کی وائس پرنسپالی

اس سال کلیہ میں وائس پرنسپالی کا ایک جدید عہدہ قایم کیا گیا ہے اور اس پر پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب کا بہ لحاظ سینیارٹی تقرر عمل میں آیا ہے - ہم اس اعزاز پر موصوف کو دلی مبارک باد دیتے ہیں —

کلیہ کے لئے نئے مکانات

کلیہ کی موجودہ عمارتوں میں کافی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اور دو مکانات کرایہ پر لینے پڑے - ان میں سے ایک مکان چراغ علی کی گلی میں ہے جس کا کرایہ پونے دو سو ہے اور دوسرا لیاقت منزل کی مغربی جانب واقع ہے اور اس کا کرایہ ڈیڑھ سو ہے - ان نئے مکانات میں ایم ایس سی کی تعلیم ہوا کرے گی —

یونیورسٹی کی خاص اپنی عمارتیں نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کو ہر سال مکانات کے کرایوں پر ایک خطیر رقم صرف کرنی پڑتی ہے اور باوجود اس کے طالب علموں اور اساتذہ کو خاطر خواہ آرام نہیں ملتا - ہمیں توقع ہے کہ حکومت یونیورسٹی کی عمارتوں کو تعمیر کرنے کی طرف جلد سے جلد توجہ مبذول کرے گی —

فرزندان کلیہ کی کامیابیاں

برادران کلیہ نے اندرون ملک و بیرون ملک جو شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کی تفصیل دلی مسرت کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے —

میر سیادت علی صاحب

بحری تار مظہر ہے کہ میر سیادت علی صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی سی ایل کی ڈگری حاصل کرلی ہے . موصوف کلیہ کے قابل ترین فرزندوں میں شمار ہوتے ہیں - آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کئے تھے

اور انجمن اتحاد کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے آپ نے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا تھا جس میں آپ اول آئے تھے آپ کی اعلیٰ قابلیتوں کے مد نظر حکومت نے آپ کو یورپی وظیفۂ تعلیمی عطا کیا تھا، چنانچہ آپ نے پانچ سال کے قلیل عرصہ میں آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی اور بی سی ایل کی وقیع ڈگریاں حاصل کیں اور بیرسٹری میں بھی کامیاب ہوئے —

سید یسین علی خاں صاحب

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ سید یسین علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) نے لندن یونیورسٹی سے بی ایس سی آنرز کی ڈگری شعبۂ انجینیری میں بدرجۂ اول حاصل کی ہے اور آپ چاڈوک میڈل (Chadwick) کے مستحق قرار پائے ہیں جو امتحان میں اول آنے والوں کو یونیورسٹی کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ موصوف سنہ ۱۹۲۶ع کے بی اے کے امتحان میں اول آئے تھے اور آپ کو اسکالرشپ دے کر ڈھاکہ روانہ کیا گیا تھا جہاں سے آپ نے ایم اے کے پہلے سال میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۷ میں آپ کو یورپی وظیفۂ تعلیمی دیا گیا—

سید محمد علی خاں صاحب

سید محمد علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) سابق متعلم کلیہ جو کچھ عرصہ سے انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے لندن یونیورسٹی سے بی ایس سی (آنرز) میں بدرجۂ دوم کامیاب ہوئے۔ آپ کا اختیاری مضمون طبیعیات تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے اے آر سی ایس کی سند بھی حاصل کی —

حاجی غلام محمد صاحب

حاجی غلام محمد صاحب کلیہ کے ایک مشہور طالب علم ہیں۔ آپ نے اس سال ایم ایس سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر میگناتھ ساہا نے (جو الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اور جو سال حال جامعہ عثمانیہ کے مہتمن تھے) حاجی صاحب کے عملی کام کی

بڑی تعریف کی اور آپ انھیں کے مشورے سے تحقیقاتی کام کرنے کے لئے الہ آباد تشریف لے گئے ہیں - عالی جناب صدر صاحب کلیہ نے آپ کے لئے ایک وظیفۂ تعلیمی کی تحریک کی ہے - ہمیں کامل توقع ہے کہ حکومت ہمارے اس ہونہار طالب علم کی ضرور قدر افزائی کرے گی —

حیدرآباد سول سروس

سول سروس کے امتحان مقابلہ میں اس سال فرزندان کلیہ کو بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی - جملہ چھہ کامیاب ہونے والوں میں سے چار متعلمین کلیہ ہیں - اور اول بھی ہمارے ہاں کے ایک لایق طالب علم آئے ہیں - ذیل میں ان ذہین اور قابل فرزندان کلیہ کی تفصیل درج کی جاتی ہے —

غلام حیلانی بی اے (عثمانیہ) اول

میر عابد علی خاں متعلم ایل ایل بی (عثمانیہ)

یں کرسریا بی اے (عثمانیہ)

سید یوسف الدین (عثمانیہ)

بۂ طبیۂ جامعۂ عثمانیہ

کلیۂ طبیہ کے تیسرے سال کے امتحان میں حسب ذیل دو سابق متعلمین کلیہ اول و دوم آئے ہیں —

۱ منور علی (عثمانیہ) اول

۲ ابوالکلام بدر الدین ' بدر ' (عثمانیہ) دوم

موخرالذکر مجلۂ عثمانیہ کے قدیم کرم فرما ہیں - آپ کا کلام اکثر مجلہ میں شائع ہوا کرتا ہے - خوشی کی بات ہے کہ آپ شاعری اور ڈاکٹری میں ایک ساتھ ترقی کر رہے ہیں —

عثمانیہ انجینرنگ کالج

عثمانیہ انجینرنگ کالج کے سالانہ امتحان میں بھی اول و دوم کلیہ کے قدیم طالب علم ہی آئے ہیں

تفصیل ملاحظہ ہو —

۱ سیتا نارائن بی اے (عثمانیہ) اول

۲ پی آر رامچندر رتی (عثمانیہ) دوم

ہم دلی مسرت اور گرم جوشی کے ساتھ ان تمام ذہین اور فاضل فرزندان کلیہ کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں —

جشن یوم کلیہ

گذشتہ میقات کے آغاز میں جشن یوم کلیہ بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے منایا گیا - اس میں تقریباً سارے سابق و موجودہ متعلمین، طلبہ اور حضرات اساتذہ نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے حصہ لیا ہم ذیل میں مولوی میر احمد علی خاں صاحب بی اے نائب صدر انجمن اتحاد کی رپورٹ شائع کرتے ہیں جس میں اس جشن کی جملہ سرگرمیوں کا حال پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے —

رپورٹ مرتبہ نائب صدر صاحب انجمن اتحاد

اس سال کی ابتدا سے ہمارے کلیہ میں اس خواہش کا اظہار کیا جارہا تھا کہ سال حال جشن یوم کلیہ منایا جائے - گذشتہ میقات میں میسور اکسکرشن کی مشغولیت کے باعث اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا - لیکن یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری میقات کے شروع ہوتے ہی جشن یوم کلیہ منایا جائے - چنانچہ اسفندار کی ۲۴ تاریخ سے ۲۸ تاریخ تک یہ جشن بفضل خدا کامیابی کے ساتھ منایا گیا لیاقت منزل کے میدان میں ایک وسیع شامیانہ لگایا گیا تھا - شامیانہ کو بیل بوٹوں اور اردو و انگریزی زبان کے مختلف دعائیہ جملوں، مقولوں، نصب العین اور اشعار سے آراستہ کیا گیا تھا مثلاً شاہ دکن زندہ باد ، جامعہ عثمانیہ پایندہ باد ، خدمت وطن کے لئے خود کو وقف کر دو علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہو، ہم ملک دکن کی خدمت میں سب تن من دھن کو لگا دینگے - یقین محکم ،

عمل پیہم ' محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں —

Self help is the best help. Do or die. Union is strength. India expects every man to do his duty. To educate the masses should be our immediate object. The hopes of the future lie in the young generation.

شامیانہ کے اندر اور باہر پھاٹک تک خوب روشنی کی گئی تھی۔ لیاقت منزل کے احاطہ میں اور لیاقت منزل کے باہر قائدین منزل ' رستم منزل ' آغا منزل کے سامنے سڑک پر مختلف رنگ کی جھنڈیاں لائی گئی تھیں جن میں سے اکثر جھنڈیوں کی زیب و زینت جامعہ کے نمایاں مانوگرام کی وجہ سے دو بالا ہوگئی تھی۔ لیاقت منزل کی پھاٹک پر بجلی کے گولوں سے جامعہ عثمانیہ کا کوسٹ تیار کر کے لگایا گیا تھا۔ غرض اس آرائش و زیبایش کے ساتھ ۲۴ اسفندار کو رات کے ۸ ½ بجے جشن یوم کلیہ کی ابتدا اردو مباحثہ سے ہوئی۔ موضوع مباحثہ یہ تھا کہ "بنی نوع انسان کے رہنماؤں کے لئے کتابی تعلیم غیر ضروری ثابت ہوتی ہے" —

جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی ' پروفیسر ابن حسن صاحب ' پروفیسر مظفرالدین صاحب قریشی اس مباحثہ میں حکم تھے۔ غلام دستگیر صاحب رشید متعلم سال چہارم اول اور محمد فاروق صاحب متعلم سال سوم ' دوم رہے۔ آخر میں پروفیسر مولانا مناظر احسن صاحب اور پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے بھی مضمون کی موافقت میں اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمایا۔

۲۵ اسفندار کو صبح کے ۸ بجے سے دن کے ۱ بجے تک فتح میدان میں مختلف اسپورٹس کے مقابلہ ہوتے رہے جن میں موجودہ و قدیم طلبہ اور پروفیسر صاحبان نے بھی حصہ لیا۔ ان اسپورٹس میں طلبا کے لئے سب سے

زیادہ خوشی کا مقام یہ تھا کہ ان کے عزیز اساتذہ نے بھی ان میں حصہ لیا۔ چنانچہ پاور میل کی دوڑ میں جو صرف پروفیسر صاحبان کے لئے مخصوص تھی پروفیسر کشن چند صاحب اول، پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب دوم اور پروفیسر الیاس برنی صاحب سوم رہے۔ پروفیسر صاحبان کی ٹیم نے طلبائے قدیم کی ٹیم سے رسہ کشی کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی —

اسی تاریخ کو شام میں ۷ ½ بجے سے انگریزی مباحثہ مذکورۂ بالا شامیانہ میں شروع ہوا۔ موضوع مباحثہ حسب ذیل تھا :—

"Westernization of the East is the sole guarantee for the progress of Asia"

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی اور پروفیسر ویرابھدرولو صاحب حکم تھے۔ محمد فاروق صاحب متعلم سال سوم ارل اور بی بن چوبے صاحب متعلم سال سوم دوم رہے۔ آخر میں پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے مضمون کی موافقت میں اور پروفیسر ای ای اسپیٹ صاحب اور پروفیسر ویرابھدرولو صاحب نے مخالفت میں اپنے گرانمایہ خیالات کا اظہار فرمایا۔

۲۶ اسفندار کو رات میں ۸ ½ بجے سے مشاعرہ ہوا۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر دلہا دلہائی نے اپنی صدارت سے مشاعرہ کو زینت بخشی۔ نظموں کے لئے "ایثار" اور "شاعری" کے عنوان دئے گئے تھے۔ اور غزلوں کے لئے حسب ذیل دو طرحی مصرعے دیے گئے تھے :—

"ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر"

"جسے سمجھتے تھے جسم خاکی غبار تھا کوئے آرزو کا"

طلبائے کلیہ کے علاوہ باہر کے ممتاز شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا۔

پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی نظم " شاعری " پر بہت مقبول ہوئی۔ یہ جلسۂ مشاعرہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے برخواست ہوا۔

۲۷ اسفندار کو زیر صدارت مہاراجہ یمین السلطنت سر کشن بہادر صدر اعظم باب حکومت و امیر جامعہ عثمانیہ جلسۂ تقسیم انعامات ہوا جلسہ میں شرکت فرمانے والے دیگر عہدہ دار و ممتاز افراد میں نواب اکبر یار جنگ بہادر، نواب ہاشم یار جنگ بہادر، نواب اختر یار جنگ بہادر، شریمان وامن نائک صاحب جاگیر دار، میجر یم جی نیڈو صاحب، مسٹر پرنڈر گھاست، سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج بھی شامل ہیں۔ قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ صدر صاحب کلیہ نے کلیہ کی دو سالہ کارگذاری کی رپورٹ سنائی۔ اس کے بعد مہاراجہ بہادر نے اپنے دست مبارک سے طلبہ کو انعامات عطا فرمائے۔

تقسیم انعامات کے بعد مہاراجہ بہادر نے مختصر تقریر فرمائی۔ صدر صاحب کلیہ نے مہاراجہ بہادر اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد عصرانہ ہوا۔

۲۸ اسفندار کو جشن یوم کلیہ کا اختتام ڈنر اور جلسہ معاشرتی (سوشل گیادرنگ) سے ہوا۔ ہندو اور مسلمانوں کے لئے ڈنر کا علحدہ علحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کے ڈنر کی ابتدا بھجن سے اور مسلمانوں کے ڈنر کی ابتدا قرأت سے ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد صدر صاحب کلیہ نے اعلیٰ حضرت بندگان عالی اور صاحبزادگان بلند اقبال کا، نواب علی محمد خاں صاحب نے کلیہ کا، پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب نے جامعہ کا اور نائب صدر انجمن اتحاد نے طلبائے قدیم کا جام صحت تجویز کیا۔ جن کو سب نے استادہ ہو کر نوش کیا۔ ڈنر کافی پر تکلف تھا

جس کے ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد جلسۂ معاشرتی شروع ہوا۔ اکثر پروفیسر صاحبان بھی بہت دیر تک شریک رہے۔ مختلف مذاقیہ پارٹ مختلف طلبا نے لئے۔ مرزا شکور بیگ صاحب متعلم سال چہارم کی اول کی نظم اور احمدالله صاحب صدیقی سابق متعلم کلیہ ھذا کی "میرے ابا بلالو گھر کو مجھے" والی نظم بہت پسند کی گئی۔ جلسہ معاشرتی کے نظام العمل کا خاص جزو جناب عبدالروف صاحب سابق متعلم کلیہ کا دلکش اور روح پرور گانا تھا۔ جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوے۔ رات کے دو بجے جلسہ معاشرتی کا اور اس کے ساتھ ھی جشن یوم کلیہ کا بھی اختتام عمل میں آیا —

اس جشن کی کامیابی کا مدار بہت بڑی حد تک ھمارے عزیز پروفیسروں کی امداد و اعانت پر ھے۔ جس وقت انجمن اتحاد کی مجلس انتظامی سال حال جشن یوم کلیہ منانے کی تجاویز پر غور کر رھی تھی تو اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ محترم پروفیسر صاحبان کی طرف سے اس کام میں اتنی عظیم الشان امداد ملے گی۔ یہ واقعہ ھے کہ بعض پروفیسر صاحبان نے اس کام میں طلبا سے بھی زیادہ محنت و مشقت برداشت فرمائی۔ اپنے شفیق پروفیسروں کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کیا جاتا ھے —

کلیہ ھذا کے قدیم طلبا کی امداد و اعانت کچھ کم قابل تعریف نہیں ھے۔ نواب علی محمد خاں صاحب شروع سے آخر تک برابر عمل دلچسپی لیتے رھے۔ اور آپ کی وجہ سے بہت سے کام نہایت آسانی سے تکمیل پا گئے۔ مولوی ضمیر احمد صاحب قریشی اور مولوی امجد علی خاں صاحب نے آرائش و زیبائش کے کام میں بہت امداد دی۔ جلسۂ معاشرتی کی کامیابی کا سہرا بڑی حد تک مولوی عبدالروف صاحب کے سر ھے۔ صاحب موصوف

کی آواز میں ایسا درد ہے اور قدرت نے ایسی خوش گلوئی سے آپ کو سرفراز فرمایا ہے کہ جو بیان سے باہر ہے۔ مولوی عبدالرحمن صاحب مہاجر نے اپنے تاثر کے پارٹ سے اور مولوی احمداللہ صاحب صدیقی نے اپنی نظم سے جلسہ معاشرتی میں حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ ان تمام برادران کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی دلچسپی و خلوص کو سابق کلیہ کے ساتھ قائم و برقرار رکھا جائے گا۔

یوم کلیہ کی کامیابی میں برادران کلیہ کی جد و جہد کو بھی بڑا دخل ہے۔ قوی توقع ہے کہ سال آئندہ کے جشن میں معترم طلباے کلیہ بہت زیادہ جوش و انہماک کا اظہار فرمائیں گے۔

پروفیسر سید اشرت صاحب شمسی مرحوم

ہم دلی افسوس کے ساتھ اس خبر کو شائع کرتے ہیں کہ سید اشرت صاحب شمسی سابق پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے ایک طویل علالت کے بعد کچھ عرصہ پیشتر انتقال فرمایا۔ مرحوم عربی اور فارسی کے جلیل القدر اور متبحر عالم ہونے کے علاوہ اصول فقہ، معانی و بیان، صرف و نحو، عروض و قافیہ منطق و کلام فلسفۂ قدیم اخلاق وغیرہ وغیرہ جیسے فنون میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ فارسی کے ایک بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی جب دارالعلوم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ میں ضم کردیا گیا تو آپ یہاں منتقل ہوگئے اور تقریباً تین سال پیشتر تک کلیہ کو اپنے علمی تبحر سے مستفید فرماتے رہے۔ کچھ عرصہ پیشتر آپ نے کبر سنی کی وجہ سے وظیفۂ حسن خدمت حاصل کیا تھا اور اب ایک حد تک خانہ نشین ہوگئے تھے۔ لیکن آپ علمی مشاغل

سے غافل نہیں تھے چنانچہ آپ کا دولت خانہ اب بھی تشنگان علوم سے معمور رہتا تھا۔ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مقدمۂ تفسیر موامع البیان تصنیف فرما رہے تھے کہ اچانک مرض سرطان کا حملہ ہوا جس سے آپ جانبر نہ ہوسکے۔ پروفیسر شمسی صاحب کی موت ارباب علم و فضل کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے: آپ کا تبحر علمی اور خداداد ذہانت حیرت انگیز تھی۔ آپ کی طبیعت انتہا درجہ سادگی پسند تھی۔ آپ کی بزرگانہ شفقتیں ایسی تھیں کہ ان کی یاد آپ کے شاگردوں کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوگی۔ سخت افسوس ہے کہ دکن کی یہ مایۂ ناز ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھن گئی —

ہم انتہائی رنج و ملال کے ساتھ علامہ مرحوم کے پسماندوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے —

پروفیسر مولوی عبد الحیٔ صاحب مرحوم

اس سال کا دوسرا سانحۂ عظیم مولوی عبد الحیٔ صاحب مددگار پروفیسر عربی کلیہ جامعۂ عثمانیہ کا رہگرائے عالم جاودانی ہونا ہے۔ آپ مولوی احمد علی صاحب محدث کے پوتے اور حکیم عبد الرحمن صاحب سہارنپوری کے فرزند تھے۔ آپ بھی پروفیسر شمسی صاحب کی طرح دار العلوم سے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ میں منتقل ہوے تھے۔ اور کئی سال سے فرزندان کلیہ کو اپنے علمی فیضان سے مستفیض فرما رہے تھے۔ پروفیسر صاحب ادب عربی اور حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے اور تبحر علمی کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ کچھ عرصہ سے آپ ایک مبسوط کتاب "محاورات زبان عربی" تصنیف فرمارہے تھے لیکن سخت افسوس ہے کہ یہ تکمیل نہ پاسکی —

ہم مرحوم کے پسماندوں سے دلی رنج و ملال کے ساتھہ اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور مرحوم کے لئے دست بدعا ہیں کہ قادر مطلق انھیں سکون جاودانی نصیب فرمائے —

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے
ہم خدا جانے یاد آئے کسے

جشن یوم کلیہ جامعہ عثمانیہ

یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھہ سنی جائے گی کہ مجلس انتظامی انجمن اتحاد نے " یوم کلیہ " بماہ آذر سنہ ۴۰ فصلی منانے کا تصفیہ کیا ہے - یہ معزز اراکین انجمن سے پوشیدہ نہیں کہ اس جشن کی کامیابی یا ناکامیابی کا انحصار کلیۃً صرف انہیں پر ہے - چونکہ یہ ایک اچھا موقع ہمارے کارنامون اور علمی مشاغل کو پبلک کے سامنے پیش کرنے کا ہوتا ہے - اس لئے ہماری یہ دلی آرزو ہے کہ یہ جشن اس سال اعلیٰ پیمانے پر منا یا جائے - لیکن جب تک انجمن کے جملہ ارکان نیز اولڈ بائیز خاص دل چسپی کا اظہار نہ کریں ہمارے مقصد کی تکمیل اکمل طریقہ سے ناممکن دکھائی دیتی ہے - اس لئے ضروری ہے کہ عملی جوش اور غیر معمولی سرگرمی کا اظہار ہو تاکہ یہ جشن حقیقی معنی میں جامعہ کا شایان شان جشن کہلا یا جاسکے - اس کے لئے سب سے مقدم ضرورت مالی امداد کی ہے - حسب تصفیہ مجلس انتظامی ہر ایک رکن انجمن سے کم از کم ایک روپیہ وصول کیا جائے گا - اگر اولڈ بائیز بھی اسی قدر رقم عطا فرمائیں تو باعث ہمت افزائی ہوگا امید کہ معزز اراکین نیز ہمارے قدیم احباب یعنی اولڈ بائیز موقع کے اعتبار اور کام کی اہمیت کے لحاظ سے دل کھول کر پیش از پیش مالی امداد دینے سے دریغ نہ فرمائیں گے - اس لحاظ

سے ہمارا ارادہ اپنے پرو گرام میں مشاعرہ - معاشرتی جلسہ (جس میں ایک ڈرامہ بھی پیش کیا جائے گا) اسپورٹس - نمائش - تقریری و تحریری مقابلہ نیز ممکن ہوسکے تو انٹر کالج ڈبیٹ وغیرہ کو داخل کرنے کا ہے بشرطیکہ مالیات کی طرف سے ہمیں جلدایک سوئی حاصل ہو - تفصیلی پرو گرام انشاء اللہ متعاقب شایع ہوگا - لیکن اس عظیم‌الشان جشن یا سال گرہ کی تیاریاں وسیع پیمانے پر اس وقت انجام پاسکتیں ہیں جب کہ ہم اپنی امید کے مطابق معزز اراکین سے جلد از جلد چندہ وصول کر لیں وقت کی تنگی کے مد نظر معزز اراکین نیز اولڈ بائیز سے درخواست ہے کہ ۲۰ آبان ۳۹ ت تک اپنے ذمہ کا چندہ روانہ فرمادیں تاکہ انتظامات میں آسانی ہوسکے - چندہ مختلف رضاکاروں کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے یا بذریعہ منی‌آرڈر خازن صاحب انجمن اتحاد کے نام بھجوا یا جاسکتا ہے —

خازن صاحب کا پتہ حسب ذیل ہے —

مولوی وحید الرحمن صاحب

خازن انجمن اتحاد

مسرت منزل - کلیہ جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن —

(نوٹ) اگر دفتر کی ترتیب مناسب تصور کی جائے تو ایسی صورت میں دفتر کے لئے علیحدہ چندہ مقرر کیا جائے گا —

محمد مظہر حسین ' بی اے '

نائب صدر انجمن اتحاد

مجلس علمیہ

طلبائے قدیم کلیۂ جامعہ عثمانیہ

اغراض و مقاصد

(۱) کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قدیم طلبہ میں ذہنی اور علمی رابطہ پیدا کرنا —

(۲) ملک میں عام طور پر علمی فضا پیدا کرنا —

(۳) اردو زبان و ادب میں توسیع و اضافہ

مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے ذیل کے طریقے اختیار کئے جائیں گے —

(۱) طلبائے قدیم اور ارباب ملک سے تصنیف و تالیف اور ترجمہ کروانا اور ان کو منصہ شہود پر مجلس شائع کرنا

(۲) علمی و ادبی مباحث پر لکچر منعقد کرنا -

(۳) مجلوں کی اجرائی اور کتب خانوں کا قیام —

جماعت عاملہ

سید معین الدین قریشی ام اے (عثمانیہ)	ناظم
میر احسن الدین بی اے ال ال بی (عثمانیہ)	معتمد
سید حسین بی اے (عثمانیہ) ایم یس سی پی ایچ ڈی (لندن)	خازن
سید محمد احسن بی اے ، ال ال بی (عثمانیہ)	رکن
محمد عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی (عثمانیہ)	رکن

شیو موہن لال بی اے (عثمانیہ) ام اے بی ٹی (علیگ) رکن

میر ولی الدین بی اے (عثمانیہ) ام اے پی ایچ ڈی بیرسٹر اٹ لا رکن

سید محمد ام اے (عثمانیہ) رکن

میر اکبر علی خاں بی اے (عثمانیہ) ال ال بی آنرز (لندن) بیرسٹر اٹ لا رکن

سید محمد اکبر وفاقانی بی اے (عثمانیہ) رکن

سید عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ) رکن

چندہ

رکنیت - طلبہ قدیم سے (۳ روپے) سالانہ رکنیت دائمی (۲۰۰ روپے)

دیگر افراد سے (۵ روپے) سالانہ مما و نت زائد از (۲۰۰ روپے)

دفتر

بمکان مولوی سید محمد احسن صاحب بی' اے' ال ال بی وکیل ہائی کورٹ

کنٹہ روڈ حیدرآباد دکن

The Kazipet Balharsha Railway

WE thank Mr: S. A. H. B. for taking the trouble to correct an statement of Mr : Md Farooq in his contribution "The Kazipet Balharshah Railway" published in the Os. Magazine Vo': III. No. II. which in the said Mr: S. A. H's eloquent article is expressed to be "astouning". As an appropriate modification of Mr: Farooq's opinion that "The statesmanship & foresight of Nawab Tilavat Jung Bahadur, the then head of the public work Department came to it's rescue' ....." we should be gratified to publish Mr. S A. H. B's important and expressive declaration that "the credit for the completion of the Kazipet Balharshah Railway must be shared by the Ho'nble Sir Akbar Hydri and Mr: C. W. Lloyed Jones C. I. E., the present managing Director of the State Railway Board. The former was responsible for financing the undertaking and the latter for supervising and controlling the building of the line"

Editor

(4)

HOW VAIN IS THIS WORD

Clouds of charming azure hue the canopy of heaven screen,
Cool and pleasant is the weather, the scene a calmnes wields,
The creepers fondly embrace the trees, the dales and hills are green,
The air around to my weary mind a fragrant odour yeilds.

A brooklet shining babbles by, a gentle sound it makes,
Melodious birds above my head, their songs of love do sing,
My weary eyes are tear- bedewed, my heart with trouble aches,
Past memories wake in me and all my bosom wring.

Your lovely figure before me stands, a sleep in my soul doth creep,
A silence all around prevails, my spirits gently sink:
Of moments past sweet with delight I dream and bitterly weep,
Till all my tears are wept away and wearily then I think;
Based on troubles is our life, on pains, on woes from birth,
How vain this world, but Ah to love thee and plunge ourselves in mirth!

BY

S. KHAIRAT ALI ZAIDI.

IV Year

(3)

SUB-SILENTIO

O Silence! fail I thy mysterious soul to define,
When in and around me I for ever behold
Voices—the throbs of life, the music of joy animating
Even within the tranquil heart-chambers filled. N'er
For a moment, I, into that silent hush find myself
Which my heart, my tongue, my brain —
Active signs, ever knocking at the gates
Of thy spac'ous halls by tranquility ruled, from
Perpetual action saves. I mean not Death
The vain annihilator of life, but Peace and Rest,
Thy sister angels within thy sober arms locked—
The truest spirits of thy soul divine. Methinks
Thou art but a name which only survives
As long as the sound-vibrations, fail to reach
The ears—a gate of man's five unique powers.
But my Heart mighty, ever against thy sky-skating shores
Beating, ever flowing wifh Sound, Speech,
Thoughts and Sentiments, Powers acting against
Thy Magic stupifying, n'er for a moment
To thy fainting command humbly yields.
Ah! thou masked actor of Nature's mystic play,
Thy noble descent on Man's mind a sophisticated way
To unknown worlds of mystic Quiet opens, yet
Methinks thou art a drum beater of a more eternal music,
Which in its noisy roll, both soft and loud,
Bears unknown delights, unfelt joys and passions unemployed.

BY

M. A. QAYYUM KHAN, M. A.
Editor.

(2)

THE MUSIC OF LOVE

From the noisy world of pain and horror,
As I into the dreams of Love pass.
I find within me a hymeneal viberation
Even dancing along the living grass.

I see the throb of my delightful heart
Transfused into the dreaming moon
And see my light fly in the stars
To twinkle in the passive gloom,

I weep of joy and laugh with woe,
And clasp the world to my breast;
I smile at every blooming flower,
And kiss its rainbow crest.

I see the shade of my beloved maid
In every wandering cloud in white,
I find her nymphian image float
On ethereal wings of angelic flight.

And now I find her within my heart
Lulled into soothing sleep of Love,
Her starry eyes with maiden blush
Closed like a brooding dove.

Editor

The Muses' Corner

(1)

THE WHISPERING FOOTSTEP

Showered by moonbeams besides the fountain sheen,
I in blissful solitude sat
With the whistling breeze playing. My tranquil heart
Was set alight by a trance of rapture
When I, through the ivory shade, a blythsome whisper
Of a tender footstep heard.

Down on the streaming grass my eyes I cast,
And looked at the fragrant birch,
To the blushing rose – the herald of ealry morn,
And to the eglantine revelling
I lent my ears; the whole delightful throng
The welcome of an angelic footstep sang:
There stood glimmering in the moonlit shade
The snow white image of my beloved maid.

Editor.

at the At Home were Nawab Dr. Sir Hyder Nawaz Jang Bahadur, Nawab Dr. Sir Amin Jang Bahadur, Nawab Akbar Yar Jang Bahadur, Miss Amina Pope Mr. Abdur Rahman Khan, Nawab Jiwan Yar Jang Bahadur, Nawab Aziz Yar Jang Bahadur and various other guests besides a number of the professors of the College and students of the Department of History.

The Bazm is very grateful to all those who co-operated to make the various functions a success, especially the professors of the department of History and the Principal of St. Georges Institution (who lent his commodious gymnasium for the holding of the opening ceremony), and it offers its profound thanks to the Principal of its own College for having made it possible for the major part of the celebrations to be held within the precincts of the College.

The Bazm hopes to publish a complete report of the function with all the Papers "in extenso", a catalogue of exhibits, poems read at the Mushaira, etc. in course of time. This would form the third number of its publication the Khazina-i Tarikh. The first and second numbers, which contain many interesting papers connected with the Science of History, can be had from the office of the Bazm at R. 1 - As: 8 each.

late Moulvi Murtaza sahib.

The exhibition was seen by thousands of men and hundreds of ladies during the short two hours per day for four days on which it was open, of which one day was set apart entirely for ladies.

A number of meetings were held in connection with the celebrations at which Nawab Sir Amin Jang Bahadur, Nawab Jiwan Yar Jang Bahadur, Nawab Akbar Yar Jang Bahadur and Mr. Abdur Rahman Khan Sahib took the Chair. The papers read at the cele-brations covered a wide field and came from almost all parts of India viz.,

1. Professor R.B. Mowat (Bristol University): "Europe after the Treaty of Berlin."

2. Professor M. Habib (Aligarh Muslim University): "Abu Raihan Muhammad Alberuni".

3. Rao Bahadur Dr. Krishnaswamy Aiyangar (Madras Uuiversity): "The Brahman Ministers of the last King of Golconda."

4. Professor Hanumant Rao (Nizam College): "Deccan through the Ages".

5. Mr. Abdullah Chughtai (Islamia College, Lahore): "The Architects of the Taj."

6. Professor Haroon Khan Sherwani (Osmania University): "The Political thought of Nizam-ul-Mulk Tusi".

The last meeting which was held on the 31st. of August took the form of a Mushaira under the presidentship of Nawab Aziz Yar Jung Bahadur, Aziz, at which some very inspiring historical poems were read. The 'week' was wound up by an At Home given by the Sadr Nazim of the Bazm, Professor Sherwani, to those well-wishers of the historical science and the volunteers of the Bazm who had astively helped to make the celebrations a success. Among those present

by the spontaneous response they got from them. The activities of the Osmania University College Historical Society were welcomed not only by Professors in almost every part of India, but historians of world-wide repute such as Professor R. L. Poole of Oxford and Professor R. B. Mowat of Bristol sent their good wishes in letters addresed to Professor H. K. Sherwani, and Professor Mowat was also good enough to write a paper for the celebrations. Besides these two eminent exponents of the science of History in England, good wishes for the success of the celebrations were received from Professor M. Habib of Aligarh. Dr. Krishnaswomy Aiangar of Madras, Dr. Tarachand and Dr. Beni Prasad of Allahabad, Mr. Ghulam Yazdani Curator of the Archaeological Department of H. E. H. the Nizam's Government and various other historians of repute .

The week commenced with the opening of the Historical exhibition by Nawab Sir Hyder Nawaz Jang Bahadur, Dean of the Faculty of Arts and Finance Minister, who in an appropriate speech (which he delivered after the reading of the report of the last ten years work by the Sadr Nazim of the Bazm-i Tarikh, Professor Sherwani) congratulated the Bazm on the work it had been doing and indicated the different methods by which it could be further made useful in future. The exhibition, which consisted of original documents, old historical books, ancient coins and weapons of warfare, Bidary and other utensils of historical note and other important material, was housed in the liabrary of the Osmania Univerity College. Hyderabad is full of the most precious historical material, but unluckily it is very seldom that even an infinitessimal part of it sees the light of day, so that it is with a deep sense of gratitude that we mention the names of those well-wishers of the Science who were good enough to lend the Bazm even a part of their extremely valuable collections such as Nawab Sir Hyder Nawaz Jang Bahadur, the Curator of the Archaeological Department, the Curator of the Record Office, Professors E. E. Speight, Hanumant Rao, Agha Muhammad Ali and Agha Hyder Husain, Raja Bahadur the Kotwal Sahib of Hyderabad, Dr. Muhammad Qasim (the Poisons Expert) and the family of the

History week in Hyderabad Dn

The concluding few days of August 1930 were memorable in the literary and scientific history of Hyderabad. Ever since the foundation of the Osmania University under the august patronage of His Exalted Highness the Nizam ten years ago, the whole aspect of the literary atmosphere of the capital of the premier State of India has entirely changed, and apart from the recent phenomenal growth in the number of the educational institutions of the Dominions the last few years have seen a healthy development in the mentality and the psychology of the people. Immediately after the foundation of the Osmania University College in 1919, those who were responsible for the teaching of History in that institution became alive to the necessity of there being a Historical Society where students as well as professors should be able to discuss matters of historical importance and where outsiders might also be invited to throw some light on the knotty problems of History and allied sciences. It was with this object that the Bazm-i-Tarikh was founded in 1920, and it is a matter of supreme satisfaction to its well-wishers to have seen it grow from its infancy to it's present status. The officers and members therefore, thought it advisable to celebrate the tenth anniversary of its birth by a History week which began on the sixth of August and ended on September 3.

When the idea of celebrating the tenth anniversary was first mooted it was with some diffidence that the workers took it up, especially as the Bazm had been working very quitely and unostentatiously all these years. But when they approached those learned in the Historical Science in various parts of India, they were overjoyed and almost flattered

open. The building is very symmetrical, but there is no inscription except a verse from the Qoran. And the verse from the Qoran on the gate of this tomb is beautifully carved on black marble stone with fine flower designs in it. In the same enclosure there are two other mausoleums, one of which is superbly ornamented. There is a mosque, a house and a "samakhana" in front of the tomb. There are also two very deep wells.

Such therefore is the brief architectural study of Bidar which has such fine buildings, tombs and monuments of historical and archaeological importance. It is hoped that this will create greater interest among the study of ancient history, and throw more light upon ancient India.

Mohammed Zahiruddin.
IV Year
Osmania University College

Zainuddin Shah Kunjnashin. There are thousands of mango trees round this tomb which is very grand. There are Qoranic inscriptions inside. This saint came to Bidar during the reign of Alauddin Shah Bahmni and died at the age of 94 in 816A. H. The famous Chandah shah of Hyderabad the founder of the Arabic and Persian school of Bidar was a descendant of this saint.

Close to his tomb at a distance from each other are the tombs of Sheikh Ibraheem and Sheikh Sadruddin, the sons of the famous Saint Multani Badshah of Bidar. These two tombs are also pictorial in design.

In the low lands there are two other tombs, one small and the other a mosque. One of these large domes (which is situated in the east) contains the shrine of Syed Sadat, a saint who came to Bidar during the reign of Sultan Ahmad Shah Bahmani. This shrine is held in such veneration both by Muslims and the Hindus, that, on every Thursday, a large concourse of people assemble there to perform their vows as well as bathe in the reservoirs which are supplied with the tepid and mineral water oozing out from the adjoining spring, which is believed to be very effective in curing skin diseases. The following is the translation of the inscription directly above the cistern.

" The bath was constructed by Shafa Khan in the year 929 A.H. in the reign of sultan Shah-buddin Mahmud Shah son of Mohamed Shah Bahmani. "

Close to this shrine at the hill of Parnass is the grave of Shah Fathullah, the grand father of the famous saint Multani Badshah of Bidar. He came to Bidar during the reign of sultan Alauddin Shah Bahmani from Multan. He was an able and learned man.

A very beautiful mausoleum is situated at a distance of one mile from the town of Bidar near the Bahmani tombs. This mausoleum is of a saint named Shah Khalil-ullah-But-Shikan. The building stands on a terrace 8 feet high and consists of a hexagonal building of stone, 60 feet in height, the inner diagonal of which is 66 feet. This base is surrounded by a dome 45 feet high. There are 3 galleries out side the dome, the lowest being 15 feet broad, the second very narrow, and the third quite

Nawab Nizam Ali Khan, named Mir Hisam-uddin Ali Khan and Mir Riza Ali Khan. Beyond is a platform in the centre of which are two stone dishes carved in the form of a boat, which are at times filled with food for the poor. There is a "sama khana" (music hall) near it. There are several other tombs, a mosque and other buildings surrounding it. To the west is the tomb of Nawab Nizam Ali's wife Ashura Begam with its curious lattice work.

Near this Dargah is the grave of Syed-us-sadat Syed Amir Hamza Bagdadi. This saint was the descendant of Hazrat Mahbub Subhany the famous saint of Bagdad. He came to Bidar during the time of Aurangzeb who had a great reverence for the saint. His 'urs' is held annully in the month of Ramzan.

Out side the Fateh Darwaza about a mile to the east of Bidar is the grave of Mahmud Gawan on the bund of a tank. It is said that there was a grand tomb over his grave but was ruined and destroyed by the order of Ali Barid Shah. He was the able and wise prime minister of Mohamed Shah Bahmani. His father and grand father were the ministers of Gilan. He spent 40 years in travelling over the world and came, as a merchant, to the Bahmani court in the reign of Alauddin Shah Bahmani who detained Mahmud Gawan at Bidar and made him superintendent of the country. He administered the state for several years between the reign of Alauddin and Mahomed Shah Bahmani. He was a very able man, proficient in Philosophy, Logic, Astrology Mathematics, Medicine and Surgery. Besides this he was both an author and a poet. Owing to some mis-representations made to the King by the enemies of Mahmud Gawan, who had done great services to his King and country, the prime minister was assassinated by the hands of Jawher in 886 A.H. at the age of 78 years, orders having been issued when the King was in a state of intoxication, from which he shortly recovered. Having been informed that false complaints were lodged against Mahmud Gawan (who had already been killed) he issued prompt orders for the assasination of the malcontents. Gawan was the ablest prime-minister of the Bahmani dynasty. Many poets have written verses about the date of his death.

At a distance to the south of Barid Shahi tombs is the tomb of

Besides this there are many other gand, beautiful and magnificent mosques in the suburbs of Bidar but are now in a ruinous condition.

There are also many Dargahs (i.e. big tombs) of muslim saints, built by the Bahmani Kings, who had their spiritual sovereignty over the country. Bidar is full of Dargahs. We shall write something about the most famous and important among them.

The most famous and important darghah which is inside the town of Bidar is that of Multani-badshah who is held in great reverence by the muslims. People from distant places pay a visit to the shrine. Out side the tomb there are many graves of the relatives and followers of this saint whose full name is Shake Mohamed Multani. He lived during the reign of Humayun Shah, Nizam Shah and Mohamed Shah Bahmani. His 'urs' is held annually. Close to this dargah is Chandah-Shab's Arabic and persian school which is also a beautiful building.

There are many other beautiful tombs of saints in the suburbs of the town of Bidar. The most famous of them are the following.

The darghah of Shah Alul Faiz Min-ullah. a saint and the grandson of Khaja Banda Nawaz of Gulbargah, situated to the south east of the town; the road lies along the east and south of the city and through the Mangalpeth suburb, coming out by what is known by the name of the Habshi's guard, a place which has been fortified. Close to this is a groupe of trees, where the tombs of the saint and his family are located. The dargah has its southern gate handsomely adorned with blue encaustic tiles, and the door itself and the stones to which it is fixed and on which it closes are painted green. The top of this tomb is splendidly inseribed with sentences from the Quran in large and good letters. Within are three tombs with silk coverlids. A number of coins are let into the stones near the door and into the pavement near it. The tomb is 80 feet high. The descendants of this saint are living in Bidar. They hold a big Jageer. His u'rs is held annually with great pomp. To the south of this tomb are two more tombs which are said to have been brought from Aurangabad and are of the two sons of

In ancient days Bidar was adorned with a large number of gardens some of which still survive. Many of these gardens are now in ruins. One of them is the Farh Bagh. It is situated near the spur of a mountain where water oozes out from the natural rock in which is placed the form of the Hindu god Narsimha. The Hindus used to come for worship from distant places. The water flows four feet deep through a tunnel, 112 yard long and 12 feet high. The devotees have to wade through this water and are oblidge to carry a light with them through the tunel in order to make their way to the nitche already spoken of. There is a Jatra held here annually where several poor people are fed by the Hindu priest in charge of the temple. At the head of the spring there is a mosque, which was built by the Emperor Aurangzeb. The following is the translation of the inscription on the mosque:

> " (He) built a mosque in place of the temple,
> And wrote over its door the (Quranic) verse— "Veribly we conqured. "

" When the exalted mind of the Khadave. the refuge of Religion, supported by Divine grace, Abu l Muzaffar Muhiud-din Mohammed Aurangzeb Bahadur Alamgir, the victorious, was inclined to and occupied in destroying the base of infidelity and darkness, and to strengthen the foundation of the Islamic religion, the humblest servant Mukhtar khan Al Hasaini as sabzwari, the governor of the province of Zafarabad (Bidar) demolished the temple and built a mosque, and laid out a garden, which by the grace of the Omniscient- God were completed on the 25th of Rabiulawal in the 12th year of the auspicious reign 1082 A. H.) corresponding with the date contained in this hemistich: "

"By the grace of God the temple became the mosque"

" As the place was extremely beautiful and charming he (the humblest servant) styled it Farh Bagh (the abode of bliss). and entrusted it to the charge of his beloved child, blessed by long life and prosperity, Mirza Najmu-d-din Ahmad, the worthy son of Mirza Qamru-d-din Muhammad."

" Written by Qamrud-din Muhammad son of Mukhtar khanal-Husini."

"I have passed to a world whence I can not return.
Nor do I cherish this hope that any one will come to the place where I lie;
O Attar! through grief (lit: pain,) my heart is weltering in blood;
By God! both the worlds have lost all significance in my eyes"

"Alas! without us for a long time,
The rose will blossom and the spring will bloom,
Those who are in secrecy with us,
They will come and visit (Lit: pass) by our remains".

"Rambling about in ambition and lust,
We passed by the remains of many a person;
Canst thou cherish the desire of living for ever,
When thou hast not seen any one living eternally?"

"One who goes trailing his long skirts on the earth to day,
To morrow the dust of his earthly remains will be scattered to the wind,
O blindself! thy ashes will move about in thy bones,
In the same way as eye-powder moves about in the collyrium pot."

"The builder of this heavenly dome,
Is the good natured king Barid, of blessed memory.
The last hemistich contains the date of the building,
Style the dome the Vault of Divine light."

(934 A. H. 176 A. D.)

The sovereign presiding over the throne of the kingdome of faith, Ali Barid.
When he passed away from the narrow street of the frail world,
He found rest in paradise, and these words were heard from Heaven,
The date of his death is contained in "Found rest in Heaven."

987 A. H. — 1579 A.D.

Close by are 60 graves which are said to be those of Ali's wives, and a strange legend adds that they were all killed by his order in a single night. To the right of Ali Barid's tomb is Kasim Barid's tomb which is not so elaborately constructed.

Bidar and Hyderabad. Many people visit his mausoleum through out the year but thousands of people (Hindus and Muslims) come during Thursdays which are days of great show and interest in Hyderabad.

The second important group of monuments comprises the tombs of Bidar Shahi kings which are situated about a copule of miles to the west of the town. Once these tombs stood in the midst of elegant gardens with water channels, fountains etc, and had also charitable instituions attached to them, but now all these happy surroundings have disappeared. There is only a mass of ruins. There are richly ornamented buildings called the Naqqar Khanah, infront of the tombs. In the lower rooms a guard of soldiers was kept and in the upper part music used to be played. The most beautiful and a perfect piece of art is the tomb of Ali Barid the third ruler of the Bahmani dynasty. It is 57 feet square in plan with an opening on all four sides and crowned by a turnip-shaped dome. The total hieght of the building is 106 feet. The tomb is built of hard black trap up to the drum of the dome. The top is made of brick and lime to give adequate support for the extra weight. Each side of the square base is decorted with an arch 32 feet high and ornamented inside with beautiful inscriptions in gold and blue and with devices of flowers. The lower part of the domes is also elegantly carved. The hand writing of the inscription is very beautiful. The translation of the persian verse inscribed is as follows:

"O companion! when Death knocked at my head.
I fell down and my heart became gory;
Yesterday I was as rose blooming in the gardon (of Existence)
Today I am shorn of all of my plumes and feathers."

"Friend and relatives will come to visit my remains,
And enquire of my destination and where abouts!
If they sift the the earth of the whole world,
By truth ! they will not find any trace or sign of me."

roof. The calligraplist has shown his skill in arranging the writing in all the known styles:- Kufi, Tughra, Naskh etc, and hence inscriptions of great value for the study of the muslim palaeography in India. The inscription on the intrados of the dome shows the genealogical chart commencing from Mahmmed the Prophet which is written as follows:

" (1) Mohammed the Prophet, (2) Ali bin Talib (3) Khaja Hassan Baseri (4) Khaja Habeeb Ajami (5) Daood jai (6) Maroof Karkhi. (7) Siri Sakti (8) Khaja Junaid Bugdadi (9) Sheik Ahmad Gizali (10) Sheik Abdulla yoface (11) Noorud.din-Namat-ulla- Wali. (12) Shah Khalil-ulla- Butshekan, (13) Sultan Ahmad Shah Waliula Bahamani. "

The other incriptions of the tomb show a strong sufic spirit. The translation of two inscriptions is as follows:

(1) "Since the flood-tide of love flowed full on the ocean of my eye,
the seven oceans (of the world) appear a (feeble) current be'ore me,
In every form of creation I discerned Divine grace (Ni'matullah)
In all I have seen love and adoration".

(2) "Divine grace (Nimatullah) is one through out the whole world,
Yet thou shalt not find anotoher like one–nor shall any one else".

The dome and walls are inlaid from top to bottom with valuable stones of various colours on a golden ground and mixed with mother-o pearl; owing to the lapse of time these ornaments have become impaired and the inscriptions have unfortunately faded. This tomb and its work are unique in Hyderabad.

Next comes the tomb of Alauddin, the son of Ahamed Shah. It is of similar dimensions, but far less richly ornamented. The front part of this tomb is covered with tiles, pieces of which still remain. The work represents different shades of blue and is peculiar of its kind. The softness, cutting and flowering in the black granite of this tomb are very fine and quite peculiar of their kind.

Sultan Ahamad Shah is equally famous as a saint in Bidar. The Government have appointed one daroga and six khadims to take care of the mausoleum. Besides the salary they have a grant of land for the same purpose. The daroga of Ahamed Shah's 'Urs' used to hold annually after 'Holy' a Hindu festival at the government expenses, and is wellk-nown throughout

which are in group, two among them being very famous and have historical importance.

Of these two, one group is known by the name of Bahmani tombs. These are the tombs of the Bahmani Kings, which are situated at a distance of two miles from Bidar near a village named Ashtur. These are 13 in number. Out of these thirteen nine are the big tombs and the remaining 4 are the small tombs i. e. Maqabir. These big tombs are very much in the same style standing on square bases and surmounted by Bulbon's domes; but their chief interest lies in their rich decorations of tile-work, painting, flowering and stone carving. The name of these big and small domes are in the following order:

Small tombs (1) Sultan Kalimulla Bahmani.
i.e. Maqabir (2) Sultan Wali-ulla Bahmani.
(3) Sultan Ahmad Shah II Bahmani.
(4) Sultan Alauddin Shah II Bahmani.
(5) Sultan Mahmud Shah Bahmani.
Big tombs:- (6) Sultan Mohamed Shah Bahmani (fallen)
(7) Sultan Nizam Shah Bahmani (incomplete).
(8) Sultan Humayun Shah Bahmani (half fallen).
(9) Mukhdumi jehan (the wife of Humaun Shah).
(10) Sultan Alauddin Shah Bahmani.
(11) Sultan Ahmed Shah Wali-ul Bahmani.
(12) Hussain khan (son of Sultan Alauddin Shah Bahmni)
(13) The tomb of Sultan Ahmed Shah's wife.

The grandest of these tombs is that of Sultan Ahmad Shah Wali Bahmani, the founder of modern Bidar. This tomb has a square basement measuring 50 feet each side. The wall is 12 feet thick and in it are four arches 27 feet high. The basement is surmounted by a dome, the top of which is 120 feet from the ground. The interior of the tomb is most profusely adorned with paintings of persian style, which, on account of the richness of their colours and the elegance of their designs, are matchless in India. There are inscriptions which are painted in letters on a ground of deep blue. There is a diamond setting in the golden inscriptions of the

yellow arranged in zig zag lines. There are serpentine flights of narrow steps leading to the top of the minarets but they are in a dilapidated condition. About half the screen remains, on which are inscribed sentences from the Quran in large Kufi letters the effect of which is chaste and supurb. It took two years and nine months to comlete the structure. This college had a liabrary of 3,000 manuscripts during the time of Mahmud Gawan.

An explosion took place in 1107 A. H. which threw one minaret and distroyed that part of the building. Now there is only one minaret, mosque and the remaining part. According to Ferishta the account of explosion is as follows:

"After the capture of Bidar by Aurangzeb in th latter end of the 17th century this splend'd range of building was appropriated to the double purpose of a powder magaz'ne and barracks for a body of cavalry, when by a lightning accident the powder exploded and destroyed the greater part of the edifice, caus'ng dreadful havoc around."

The grave of those men who died by th's explosion are found in the court yard.

The translation of the Verses con'aining the date of the erection of this grand building is as follows:

"Th's college, with noble and high foundation,
Has been bu'lt as the Qiblah of the men of pur'ty.
Look at the s'ght of its Divine approval that its date of erection)
Can be gleamed from the Verse "Our Lord! accept it from us."

The words "Kharab-shud" give the year of the incident of explosion and ruin.

Though this building is in ruins, it is the grandest monument of the Bahmani Kings. It indicates that the rulers and their wise ministers were not merely rulers but patrons of learning as well.

Besides these there are some very famous historical monuments in the suburbs of the city of Bidar. These monuments are the tombs and mosques.

mir mahallas (head of the locality). There is no military training now in these talims yet there are military implements in them. Now the work of a Banker is nothing more than a mir mahallah.

The other two monuments of the Bahamani kings are the 'Jame Masjid' and the famous Madrasah (college). 'Jame Masjid' is the grand and magnificent mosque of the town and is more or less as extensive and big as the Mecca Masjid of Hyderabad Dn. The building is very massive and splendid and afford room for hundreds of men to offer their prayers at a time. It is erected on a raised platform. Having a deep well and a big cistern of water in the courtyard. The gate is also very grand. According to Ferishta and other ancient historians it was built during the reign of Sultan Mohamed Shah Bahmani by his prime minister Mahmud Gawan with his famous Madrasah and the Chawk in 877 Higri. But according to the Nawab Framurz Jung Bahadur's. 'A guide to Bidar' 'this masjid was built by Kasim Barid Shah II on the death of Ali Barid'. Historically however, this statement seems to be incorrect. There are many other local evidences, besides Ferishta and other historians which also say that this mosque is the monument of the reign of Sultan Mohamed Shah and his prime minister and not of Kasim Barid Shah.

Next to this Masjid the most remarkable movement of Bidar is the Madarsah or college of Mohamud Gawan, the prime minister of Mohamed shah. This magnificient building was built in 877 A. .H (1472 A. D.)and is 205 feet long 180 feet wide and 58 feet high which is divided into apartments comprising the Mosque with inscriptions of Qoranic verses, the library, the lecture halls, the professor's quarters and the students' cubicles leaving a space of 100 feet square in the middle as a court yard. The whole Madrasah is a three storyed building The Mosque and the library are in the front portion on either sides of the main gate way. The lecture halls in the middle of each of the three other sides, each semi-decagonal in plan, crowned by a dome with long sloping walls and a most pleasing appearance. The professor's rooms were in the corners octagonal in plan and with shelves for books. There is an excellent arrangement for light and air. There are stairs for ascending the 2nd and the 3rd storeys. The front of the building, which was adorned with encaustic tiles of different colours and shades, all arranged in different plans, had two minarets at each side rising to a hight of 190 feet. These minarets were covered with tiles, some blue and some other green and

There are many wells and a tank which is known by the name of "Talab Bum goonda" or Bum gonda tank. The surrounding land round this tank is all green with herbs and pastures. The climate is healthy and the scenery very pleasent. Close to this is a small habitation called by the name of "Dal-dhuri."

There is a small but an ancient temple on the Northern corner af this tank. This temple is known by the name of 'Dair Sangappa'. Raja Ambersing of Warangal under whom Bidar was a jageer used to visit annually this temple for worship. Though there is no bastion behind this temple yet there is a gun nine yards long. There is a small ancient fort on the southern corner of the tank which was built by the same Raja sultan Ahamad Shah Wali Bhamani, Having made Bidar his citadel instead of Gulbargah, he built this aforementioned splendid and magnificent fort by the side of this small fort which is one of the noble examples of the tolerance of Islamic kings. Else Ahmad Shah could not have allowed it to remain within this small fort as it was a monument of kings alien to his faith.

Besides the fort there are three more famous monuments of historic fame inside the city. Two of them are the monuments of the Bahmani kings and one that of the ancient Hindu kings.

The monument of the Hindu Kings is Chowbara. Chowbara is a round black tower situated in the centre of the town, it is 71 feet high, and was constructed several centuries ago used in the Hindu period as 'Deepmandal' for lighting Karthic lights. The date as to when the Chawbara was built is not known. There is a serpentine flight of narrow steps leading to the top of this tower. During the Taluqdarship of Nawab Framurz Jung Bahadur a clock has been fixed on the top of this tower. Now this Chawbara is serving the purpose of a clock-tower. The additions to this structure are now utilized for the police inspector's office. The Chawbara divides the town of Bidar in four quadrants as it were, which are known by the name of four different 'Talims'. The road from this tower going southwards leads to the locality of the town known as 'Pansel Talim; the road Northward. to the 'Manior Talim,' the westward to the Siddik Shah's Talim and the eastward to the Noor-Khan's Talim. During ancient days the town had been divided for military training. Now-a-days the military masters are known by the name of Banckars i, e. The

coronations of Bahmani and Barid Shahi kings. The whole structure of the building is in complete ruins. Owing to this it is difficult to find out its plan. Yet the remains of this mahall present a picture of the instablity of this world and the everlasting Power which has turned this pleasure house into a house of fear and ruin. The Magnificent gate of this Mahall survives the whole building. The remains of tile work, visible here and there on the wall as well as on the gate, prove that the building was once adorned with beautiful decoration. This is the same building to extol the magnificence of which the poet Adhari composed the following quatrain:

"How excellent is this strongly built palace, compared with the excessive loftiness of which,

The sky is but as a step at its threshold.
It is an impropriety to comere it with Heaven,
Verily! it is the palace of the Sultan of the world, Ahamad Bahman Shah."

There are many Zanana palaces close to this palace which are now in ruins, and except a few spacicus enclosures nothing of them remains.

There are many large bastions at frequent intervals in the rampart of the fort, some of which are very massive and splendid. These are mounted with large guns five or six yards long. At one place there is a gun seven yards long and another one in some other place is 28 ft. 11 inches in length, the circumference of which is one and a half yard. The surface of all these guns is well polished with bronze. Some of them have the makers name, date of construction, king's name, some verses from the Holy Quran engraved upon them together with directions and the quanitity of powder to be used. The inscription is in Tughra letters of pure gold and the letters are an inch thick, but some gold has been stolen away from these beautiful engravemetns as there is none to guard them from robbing. Now there is no gold which was in the marginal line. The year of construction of some guns is 988 A. H. There are small guns of different kinds and shapes on the remaining small bastions and towers. On some of them the name "Mohamed Kasim and year 1185 A. H. have been engraved.

in a runious condition and is dangerous to set up the roof by this means. An iron reservoir with pipes has been suitably fixed before the domelike portion for performing ablutions.

Historians hold different opinions about the construction of this mosque. Probably this mosque was built during the reign of sultan Ahmad shah Wali along with the construction of the fort. The reason in support of this opinion is the interesting historic account given by Ferishta in his history, This is the only grand mosque in the fort. Ferishta's account must be associated with this grand mosque only. Besides it has been the first duty of all the muslim Kings of India as well as of the Deccan that they used to build first mosques in their capitals and their conquered teritories. Before his conquest there was no mosque in Bidar as it was the capital of a Hindu Raja. Thus mosque can be accounted as the first in Bidar during the reign of sultan Ahmad shah Wali. Ferishta's account is as follows :

Prince Alauddin Shah was fond of learning and sometimes he would ascend the pulpit in the grand mosque on Friday and festivals and read the Khutba, in which he mentioned himself by the following titles: 'The monarch, just, merciful, patient, and liberal to the servants of God, Chief in the world and religious affairs, son of the most distinguished among princes, Ahmad Shah Wali Bahmani'. One day an Arabian merchant who had sold some horses to the king, the payment of which was delayed by the home-officers was present on that occasion. When the king read the above titles, he was roused by the ill usage he had experienced and exclaimed with a loud voice. 'Thou art neither the just, the merciful, the patient, nor the liberal king but the cruel and the false, who hast massacred the prophet's descendants, yet darest to assume such laudatory titles in the pulpit of the true believers.' The king struck with remorse, commanded the merchant to be paid on the spot, saying that "those would not escape the wrath of God who had thus injured his reputation."

It was the same mosque in which prince Aurangzeb had read the khutba in the name of Shah Jahan at his conquest of Bidar in 1686.

Close to this mosque are the remains of sultan Ahamed Shah Wali Bahmani's famous and splendid Takht Mahall. This Mahell had witnessed the

ancient times the Gangan Mahall was the king's private residence. And he used to give public audience in the Tarkash Mahall. Opposite to the Tarkash Mahall is the Royal A'shurkhana which is a strong and high building and in which in the month of Moharram, A'lams are kept. The translation of the inscription on the gate of the inner enclosure is as follows:

"By the grace of the Holy and Almighty God,
The building of bygone kings
Comprising mosques, fort, palaces and halls,
Were repaired by the Soveriegn-like Malik Margan."

Adjacent to the A'shur khana towards the west is a beautiful, extensive but a most massive mosque which was built specially for women to offer their prayers. This mosque is known by the name of Sola Khamb Mosque so called because the two spacious halls on both sides along with the pulpit and the arch are supported on 16 massive circular pillars at regular distances and are 4 ft. 3 inches in diameter. The mosque measures 295 feet by 77 feet, and is divided into square bays, which are surmounted by domes. These central domes towards the west end are bigger than the rest and are very high. The mosque has lost much of its fine lookout owing to the buildings which have recently sprung up around it and have unfortunately obstructed the view. Some of the domes have fallen down except the middle portion which is now enclosed by low walls, the mosque itself having fallen into disuse. An inscription has recently been set up on its walls, which originally belonged to a balcony built by Qalandar Khan the governor of Bidar under Aurangzeb. It runs as follows:

"In the reign of Shah Alamgir, the victorious,
By whose justice the world has illumined,
Qalandar Khan the bloom of the garden of the state,
Whose sweet odour has perfumed the country:
Before the sun of whose generous hand,
The treasures of the Ocean and mine dwindle to a particle,
Built a balcony as a memorial,
To last long under the Azure canopy of Heaven.
For the date of its erection from the balcony of the sky,
These words were heard :— 'The beauty-spot on the face of Bidar'."

There is a stair-case leading to the roof of the mosque. It is, however,

"I pray my king, may not this place be without you."

The translation of the inscription on the innerside of the same arch is as follows:

Every precious pearl which cherishes love in its shell,
Cherishes the desire to be g ven away in alms at thy court.
Any one who enters thy door is inspired with thy love;
As if love pours down from thy portico and balcony."
Invoker of Divine help, the supreme king, Majils-i-
Mukarram Humayun-i-Akram, Barid-i-Mamalik, Ali."

Over the windows are written Persian inscriptions formed of mother-o'-pearl and gold, the translation of which is as follows:

"O Thou! who hast br ghtened the sight of mine eye,
Who hast taken thy abode in my breast (Lit. taken my
abode in the bosom like the pearl in the shell.)"

The translation of the Persian inscription over the eastern window is as follows:

"Gracefully enter the chamber of my heart,
For that place has been adorned for thy use."

Besides these all the walls of the Shah Nishin are luxuriantly and beautifully adorned with exqrisite tiles of different hues and shades which attract the eye.

Close to the Rangin Mahall, are the remains of the buildings four or five stones high known as the Gangan Mahall, the Tarkash Mahall, the Chinie Mahall, the Nagina Mahall and the Royal bath. All these palaces were built during the reign of Mohammed Shah Bahamani. The lovers of archaeology will feel delighted to know that some of these palaces are are still in use and properly maintained. The Tarkash Mahal has become the Record room of the Taluqdar's office. The uppper story of the Tarkash Mahall, however is in a more or less dilapidated condition. The spacious halls with beautiful water-channels and cascades give us an advisable picture of the ancient glory. In

have been called by the name of Sharza Darvaza as there were a pair of lions carved on the buttress of it but the first and the entrance gate of the fort is called "Sharza darwaza."

Advancing further the traveller comes across the third gate called Gumbaz Darvaza which is the largest gate in Bidar, the top of which consists of a spacious dome, below which in the pavement is a stone, held in veneration by the Hindus. There is neither any inscription nor any design on this gate. By its side there is a triple ditch, the partition walls of which have been excavated in rock. There is the same kind of massive battlement built of stone as that of the entrance gate. Thus the main fort commences, from this gate only. The first and the second gates are not included in the main fort but they with their massive and strong battlements and ditches have been built to serve the purpose of fortification. From this gate the long line of royal palaces and buildings commences. We shall describe some of the famous buildings in detail below.

Entering the fort close to the Gumbuz Darwaza the first building of note is the beautiful and lovely Rangin Mahall. This was built by Ali Barid shah. In this building the office of the first Taluqdar is now located. There is no doubt that the first Taluqdar's office is mainly responsible for the preservation of this palace but it has made such alterations to suit the modern requirements which make one feel that the antique grandeur seems lessened. In this Mahall 'Ali Barids' Shah Nishin is of chief attraction. It is the grand display of the old tile and 'mother-o'-pearl' work which covers the walls. It has most beautiful and elegant floral and calligraphical devices, which add to its charm on account of its colour. Blue merging into green violet, and gold blending with rose-pink make it a perfect revelry of colour. Inside the Shah Nishin there is a marble tank which probably was kept filled with rose water to allay the dire effects of tropical heat. The arches and windows of this mahall are of highly polished black basalt and on a floor of this, Persian verses are inscribed in letters of mother-o'-pearl. Over the outer arch in the centre is written a Persian couplet, the translation of which is as follows :

> "My eye is the seat of your throne as well as the easing place of your thoughts."

divide the ditches in two or three parts. The first and last portions of these walls have been connected to the surrounding wall of the fort and doors have been made for water supplies. Thus two or three ditches are seen round this fort. Many other small bastions have also been built in these walls and passages for necessary thoroughfare. The barbicans, bastions, towers and gates are all very solidly built, and most cleverly arranged.

There are three kinds of such trenches here having many bastions with guns on each of them built in the central wall before the gate of the fort. The battlement of the fort is very massive and strong. The soft Bidri stone has not been used in its construction but the costly strong and smooth black stones of distant places. It has turrets and beautiful bastions, and goes to a length of 15 yards.

The fort has three gates. Though the first gate is grand and lofty yet it bears no carving and writing of any kind. There is an inscription on iron plate written in good hand writing fixed on the right hand door of the gate. The translation of the inscription is as follows:—

" This gate was completed on Wednesday, 7th Rajab auspicious 26th Julus year, equivalent to 1094 Hijree, during the subadarship of the most humble of pomp beings Mukhtar-Khanul-Husaeni alias Sabzwari, in the reign of the King with humble like Jamsheed, Lord of the extensive army, the victorious Mohee-udeen Mohamed Aurangzeb Bahadur the conqueror of the world and the great hero of the crusades may his country and Kingdom last for ever and ever. " The traveller has to pass on the first mentioned ditch on which a strong bridge has been constructed. On entering the gates splendid rooms are seen on both sides which might have been the sentinal seats but are at present occupied by the poor. From these the second gate of the fort opens into view. This gate is also grand, on the buttress of which a pair of lions are carved. The exterior of the gate is covered with enamelled tiles on which are flowers and writing in Tugra letters on blue yellow and red grounds. This writing is on such a height that it cannot be read. This gate ought to

Jemsheed pomp, Lord of an extensive army, Aboo Mohee-uddin Aurangzeb Bahadur, conqueror of the world. The great Hero of the crusades, may his country and Kingdom last for ever."

(2) Tulghaut Darwaza:-- The translation of the inscription on this gate is the same as that of the Shah Ganj, but it was completed on Wednesday 2nd Zikad 1082 Hijree, 15th year of the reign of Aurangzeb.

(3) Mungulpeth Darwaza:-- By the command of the most exalted, the most powerful, His Royal Highness Nawab Nasir-ud-Dowla, Asafjah, may his country and wealth last for ever. This gate was completed on Sunday the 11 th Rabi-us-sani 1266 Hijree, in the 22nd year of the reign of Humayun during the Taluqdarship of Hasan Iradut Bunda Khan Nishan- Shams-ud-din Khan alias Aban Sahib "Glory to God."

(4) Fetteh Darwaza : The translation of the inscription on the gate is the same as that on Shah Gunj and Tulghaut Darwaza, but it was finished on Friday, Rabi-us-sani 1002 Hijree in the 14th year of the reign of Aurangzebe.

Fetteh Darwaza is also called by the name of Noras Darwaza, Shahganj Darwaza by Koshki Darwaza and the Mungulpett Darwaza by Mahamood Darwaza. Aurangzebe had entered Bider through the Noras Darwaza. Thus this gate was named as Fetteh Darwaza.

Bidar must have been a fine city as the ruins of its noble monuments bear testimony to its pristine splendour. In describing the permanent buildings we shall first take up the fort.

1- *The Fort of Bidar:*

The fort of Bidar is a very splendid, beautiful and massive building. It is one of the greatest and most indestructible monuments of the Bahamini period. It was built in 830 Hijree (1426 A. D.) during the reign of Sultan Ahmed Shah Wali and took 4 year for its completion. The walls are surrounded on all sides by broad fosse excavated in rock Massive. Walls have been built two in some places and three in the others. There are trenches before the gate and some strong bastion to save as protection from the enemy. These surrounding walls have been so made as to

polishes the article.

ARCHITECTURAL SURVEY

There is a strong battlement having turrets round the town of Bider which is surrounded on all sides by a broad excavated in rock. There is a road which is made for communication near the fosse. This road is very high and has been built so nicely that the walls of the rampart seen to be very small if seen from a distance. It is impossible that the ball of the gun could harm the city walls because the high road which has been made in the circuit checks the ball from reaching the battlement. There are 35 massive bastions on the battlement of the town. There are connons on many of the bastions. Its hight is 12 yards and fosse is 14 yards broad and 15 yards is depth now filled with soil and betel plants grown in abundance. At the fall of the Bahamani Kingdom at 938H. Ali Bereed the 3rd king of the Bereed Dynasty having dismantled the ancient buildings and domes reconstructed it in 962 Higri. There are 13 gates to the surrounding walls. Out of the 13 gates five are at present in use for entering the city and the remaining 8 are at present completely closed up (1) Mungle peth Darwaza (2) Fatteh Darwaza (3) Tulghaut Darwaza (4)Shah ganj Darwaza (5)Dulhan Darwaza.

These gates are very grand and massive and sharp pointed conical and thick iron bars fixed on them which are an inch apart. Besides the Shah ganj Darwaza bastions have been made before every darwaza like the gates of the fort. A traveller reaches the gate after passing by the side of bastion and inside the battlement. After the Tulghaut Darwaza a great descent commences. A massive but rough gate had been made in it and is the only gate in which carts cannot come. There is an inscribed plate fixed in the middle of the right door of the gate in every gate except the Dulhan Darwaza. And are written in a good hand. The following are the translations of the various inscriptions.

Shah ganj gate: "This gate was completed on Wednesday the 11th Shawall 14th auspicious julus year corresponding with 101 Hijree, during the Subedarship of the most humble of human beings, Mukhtar Khan-ul Hassanini, alias, Subaz waree in the reign of the most exalted of the King with pomp like

according to the depth to which the plate is fixed and the value of the article depends upon the thickness and quantity of the precious metals used, and the degree of finish displayed in the execution of the patterns. Very thin leaf is used for the ordinary kinds, while in the more durable workmanship, gold and silver wires are employed. When the inlaying has been performed all over the surface in the manner described above, the hole in the bottom of the vessel left in the place of the opening through which the molten alloy was poured into the mould is closed with lead, and the whole surface smoothed and polished with a common file and scraper.

Next comes the final process, that of giving a permanent black colour to the surface. This operation is performed by the application of a paste made of salamoniac and saltpetre, ground up with brackish water.

The article to be coloured is first subjected to a gentle heat and thickly smeared with the paste, which is allowed to be upon it for hours. When dry, it is washed and thoroughly cleaned with water or with the aid of sweet oil, and the Bidri-ware is now ready for sale. The process of colouring imparts to the surface a permanent dead black hue, which, however, does not affect the parts where the ornaments are laid, but rather enhances the lustre of the white silver or the yellow gold in contrast with the black ground. Bidri-ware is not liable to rust, does not dint under the blow of a hammer, and breaks only when thrown-down from a great height or struck with violence. Captain Newbald states that he witnessed at Bidar the whole process of inlaying and "could not help admiring the precision, the lightness of touch, and celerity with which it was performed". The patterns of the Bidri-ware are generally of a floral description, more or less natural at Bidar.

As may be seen from the description, the manufacture of Bidri-ware is carried on under a system of division of labour. The different processes being generally performed by three classes of people, viz the moulder, the carver and the inlayer. The moulder prepares the alloy, casts the vessels and turns it to its proper shape with his lathe. The carver engraves the patterns on the surface of the vessel and the inlayer designs the patterns, inlays the ornament of gold and silver and finally colours and

fresh fuel and the heat gradually increased with the aid of a pair of bellows or by blowing through a bamboo tube. When the metals should have fused, the melted copper is poured into the crucible containing the melted zinc and the heat now applied with a renewed force which causes the metal to unite and to form the compound of which Bidri-ware is made. When throughly fused with each other, the molten alloy is poured into the vacant space inside the mould through one of the two openings described above. When cool the rough model of the required vessel thus formed is taken out by breaking the mould .

It has now a dull leaden appearance, is hard, but can be easily worked in a lathe to make the surface smooth and even. This smetting, moulding and turning up to this point are done by a set of people generally of the brazier caste who next pass on the vessel to the designer to trace upon it patterns of flowers and other ornaments. The designer first smears the vessel with a solution of sulphate of copper to give the surface ā black colour. This operation assists him to see distinctly the patterns which be etches on the smooth surface with a small steel point, and the carver to follow the tracing made by him. This vessel is next passed on to the engraver or carver, who following the lines traced by the designer, cuts them deep, and scoops out the designs with delicate, finely-pointed chisels of various sizes, worked by a small hammer. The surface now looks very indented and rough and requires a little smoothing down with a blunt chisel, before it is fit to recieve the inlaying. Both gold and silver are inlaid to decorate the Bidri vessels, and in Bidar copper is also sometimes used. Thin plates of gold or silver are laid on a bed of wax and resin, which prevents their moving about, and serves as a glue when pressed on the ground work. A small piece of paper is next inserted in to the cavities, made on the surface of the vessel, to take an impression of the excavated pattern. It is taken out and placed on the gold or silver leaf, which is cut into the exact measure thus obtained and the piece then taken up by the top of the finger and the chisel placed on its corresponding cavity, to which it is firmly inserted by a steel point, and gently hammered in. The inlaying is more or less durable

by his Hindu successors; but it attained its present state of excellence under theM uslims, who wherever they went, not only gave great encouragement to the indegenous manufacturers but also imported new art and industrial crafts from other parts of India as well as from the chief seats of Muslim civilization in Western Asia. But like many other handicrafts of India it also declined with the downfall of the Muslim Empire.

The most ordinary but first articles of Bidri-ware are Hukkas or smoking bowls, water jugs, spittons, betel cases, drinking cups, flowers, vases, tumblers, plates, and buttons &c.

As we had some connection with the technique of the trade we would here like to give a simple account of the process adopted in preparing the above mentioned ware. The first process in the preparation of these wares is the preparation of the mould. A quality of clay or fine dust made into a sort of paste by mixing with it fresh cow-dung, is put on a rude lathe, and when dry is turned into the required shape. A layer of wax and oil boiled together is then put upon it and the whole thing when dry is again turned in the lathe in order to make the surface even and smooth. Then it is covered with another layer of clay, and is allowed to dry. Two openings are then bored in the mould when it is subjected to a gentle heat, which breaks the clay and causes the wax to melt and run out through the holes. leaving a vacant space inside for the reception of the fused metal. This is an alloy of copper and Zinc, the proportion in which each metal is used varying in defferent places. At Bidar the proportion, according to captain Newbaed, is one of copper to sixteen of Zinc, according to Dr. Smith it is one of copper to four of Zinc. To mix the two metals now generally used, viz, zinc and copper, two earthen crucibles are made, one large and the other small. A thin coating of fresh cow-dung is put upon them, both inside and outside to prevent them cracking when put on fire. Zinc is put in the larger crucible and copper in the smaller and both are then put into a small pit, where a slow fire, generally of cow-dung fuel has been made. They are then covered with

150 feet in depth. The water is neither delicious nor sweet, yet it is very digestive and a good tonic and has proved to be useful for the growth of animals and vegetables.

The men of Bidar are strong and well built. So are the oxen and other useful animals. The cattle give much milk and the ponies are swift footed. The remoteness and tranquility, of the place give shelter to many, owls, kites and crows. An interesting featare is the groups of baboons abundantly found in Bidar. The government felt it necessary to spend Rs. 30 to distribute hundreds of loafs to these pesting animals. We would desire to deal more in detail with their features in this connection that it would serve to greatly interest our readers.

The baboons of Bidar are of five or six kinds. There are only male Baboons in one party whose head quarters is at Farahbagh, the remaining Parties consist of female baboons with one male baboon as a guard. This one male baboons has his full command and possession over all the females of the group. It is called by the name of "Bagda". It is impossible for the female of one party to go to the other party, otherwise a severe fight breaks between the " Bagdas " of both the parties and the victor takes possession of the subdued party. Many female baboons have their young ones playing and jumping round their mothers and clinging to their breasts so firmly as to become a part of their body. The old Baghda and the Farah Bagh parties have interesting fights among themselves often ending in the death of the leader.

TRADE AND INDUSTRY

The damascened work known as the Bidri-ware is at present a declining industry, though it was once a most flourishing industry of that city. It greatly deserves support to save it from extinction. This peculiar art derives its name from the town of Bidar, its original home. which according to tradition. was found by a Hindu king of the same name, for centuries before the Christian era. It is said that one of the Hindu kings of Bidar developed the art of Bidri ware, and used the articles to hold flowers and other offerings which he daily presented to his household gods. Considerable improvements were introduced into the manufacture

BIDAR, THE HISTORIC CITY

(*Continued*)

THE MODERN BIDAR

SOIL

THE land of Bidar is of brownish red colour. The soil of road has become very smooth by means of excessive traffic. There is little mud after rainfall since the smooth and thin soil flows away along with the water and the hard and stuff land of Bidar has a special feature of absorbing the water quite easily.

The outward appearance of this stony land leads us to believe that there might be several mines hidden under it. The water of some places gives the smell of sulpher. This strengthens our hypothesis. But it is a sad thing to note that we have lost the already known ones instead of finding new ones for our benifit.

The soil of Bidar is very fertile and has the capacity of growing all kinds of fruits and grain. The chief product of Bidar is white jawar. Among various kinds of rice the best and the famous are Kala Bath and Moti Chure. Kala Bath rice is very delicious in eating and gives a good smell after cooking so also the Moti Choure. Sugarcane flourishes in abundance.

IRREGATION

There is neither a big tank nor natural brooks situated in the population or in the suburb of the city which can irregate and fertilize the land although there are thousands of wells, perhaps not a single house being left without it. As the city is situated on a plateau the wells of Bidar are naturally dug very deep. It is calculated that they are 60 to

ترا ز سخن انوری است"*

which places him preferable to Anwari.

Khawja Jamalud- Din Salman has composed many Qasidas, perhaps following the footsteps of Zahir. The great expremental poet, Nizami, has applauded Zahir's simple and lucid style and delicacy of thoughts in a commendable language.

Opinions differ as to the superiority of Anwari over Zahir. The author of Taskera again gives a quatation from Doulatshah, which evidently defends Anwari.

"از خواجه مجدالدین همگر درین باب فتوا خواستند -

او حکم کرد که سخن انور افضل است† "

The well-known Indian critic Moulana Shibli has praised Anwari very much and has prefered him to Zahir.

But in fact if thought and language, are considered to be the two great factors of poetry, we could not hesitate to affirm that Anwari abounds in thought whereas Zahir excells in the expression of thought and the lucidity of language.

---

* Majma-ul-Fosaha. Vol: I.

† Majma-ul-Fosaha. Vol: I.

M. JAFAR HUSAIN.
'Bhongiri'
IV year.

Here poetry is spoken the Rose as a metapher.

Hyperbole:

بیرون ز کائنات پرد صد هزار سال سیمرغ و هم تاز جنانش نشان دهد

He soars very high but does not leave Naturalness.

عشقبازی بجهان کار چو من بیکار است

There is an another figure in Arabic, Persian and Urdu, to collect the words having dots below them or on the top as here:

و آتش زده شکوه تو در راه کهکشان وقتی که گم شود ز سر سرکشان خرد

نامم هنوز خسرو ساژندران دهد مگر که لشکر حرص و هوا کند مقهور

Anwari and Zahir

It is not easy to ascertain of the superiority of one over the other. Before giving any expression to this discussion we quote some sentences from literary men.

There is a well known saying which we have quoted elsewhere

دیوان ظهیر فاریابی در کعبه بدز اگر بیابی

Steal the Divan of Zahir of Faryab, even if you in Kaba posses.

This shows the supreme dignity of his poems, but another well-known saying defends Anwari that:

در شعر سه تن پیغمرانند هر چند که لا نبی و بعدی

ابیات و قصائد و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

[There are only four great poets in Persian: Firdusi in epic, Anwari in Qasida, Sadi in Ghazal.] As for as public opinion is concerned we find that both Anwari and Zahir hold prominent place as qasida writers.

The author of Taskera-tush-shu'ra (of Persia) gives a quotation from Doulatshah in defence of Zahir:

«کاهروی افاضل متفق که سخن ظهیر نازک تر و با طراوت

There is alliteratoin and recurrence of the same or of Cognate sounds in the letters of words. The contemporary of Zahir like Khaqani, Vat vat etc. make the fullest use of this resource of hormony. Take Zahir's:

سپیدہ دم چو شدم محرم سرائے سرور شنیدہ آیت تو بوالی الله از اب حور
D A B B C CA A A

How much does the music and impressiveness of the line depend on the words D (د) M (م) S (س) and T (ت).

بربادہ دادہ هیبت تو خرمن قمر و آتش زدہ شکوہ تو در راہ کهکشاں

Bur Bad Dad hay bat-e-to Khirmane Qamar
A ABBB A CC

محتاج نیست طلعت زیبائے تو بتاج شمشیر صبح را نبود حاجت نشاں
Moh Taj Neest Tal-a-Tay Zayba-e-To Ba- Taj etc
A AA A A A

There are some letters in Persian which serve to express the severe ideas. They are R, Teh,K, T, Ta, Da, Gha G. etc. They also colour and emphasise the picture of the scene and event which are under expression. Ferdusi is the master of such words. Here we shall give instances from Zahir:

مریخ را خطر بود از صدمت سنان ... ...

Mirrikh Ra Katar Buad us Hybatay sinan.

گیتی ز فر دولت فرماندۂ جهاں ماند بعرصه ارم و روضۂ جناں

This verse shows the grandeur of a kingdom even with its sound effect.

Simile :

از غصه خوں گرفت چو مل ظلم را جگر وز خنده باز ماند چو گل عدل را دهاں

Anger is similarised here to wine and smile to the opening of Roses.

Metapher:-

بهمین گلے که مرا بشگفد ازو این است ... ...

چه بارهاست زتو بر تن سوام وهوام
چه داغهاست ز تو در دل وحوش و طیور

His gentle heart was full of the love of all creatures:

بداں طمعے که دهن خوش کنی زغایت حرص
تشنه مقرصه که قے کنه زنبور

Divine content and Faith in God.

بهویں گلے که مرا بشگفد از و این است که بنده خوانم خوه را و سرو را آزاد
گهے لقب نهم آشفته زنگیء را حور گهے خطاب کنم مست و سفله را راد

He did not want to praise these wicked wealthy people who have no virtue.

I shall give some more instances to show Art in Zahir's poetry:

مقبل کسے بود که زخورشید عارضت هجران تا بسایه زلفت اماں دهد

It is the same idea which W. Drummond said in his poem "The lessons of Nature:"

"Find out power which wildest powers doth tame,
His providence extending every where,
His justice which proud rebels doth not spare,
... ..."

The superiority here is to Zahir Faryab. He expressed one idea in two simple lines, which W. Drummond could not but expand it in four lines.

طاؤس جاں بجلوه درآید ز خرسی چوں طوطی لبت بحدیثی زبان دهد

Sweetness is the distinctive character of this verse.

راه نجات بسته شود بر عدو چنانکه مرگ از حرز عنان بره کهکشان دهد

Though Zahir was not fond of using various figures of speech, he always hated it, yet every now and then they appear naturally and unconsciously.

many succeding posts, Urfi in particular loved to tread upon.

The foremost element of Zahir's genius is his simple and lucid style, and the fluency of his language. "His sagacity and peneteration are indeed remarkable. His style is characterised by clearness, vigour, a wonderful felicity of phrasing, a coloquial ease which preserves a literary distinction and rarely descends to the level of commonplace".

Standing apart from the poets of his age, he gained popularity. His panegyries like those of his contemporaries do not overflow with vain, exaggeration and seldom go to the unnatural height of imagination. His way of expression is natural. He possess the creative and the imaginative power equally.

Yet he is not quite free with the conventional style of panegyries, an style which has been stamped in the very literature and minds of the great literary figures. Among that we find unnatural turnings of thoughts given expression to in the form of exaggeration.

Professor Browne, in his Literary history of Persia, gives some instances to prove Zahir as a man of bad character. Poetry is the mirror in which one could see the reflection of the poet's nature. I shall here try to present the noble side of his mind, which is to a satisfactory extent possessed of pious feelings. For instance:

جهان رباط خرابست بر نوزرگه سیل گمان مبرکه بیکه مشت گل شود محمود

He hates the world and man's vain pride in aquiring it:

به آستان فنا دل منه که جای دگر برای نزهت تو بر نشیده اند قصور

He has faith in God and the life after death .

تو درمیان گروهی غریب مهمانی چنان مکن که بیکبارگی شوند نفور

He advises to live on good terms with the people of the world:

ببین که تا شکمت سیروتنت پوشیده است
چه مایه جانور انداز تو خسته و رنجور

1. Ohcdoddin Anwari 575.
2. Akshi Kati. 663–680 A. H.
   1265–1287 A. D.
3. Abdul Wasay Jibali
4. Afzaluddin Khaqani 592 A. H.
5. Rashiduddin Vot vat 578 A. H.

ZAHIR'S POETRY

The diwan of Zahir of Faryab consists mainly of Qasidas, fragments, quatrains with a few ghazals, making, nearly four thousand couplets all together. The author of "Majmaul-Fusaha" says:

بالجمله چهارهزار بیت نظم که دارد رزوست

He was like Anwari mainly apanegyrist, There is a well known saying—

دیوان ظهر فاریابی در کعبه بدزد اگر بیابی

(Steal the diwan of Zahir-e Faryab, even if you find it in Kaba)

and we think it speaks well for the greatness of his poetry:

In the twelth century A. D. we mark a sort of opposition between two classes of poets in Persia. One was a Group, of poets who sticked to conventional poetry, of which they already had examples. They wanted to continue the monotonous style and were fond of using pompous and stilted circumlocutions as the main features of poetic art. With them the importance and interest of poetry lay in gaudiness and bombastic Phraseology. The other party consisted of poets who were fond of singing plainer but more emphatic songs. They desired to establish like Wordsworth of England a simple and lucid style free from all outward embellishments. The poets forming the first group were Rashiduddine-Votvat, Abdulwasay Jibali,etc., and those constituting the second were Akshi Kati, Anwari and Zahir. The latter was a sort of poetic revolution so to say and the pioneer of this revolution were Anwari and Akshi Kati. But the poet who raised it to its highest pitch was Zahir. He led the other poets to a path which

هزار بیت بگفتم که آب ازو بچکید که جز ز دیده دگر آبم از کسے نکشاد

The following verse gives another glimpse of his despair :

درین زمانه چو فریادرس نمی یابم مرا رسد که رسانم به آسمان فریاد

But here instead of showing the disparagement towards others, he seems to attend to a sort of Divine Content and faith in God.

So he lived in the Court of Ardshir for three years and then attended to the Court of Ehlestain who was a king of a high poetic taste and whose Court was enlightened by poets like Abul'ola, Falaki, and Kha'qa'ni. He had given them high titles and had sanctioned large pensions for each of them. The romance of " Laila and Majnun" of Nizami is known to have been written by his order.

He tried to have an entrance in his court but the odds were against him which brought about his ill lucked future. Being quite distracted he hastened towards Iraq where Ildigiz was governing as viceroy of the Soljuqis, but died soon after Zahir's arrival. Qazil Arslan succeeded his throne and Zahir was opportuned access to the court where he wrote some of his famous panegyrics in his praise. The following is the matla' of his widely celeberated Qasida:

شرح غم تو لذت شادی بجان دهد ذکر لب تو طعم شکر در دهان دهد

To the great misfortune of our poet, Qazil too was soon murdered in 597 A. H. and Zahir had to repair towards Atabak Nusratud-din Abu Bekr B. Mohammad who was noted as a patron of many poets and learned men of his age. Nizami had dedicated his great Epic the 'Book of Alexandar' to his name. To the last ten years of his life, Zahir continued his attachment to the court of Abu Bekr and wrote many Qasidas constituting one third of his Diwan. He died in Rabi-ul-awal 598 A. H. (December 1201 A. D.) and was buried in the graveyard of Surkhab by the side of his famous contemporary, Khaqani.

Now, after mentioning some of his most famous contemporaries we pass on to the consideration of his poetry.

But unfortunately the Amir too did not pay mueh regard to the poet. He lived there for two years, and being disappointed, left Isfahan for Mazindran. This disappointment however brought a great reward to literature if not to the author's own life. He wrote a very appealing Qasida, mentioning his misfortune, perfidy of the age and the disregard of his patrons in a pathetic. and affecting manner and submitted it to Husamud-daola Ardashir, but seems to have reaped no advantage from it. One of the Couplets in that Qasida are -

بزرگتر زهنر در عراق چیزے نیست زمن مپرس که این نام برتوچون افتاد

When his disappointed state reached its height, he was able to bring out some of his best and most effective poetry which is well known to literature, just as the great Indian poet Ghalib gave vent to his lyrie utterance by havingcertain disappointment in life. For instance

حریف مطلب مشکل نهبر فسون نیاز دعا قبول هو یارب که عمر خضردراز

In this well known couplet the poet, setting himself aside from all hopes and desires longs to abide by whatever already exists in the world. Same is the case with Zahir. He beheld the inattention of his patrons and being quite unrestrained, he wrote

مرا که چوں هنر خویش نیست چنداں بخت خوشا فسانهٔ شیریں و قصهٔ فرهاد

(When I am illfavoured by my poetic skill and art, it is better that I should repeat only the fable of Shirin and Farhad). Here is an interesting picture of his discontented mind :

تنمے که من از فضل در جهاں بینم همیں جفائے پدر بود و سیلی استاد

He thinks that the punishment he had received at the hands of his parents and the strokes of his teacher's cane, since they were given with a view to milarate his future, were the only kind regard and sympathy he could get in life.

Then he mentions the disregard of his patrons in a sort of selfappraising love:

هزار دامن گوهر نثار شان کردم که هیچکس شبهٔ در کنار من ننهاد

اعرات الفرق بین دال و ذال وهی اصل فی الفارسی معظم

گل ما قبل سکون بلا واؤ فدال فما سواه معجم

(Know the difference between Dal and Dhal, for this is an essential principle in Persian,

Wherever it comes before a quiescent letter except Wao, it is dal; but otherwise dotted Dhal).

Almost all the biographers of Zahir have praised his learning and ability for instance the author of Tadkera-tush-shuara writes*:-

"در حکمت و فلسفه یکتائے روزگار بود"

An another biographer writes†:-

ظهیر بسرعت فهم، جامعیت فنون علمیه متصف بود سیما

علم حساب و هندسه و در شعر انشاء دستے داشت

After the termination of his career as a student he went to Nishapur and was received by the King Toghan Shah, who had been the patron of many learned men and poets. Nizami Gunjuvi appraised him in his Masnavi 'Khusrow and Shirin' which begins with the verse:

بدیں تخته رواں تا جام جمشید بسلطانی بر آمد نام خورشید

Zahir remained at his court till the death of Toghan, and left Nishapur for Isfahan. He wrote a panygeric in the praise of Abdul Latif B. Mohammad, the chief judge, who was a accomplished man of letters, which begins with :

شبے بخیمهٔ ابد اعیان کن فیکوں حدیث حسن تو می رفت والحدیث مشخوں

---

* Taskeratush-sho-a-ra by Abdul Ghani.

† Majmo-ul-Fosaha Vol: I

ZAHIR OF FARYAB

(The purpose of this article is to present to the readers a short but vivid picture of Zahire-Faryab's life and poetry, who being a great qasida writer of Persia is not widely known to the world of letters).

Sadrul-Hokama- Zahirud-Din Abul Fazal Tahir was the son of Muhammad Faryab. His birth- place Faryab is in the west of the river Oxus, near Baloh, as he himself says in a fragment:—

چونکه از فاریاب مسکن خود سوئے دیں مرتفع جناب رسم

(From Faryab which is my home, I am coming to your Majesty's court.)

Some biographers have mistaken Farab for Faryab. Farab is situated in the North of the river Oxus, where the famous philosopher Hakim abu-Nasar Muhammad lived,

Zahir was the pupil of Rashidi Samarqandi, who was the court-poet of Khizar Khan, the King of Alkhani, who had given him the title of Syyedush-sho-ra. After the death of Khizar, Rashidi went to the court of Jalalud-Din Abul-Fatah Saljuqi. Omuq-Bokhari, Amir Moizzi, Masood-B. Saad were Rashidi's Contemporaries .

Zahir was a great Scholar of Persian. He studied Philosophy, Mathematics and Astronomy. He knew Arabic too as Browne says, * " He has some delicate verses. The following is a verse which he composed in Arabic to indicate the distinction between the letters Dal [د] and Dhal [ذ] in Persian language:

* A literary history of Persia (Four great poets) E. G. Brown,

have seen them again and again kindling to the work of poets like Wordsworth, Browning, and Tennyson, when they are given the faintest chance of appreciating it. Not one young man in ten thousand, among those capable of appreciating literature, will revolt against even the familiar poem that found, in the "first affections" of youth, the "master-light of all our seeing."

But our metropolitan journals have been dinning into their ears that there is no knowledge or device in the past that can help them, and no real hope in the future to which they are going. I know of nothing sadder than the sight of the young trying to conceal the intellectual wounds that the elderly cynics have inflicted upon them; for the quiet sadness of many of the more thoughtful of the younger generation arises from that bitterest and most desolate feeling of the human heart--- "They have taken away my Master, and I know not where they have laid Him."

BY

ALFRED NOYES.

(*A chapter from the author's splendid Book*

"*Some Aspects of Modern Poetry*")

worths unknown, although his height be taken."

Love's not Time's fool, though rosy lips and cheeks
Within his bending sickless compass come;
Love alters not with his brief hours and weeks,
But bears it out even to the edge of doom.
If this be error and upon me proved,
I never writ, nor no man ever loved.

We talk of giving the new generation its oppurtunity, and our cynics are laying upon its shoulders the heaviest and dreariest burden the young have ever been called upon to bear. We are giving them only one-half of the message of their profoundest pessimist the half that can choke their souls with dust. We are telling them that dust ends all; we call on great comtemporary names in literature to emphasize it and to silence the reply of their own hearts, and they are not always able to summon up that vast cloud of witnesses which in all ages has pointed the human spirit to a realm beyond these voices. The editors of journals concerned with literature are making the most stupendous mistake if they think that the little metropolitan coteries who have substituting cleverness for feeling, and sophisticated brutality for the simplicities of our fathers, in any way represent the great majority of the public or even that part of it which reads literature. The claims of some of the new rebels to be representative of the modern spirit appear to be based on the extreme smallness of the sales of their books, but this does not prevent a disastrous confusion of values if editors of journals do not realize this and are not alive to their responsibilities. One of the great difficulties is that the critics who ought to be safeguarding the best of our literature are the very men in whom familiarity with it has induced weariness and a desire for anything that will tickle or scorch jaded palates. But this is not what their audiences may justly require of them. The generation is being confused from above and misled even by "educational" introductions to literature. It is quite ridiculous to suggest that the young men of this generation are themselves in revolt against the masterpieces of literature of former generation. I have had the opportunity of addressing audiences of many thousands of students in the college of the New World, and I

SPECTATOR if one asserts that our great new cities will not be built any the more quickly if we devote our energies to the destruction of Westminster Abbey. The predominance of the destructive mind in what I have called certain sections of metropolitan criticism is closely connected with that loss of the central position, that loss of a belief in the fundamental harmony of things of which I spoke earlier. It has become the fashion to estimate a man's power in art and literature by his ability to suggest the utter futility of human effort and the ultimate meaninglessne s of the universe. There is, of course, a shallow optimism; but I do not know that it is any more common than a shallow pessimism. I do not know that it is any easier to be optimistic at the present day than to be pessimistic. Those who take the view that, ultimately, nothing matters, are of little value in any department of life, and certainly they cannot produce the greatest art. If the universe is meaningless, so must be the art produced by it. There is, of course, a profound pessimism; but its depths are not sounded by the discovery that there is a skeleton an inch beneath the skin of man. There is a profound pessimism in the Book of Ecclesiastes, but the greatest word of that Book is not in the proclamation that all is vanity, but in the moment where the writer is caught up in to the universal harmony, and calls upon youth not to revolt but to remember, and does so in the recurrent rhythms of poetry: "Or ever the silver cord be loosed, or the golden bowl be broken, or the pitcher be broken at the fountain, or the wheel broken at the cistern."

We are sometimes told that those of us who profoundly disagree with the philosophy of futility must not venture to criticise or state our reasons for disagreeing with the eminent intellects who proclaim it; but, if the appeal to authority is to hold good in this curiously self-contradictory ear of rebellion, I for one am quite ready to make my appeal to the highest name of all in literature. Those who affirm that, because beauty fades and youth perishes, we are all the puppets of a meaningless power, were answered in anticipation, three hundred years ago, by the greatest of all dramatic poets, speaking, not through one of his characters, but through his own lips and form his own ever-living soul, and affirming that above all our tempests there is an ever-fixed mark, a star "whose

" These men, " said John Burroughs, one of the finest of mod - ern American writers, in commenting on this " poem, " claim to get their charter from Whitman. I do not think he would be interested enough to feel contenpt for them. These men are the ' Reds ' of literature . They would reverse or destroy all the recognised rules and standards upon which literature is founded . "

I am quoting of course , an extreme case here , but the author of this work is frequently spoken of with immense reverence by poets and critics who ought to know better , and , incredible as it sounds , educational institutions (for whom John Burroughs is as out of date as Emerson) have given this work their benediction . There is little danger of work of this kind imposing itself upon the larger public, The danger is not so direct as that . The danger ... and it is a very real one ... arises from the fact that a very large part of the metropolitan criticism in both England and America has grown weary and cynical, and likes to amuse itself by waving aside its proper task and confusing the minds of the new generation by suggesting that to be new and unlike anything that has ever gone before is the sole worthy aim of any artist . It is only in time of rigid order that the destructive mind is really useful , and even then it is only useful as a means to an end ... the construction of something better . The destructive mind can only exist when it is in a very small minority . As soon as it is in the majority the civilization by which it is produced comes to an end , At the present moment the destructive mind in literature is popular , fashionable . It is the conventional thing to be a rebel , and the rebels are patronized by the reactionary Press . In fact, the whole ground has shifted under our feet during the last ten years ; and unless we realize that a revision of values is necessary , with some attention to the changes in the meaning of our former literary labels, there will be nothing but chaos in literary criticism for the next few years . We want all the new ideas, and especially all the new achievements , that the new age can give us; but one can hardly be regarded as a reactionary, even by the

harmonies, are a part of and blend imperceptibly into the larger music of art and the universe.

In summing up, it can be said with perfect truth that never in the history of the world was there a time so fraught with danger to the great heritage that we have recieved from the past. Cur litrature shares that peril. We see the signs of ignorant charlatanry, often---as one of its exponents has confessed—deliberately ungrammatical, taking upon itself to dismiss not only all formal metrical English poetry, but the metrical poetry of all the ages, on the ground that those who cannot spell or master the elementary technique of their art have nevertheless attained to the subtler truth of expression. Again and again it is affirmed by superficial cirtics, whose tastes seem to have been formed by the cinematograph, that the crude language of a drunkard in a pothouse is a more vital and subtle means of expression (" red blooded " is , I believe the phrase) than the English language as used by the masters, with their exquisitely delicate shadows of meaning and their infinitely subtle and precise tones and semi-tones. In America this moment has gone further than in England; but its initial impulse was given by weary critics in search of a new sensation on this side of the water, and they are frequently hailed as masters in our own literary columns. One of the leaders of this school in America recently published, says a great American journal, the following typical " poem " :

My shirt is a token and a symbol
More than a lover for sun and rain
My shirt is a signal
And a teller of souls.
I can take off my shirt and tear it,
And so make a ripping razzly noise ,
And the people wil say ,
" Look at him tear his shirt. "
I can keep my shirt on
I can stick around and sing like a little bird
And look'em all in the eye and never be fazed,
I can keep my shirt on .

As monkish scribes from morning break
Toiled till the close of light,
Nor thought a day too long to make
One line or letter bright.

Till last, when round the house we hear
The even song of birds,
One corner of blue heaven appears
In our clear well of words.

That glimpse of the sky is all that is needed to corroborate the theory of Wordsworth, and I do not for a moment mean to suggest that poetry and art have any direct didactic function to exercise. We find the same piety of speech directed to the same end in work which at first sight might seem to be primarily concerned with the revival of an interesting literary form; as, for instance, Mr. Edmund Gosse's Ballade of Dead Cities, where the same suggestion of an infinite horizon touches the forgotten walls and towers with the light of poetry. Another modern poet has shown us how even our modern machinery lends itself to the uses of poetry, how indeed it may be treated as a kind of microcosmic symbol of the universal processes. As in M' Andrew's Hymn —.

They' re all awa ! True beat, full power, the clangin' chorus goes
Clear to the tunnel where they sit, my purrin' dynamoes.
In'erdependence ab olu'e, fore een, ordained, decreed,
To work, ye' ll note, at any tilt an' every rate of speed.
Fra' skylight–lift to furnace–bars, backed' bolted' braced an' stayed,
An' singin' like the mornin' Stars for joy that they are made

It would be possible to give many examples from the best of contemporary poetry to show that all art at its finest passes beyond the material facts of this world and lays up its treasure elsewhere. There are, of course forms of art which are purely decorative and at the same time fully justify their existence, but even these, in their rhythms and

Most important of all, there is no other to compare with it in the unfailing pulse of that profound music which flows from the source of all great poetry. In eight lines he can give you a pageant of the process through which this planet has passed: he can give it with the scientific precision of a Huxley and the profound music of a Lucretius. The simplicity of the words in those eight lines (they are almost all of one syllable) has doubtless misled many of our moderns into thinking that their moving tide is asleep.

There rolls the deep, where grew the tree.
O earth, what changes hast thou seen!
There, where the long street roars hath been
The stillness of the central sea.
The hills are shadows, and they flow
From form to form, and nothing stands.
They pass like clouds, the solid lands.
Like clouds they shape themselves and go.

We may not all be to affirm our clear vision of the goal to which Tennyson affirmed that universal pageant to be moving ... but all the true poets, from the greatest to the Least, have allowed us to see their music flowing in the same direction. Brooks and rivers they allow flow onward to that one immortal sea. Stevenson allows you to see it, even in his Child's Garden of Verses ... a perfect example of how the poet can use small things to shadow forth greater things.

You find him carrying out his theory even in verses so purely literary as those which he addresses to the Muse:

Resign the rhapsody, the dream
To men of larger reach:
Be ours the quest of a plain theme.
The piety of speech.

theory of Wordsworth holds good for poet after poet. It has nothing to do with any didactic system. Wordsworth himself exemlified it nowhere better than when he first struck the note of that neo-paganism which developed later into the religion of beauty of Swinburne and his contemporaries:

So might I, standing on this pleasant lea,
Have glimpses that would make me less forlorn,
Have sight of Proteus rising from the sea,
Or hear old Triton blow his wreathed horn.

The fire was caught from the hands of Wordsworth by that greatest literary artist of the nineteenth century whose name, until quite recently, it was hardly permissible to mention in certain intellectual circles. I mean, of course, Tennyson. Mr. Kippling once wrote in answer to a line of praise from Tennyson: "When the private in the ranks is praised but his general he does not presume to thank him, but he fights the better the next day." Mr. Kipling's early letter to Tennyson should, I think, be inscribed on the title-page of that complete study of modern poetry for which we are waiting. The new gospel of to-day, of course, is "intellectual arrogance." But self-conceit is a poor substitute even for youthful hero-worship, and a still poorer substitute for the gratitude, and affection which filled the eyes of Southey in the presence of his never-failing friends —— the mighty dead. There were many among the new intolerants who were bewildered by Mr. Saintsbury's recent inclusion of Tennyson among the twelve greatest writers of the world; but their bewilderment has no remedy unless they are prepared to read, with proper care, a certain poem called 'In Memoriam.' It is probably the greatest elegy in any language, not because this or that authority says so, but demonstrably.

It is the greatest because there is no other to compare with it in range of thought, or in the exquisite delicacy and quiet strength of its craftsmanship. But its thought must be examined in its proper historical relationship, and strength must not be confused with crudity or the mere absence of light and shade.

holds true. When Toby Belch and Andrew Aguecheek call on the Fool to give them a song in Twelfth Night, he suddenly lifts above their half-witted and half-drunken mirth one of the most exquisite of all the brief songs of youth and love in the whole range of literature :

O mistress mine where are you roaming ?
O, stay and hear, your true love's coming
That can sing both high and low.
Trip no further, pretty sweeting,
Journeys end in lovers, meeting,
Every wise man's son doth know.

And in those lines there is a deep undertone of music which conveys far more than the superficial meaning. It is an instance of how the poet, as well as the musician can take three sounds and make of them not a fourth sound, but a star. He is dealing not only with terrestrial journeys, but with the journey to that land beyond our horizons, the land where all roads meet. It has profound metaphysical meaning, though it is touched in as lightly by the hand of the master as a butterfly settles on a flower. The meaning is conveyed by the music; and it is not to be esteemed as one estimates the content of a sentence in a scientific text-book. But it is just this undertone of music that differentiates this poem from the mere drawing-room ballad, and exalts it to the realms of great art. It is just this undertone of music that the destructive minds in modern literature have never been able to create, to understand, or even to hear. When he speaks of the " true love that can sing both high and slow" there is suggestion of that music which George Meredith heard rolling through the universe from the heights to the depths, and from devils to angels; and the distance from which we hear it, the lightness of touch with which it is rendered, does not prevent our recognition of it. Though it is hardly more definite or less clear than a glance of the eye, it is in its own way an appeal to

That Light whose smile kindles the Universe,
That Beauty in which all things work and move.

Coming nearer to our own period, it would be easy to show how the

Arnold could affirm that our race would come to find a sure and surer stay, would seem to be lost. And what is that secret?

Perhaps the truest and most comprehensive description of the nature of poetry (and by poetry I mean the essential substance of all the arts) was made by Wordsworth, in some sentences that sound curiously remote from the present day, and yet are worthy of the closest attention, even from the charmingly sophisticated young lady who conducts the poetry columns of that wildly anarchistic and rebellious journal, The Spectator. "The religious man", he wrote, "Values what he sees, chiefly as an imperfect shadowing forth of what he is incapable of seeing. The concerns of religion refer to indefinite objects, and are too weighty for the mind to support them without resting a great part of the burden on words and symbols, by a process where much is represented in the little, and the Infinite being accomodates Himself to a finite capacity. In all this may be perceived the affinity between poetry and religion,"

All creative art, in other words, is consciously or unconsciously symbolical and the mistake that has been made by modern realism lies not in its insistence upon "images" of superficial details and appearances but in merely reporting them without regard to their significances as shadows of the eternal reality, or the possibility of using them as images of that Beauty which is also truth. This is the sole aim of all the true poets and of every imaginative artist. Their songs and tales are, in their most tragic and in their lightest vein, touched with a gleam from a world beyond our own. For what is tragedy? It is not a declaration of universal futility, a description of the painful things that may happen to an Accident from Nowhere or the annihilation of a meaningless toad under a nonsensical harrow. It is perhaps a farewell to every thing in the world that we know, but it is at the same time a welcome to the heavenly powers. All great tragedy surveys the world under the eternal aspect; and though it may be able to affirm nothing of the world beyond, it is in its very agony a postulation of that world. If you turn to the poets in their lighter vein you will find that Wordsworth's poetry still

That is genius ! The power, in eight lines, to reintegrate a disordered world, by relating all its scattered and fragmentary tones to the central and eternal harmony.

A good deal of scorn has been poured upon the last two lines of this poem and the intellect of its author by those who have forgotten or never known that it had any context, and that it occurs immediately after one of the most vivid murder scenes in poetry . Browning deliberately paints the world in its blackest and most evil disorder before he gives you that exquisite moment in which he reintegrates it and shows you once more "The glory of the sum of things."

That basis of the universe in an ultimate harmony is the first postulate of all thought, all science, all art, all literature. Without it there is nothing left to us that has the slightest meaning. And, indeed, a large part of our modern literature dose seem to have reached that final stage of negation. It has reduced the world to dust and ashes and left it there. It has turned from the world in its completeness; turned from the world that contained the souls of Shakespeare and Beethoven, and insisted on pointing us to the dust and ashes in which he says that these and our whole universe must end. It has turned from the things which we do know about the greatness of human life (for if we have any inward life at all we have experienced them), those great factors which can only be referred to something greater than themselves, some divine power at the heart of the universe and has declared that all these things are illusion; while, in the name of realism, it has occupied itself with the dust of which we know nothing, except that, under the scrutiny of science, it does indeed become an insubstantial pageant.

Some of the most notable figures in contemporary literature have been telling us or basing all their work on the assumption that the world is an accident; and it has been made one of the tests of a man's power in art and literature that he should be able to state a negative and despairing philosophy in a new and startling way, without the slightest regard to its truth, or to anything but its value as a means of impressing careless readers with the intellectual greatness of the author. For such writers as these, the secret of great poetry, the poetry in which Mathew

and most urgently demands consideration, is the appalling fact that a very large section of our metropolitan criticism—the section which is called "intellectual" and is most vocal—should have treated the works of this author as works of genius simultaneously with the condemnation of some of our noblest literature. A leading French critic said, "With this book Ireland makes sensational re-entry into the high literature of Europe." And some of those metropolitan journals which are responsible for the formation of opinion in this country and allow their literary columns to advocate what they editorially condemn accepted the statement with the characteristic respect which these literary rebels against authority will pay to every authority on earth except that of truth and right. The result is deadly to literature, for it confuses all real values in the minds of the new generation. It is not the young; it is not the new generation in revolt that is responsible for this confusion. The confusion is produced by the cynical, sophisticated, middle-aged or elderly pseudo-intellectual, sitting in London and stimulating his jaded senses with the abnormal and the corrupt. They tell the young that these things are the hall-mark of genius, and the young are bewildered.

Genius! What these men know of genius?—the clear water of the spring at the door, the water stirred by the wing of the angel, the spirit moving where it listeth, and speaking, not through the lips of those whom the sophisticated would choose, but through the lips of the child, and the lover, and the poet. I open the pages of one of the poets whom they delight to dishonour as having no word for our own time, and I read:

The year's at the spring,
The day's at the morn,
Morning's at seven,
The hillisids's dew-pearled,
The lark's on the wing,
The snail's on the thorn.
God's in His heaven,
All's right with the world.

in, chaotically . No word or thought conceiveable in the gutters of Dublin or the New York Bowery is omitted . There is no criminal court in this country which would not brand the book as inexpressibly degraded; and yet only a short time, ago in a leading newspaper, I saw its author referred to as one of our masters . Weighing every word I say that, whether we know it or not, this is nothing less than a national disgrace ; a disgusting blot upon our national heritage ; and it is all the more disgusting in that it took place at a time when some of the noblest work of the last century — work with human faults, but, as in the case of Tennyson , work that may outlive England as Vergil has outlived Rome — work of this quality was being depriciated and treated with a silly and ignorant contempt . One critic , in a leading journal , recently , said " we resent " the fine defence of Tennyson recently made by Dean Inge . I have not noticed any resentment of this far more serious matter , which absolutely confirms that defence ; for the author of this book in more than one passage echoes the fatuous depreciation of Tennyson .

I have cited the extreme case of this book because it is a complete reduction to absurdity of what I have called the literary anarchy of the hour . The book was exalted as a work of " genius " by a system of mild condemnation — for , of course , it was " condemned " — just as others have been damned by faint praise . It ought to have been simply consigned to a sewer . Intellectual Bolshevism has brought us to a point where work of this kind is , even if condemned , regarded as work of " genius , " while we may wait indefinitely before we find the leading reviews dealing properly with some of our best contemporary fiction . Let me make it quite clear that I cite this extreme case only because there are a thousand gradations of shadow before this blackest depth is reached ; and it is most imperative that attention should be called through this particular example to the thousands of other cases which are merely of the same tendency ; and to the gross incompetence or cynicism of certain sections of metropolitan " criticism " . The book itself is utterly worthless and beneath consideration ; and it is too corrupt to have more than a brief and surreptitious existence . But what concerns us all ,

without precedent in the history of any civilized people. I have the documentary evidence to prove what I now assert, and I think the time has come for some plain speaking.

In a recent number of the Quarterly Review there was a review—an exceedingly able review — of a recently published novel, which I say without hesitation is the foulest that has ever found its way into print. Much of it is obscure, through sheer disorder of the syntax. My attention was first called to it by a column and a half in a leading journal, where it was said to be eagerly awaited by " select literary circles . " I call the readers particular attention to that phrase. The writer said that " its very obscenity is somehow beautiful " and " if this is not high art, what is ? " A weekly journal followed with eight columns in which the book was compared with Goethe's Faust. The critic who wrote this particular article is one of the most brilliantly gifted of the new generation. I do not make this comment to depriciate those gifts. I make it because I am conscious of them, and of the importance to our literature that gifts of this quality should be used to elucidate and not confuse values in the minds of his readers. I am concerned, not with personalities, but with truth. I want to say as emphatically as I can that I am making, not an attack, but a plea for some of those honest simplicities of thought and art which the cynical mood of the hour is obscuring to our national peril. A leading novelist proclaimed the author of the book in question to be a " genious." Writer after writer took up the word, until the name of the author and "genius " seemed to be almost inseparable . Even those who shrank from this book accla - imed an earlier work by the same author as that of a " genius" quite unmistakably . (I am quite ready to deal with this matter separately if necessary ; for I have read the book, and it is contemptible in every respect .) The Quarterly Review is fully justified in printing its exposure of the critics who praised the more insane product, but even the Quarterly is unable to tell the whole truth about it . The technical quality of the writing is beneath contempt . An artist at least endeavours to select significant details, but this simply puts every thing

it is an evil spirit—a spirit of destructive hatred. I have seen the exponents of both movements talking on platforms to men and women engaged in education, and the exponents of both movmenets are of the same type. They usually have a grudge against civilization, and nearly always an immense hatred of their own country. They are all great enemies of " institutions " ; and, in many cases, they forget that the universe itself is an institution, and bump their heads not only against the laws of the civilization, but also against the laws of Nature. Worst of all, they are frequently praised, almost passionately, by that fine old institution, THE SPECTATOR. That able editors should exalt this fraternity to the intellectual heights is to play the old game of sacrificing truth's allies to the enemy ; and it is time that some revaluations were made in the contemporary intellectual world.

The almost malignant desire to depreciate the writers of the former generation who, like Tennyson in his landscape work made technical rivalry difficult, has been accompained by obvious and amazing ignorance with regard to the quality of his thought in his greatest work and its relation to the thought of his own age. The work of this great poet has been spoken of again and again with the contempt of complete ignorance, and occasionally of malicious perversity. An intellectual worlda s "sincere" as ours in its desire to set art and literature above every kind of propaganda (except that of its own political or personal prejudices) should be able to realise that the landscape work of Tennyson can be enjoyed for its own sake. When a leading " intellectual " dismisses Tennyson and Longfellow together as if they were of equal calibre, it is as if he were to put Gainsborough and Landseer on the same level. It is simply suggesting the thing that is not, and there is no excuse for it. I have even read an attack upon the " shallow thought " of Tennyson in which he was accused of not having faced the fact that nature was " red in tooth and claw ", the writer being beautifully unconscious of the authorship of a phrase which has become one of the chief weapons in the armoury ef the modern specialist in pessimism. Even the morality of Tennyson has been impugned as unworthy of the young generation, who were—— quite ridiculously—— said to be in revolt against it ; and, at the same time in the columns of English journals something happened which is quite

Indeed, in American anthologies, published by reputable houses, this movement, imitated in England has even gone so far as the announcement that such and such a work cannot be true poetry, because it is so ultra-conservative as to be grammatical. The demand is for "radical" poets. The word has no political significance in America. It means only poets who can substitute "like" for "as" (in accordance with the captions of the cinematograph), poets who can blunt the fine edge of the language and obliterate the delicate shades and tones, poets who can break down their heritage and use their hobnailed boots on the memories of their own most illustrious dead. It may be admitted that Longfellow is not a great poet---not nearly so great a poet as the Emerson of the THRENODY---but there is not a single writer among the so-called "radicals" in America who could write anything comparable for a single moment with Longfellow's introductory sonnets to Dante, or a lyric like that which once fascinated W. E. Henley:

I remember the black wharfs and the slips
And the sea-tides tossing free,
And Spanish sailors with bearded lips,
And the beauty and mystery of the ships,
And the magic of the sea
And the voice of that wayward song
Is singing and saying still:
"A boys will is the winds will,

And the thoughts of youth are long, long thoughts. This may not be poetry of the highest order; but which of the "radicals" could even approach it, and by what right are dozens of incompetent and dishonest critics confusing all real values and trying to teach the new generation to despise its simple beauty? There is, of course, no direct connection between the intellectual snobbery that sniffs at Longfellow and the grimmer assault that has been made elsewhere upon what the Bolshevists call the "literature of the bourgeoisie"; but the spirit behind these movements is the same, and

course is condemned for writing even those vivid and biting lines in LOCKSLEY HALL, so very much more realistic than any living poet has ever dared to open the lines about "the crowcouch of incest in the warrens of the poor" because that is "rhetoric" and "Rhetoric" is a word that your "modern." with a social passions, will apply to any poet of greater power and broader outlook than their own; even when he is fighting their battles. They forget that there is not only the false rhetoric of the second rate politician or decadent poet, but also a true rhetoric which throughout the ages has formed part of the highest poetry; that the Greeks of Homer often spoke rhetorically, and that this is no more incompatible with poetry than that they also spoke grammatically. They forget that Rome lives in the rhetoric of the ÆNEID; that the best of the speeches in PARADISE LOST are rhetoric; and that a very large portion of the great familiar passages in Shakespeare can be called rhetoric. Some of them ... in HENRY V. for instance ... are even (Oh hideous intellectual crime!) "patriotic rhetoric"; while in JULIUS CAESAR there is a blaze of rhetorical poetry that ought to make some of our fluttering and fastidious "modern" shrink like startled fawns. The greatest of his sonnets ... like some of the greatest of Wordsworth ...are rhetoric. Even in Shelley ... and in ADONAIS ... the spirit of poetry and the rhetorical form are often inseparable. The ODE TO THE WEST WIND, from its opening apostrophe to its final rhetorical question, might be printed in a text book on rhetoric, as a classical example of the art of pleading. When men are in earnest about anything it is sometimes quite natural for them to plead; and in such a case it would be bad art to let them do anything else. But facts mean nothing to the parrot and the parrot cry "rhetoric" is simply used as an offensive weapon, or to bluff an innocent public into the idea that now, at long last, a coterie has discovered "images," and that everything else is superseded. The sheep who follow the coterie become, as Mr. Gosse said recently, "Obsessed with an almost crazy fear of rhetoric," and they might almost as well be afraid of syntax

The modern revolutionary, who merely uses the old forms made easier, does not usually know enough about them to recognize the really new and more difficult development. I say development because the really new is always a development. Your modern will congratulate himself on his freedom from the restrictions of Dryden, Wordsworth, Tennyson, and Swinburne, without considering whether he has subjected himself to any compensating law, or evoked the beauty that can only arise out of a difficult medium, rebellious to the hand and brain. But if our new revolutionary is confronted with a really new development, a new lyrical measure, for instance, springing out of the unspent and unageing fountains of our national poetry, with a throng of new harmonies, outer and inner, his faculties are about as much use as a basket of new-born kittens. He devotes himself then to the task of misrepresentation, by one of the ancient methods described by Coleridge in the BIOGRAPHIA LITERARIA, or —— and in this he must be admitted to be comparatively new —— by sheer bluff and the parrot-like use of a meaning-less catchword. Forgetting how Coleridge proclaimed it before him, he will proclaim that all poetry must now specializing in the making of "images," and he will turn a sublimely blind eye upon the fact that all the great poets from Homer to the present day have filled their work with "images," and that they had the advantage of including other things too.

Another "modern" will specialize in great "bleak" thoughts, of an immensely "noble" and impressive character, about the austere futility of human life and the august fatuousness of the universe. Such thoughts are easily discovered if one is a thought-hunter; and they are certainly no newer, at their best, than Lucretius. But, instantly, every other kind of writing becomes "shallow" or trivial. The note of joy and human affection is sneered out of existence by vacariously "bleak" critics. A steady disparagement of the intellectual capacity, and even the sincerity, of those who disagree with the great and noble conclusions aforesaid, begin to flow through the literary columns; and all the literature produced by those who have something to say and something to believe in is dismissed as "rhetorical." Tennyson, of

the present day, were an invention of Queen Victoria. His own contribution is what he calls "free verse," and as Mr. Chesterton said recently, "You might as well call sleeping in ditch. free architecture." The movement is backward from the higly and delicately organized to the different homegeneousness of the lifeless — halting on the day, of course, at various stages of primitive brutality.

But there is a more serious aspect of the matter than this. All over the English-speaking world this hunt for the easier way in technique has been accompanied by a lowering of the standards in every direction. The quality of the thought and the emotion has been incredibly cheapened and the absence of any fixed and central principles has led to an appalling lack of discrimination. Literary judgements in many cases have become purely arbitrary. Sometimes they are merely a matter of the coterie to which an author belongs, and they are marked by an intolerance, a dogmatism, and an ignorance for which there is no parallel in our literature. The desire to break the continuity of our tradition has been fought by three or four outstanding critics. It has been met by Mr. Edmund Gosse, with the weapon of an irony as delicate as that of Anatole France. Critics of a later generation like Mr. Clutton Brock, Mr. J. C. Squire, and Mr. Robert Lynd have also steadily sought to maintain a just balance between the old and the new. In the LONDON MERCURY some months ago there was an article by Mr. Clutton Brock which should be read in every educational institution of the English-speaking world. But the tendency of the moment, backed by a hundred influences, some of them political, some of them apparently originating in Central Africa, and others in the cinematograph studios of Los Angeles, is to submerge all the finer shades of thought, all the subtler tones of beauty, in the general flood of half-educated mediocrity, tyrannously ruled by little literary Soviets, the members of which are able to spread their views in slackly edited journals. Instead of endeavouring to comprehend all that is of value in our literature, these writers are continually endeavouring to eliminate everything but the particular result which they themselves desire to achieve.

One of the results of the great enlargement of the field of human thought during the last century was the increasing tendency among modern writers to loose sight of these realities, and to loose their hold on any central and unifying principles; to treat all kinds of complex matters as if they were quite simple, and, where a hundred factors were involved, to treat a problem as if it involved the consideration of only two or three. It was a century of specialization, and each group of specialists strayed farther and farther from the common intellectual centre where they could once all meet. The result in art and letters has been a growing decentralization (or in the most exact sense of the word a growing 'eccentricity") which may be disastrous. There are signs of it already on every side. On every side the same fight is being waged in art and letters as is being waged politically in Russia, a fight not between old fogeyism and bright young rebellion, but an abnormal struggle between sanity and downright sanity: between the constructive forces that move by law and the destructive forces that, consciously or unconsciously, aim at destroying real values, at obliterating all the finer shades and tones in language and in thought, and at exalting incompetence.

There is an enormous difference between some of the destructive movements of today and the progressive revolutions of the past. Up still about thirty years ago revolutions in art and letters had a way of adding something of value to what we already possessed. The new revolutions merely take away. They say, for instance, to the painter: "It is unnecessary for you to know how to draw." (The value of that statement, of course, can be estimated by the multitude that it admits into the fold.)

In poetry your new revolutionist invents no new forms — that would involve a difficulty, and he searches always for the easier way. He very often issues the old forms made easier. He says sometimes, you should abandon metrical form altogether, and he believes apparently that the regularly recurrent rythms of the tides, the stars, the human heart, and of almost every true poet from Homer to

Some Characteristics of Modern Literature

Despite the vagueness of the title which I have given to this essay, its aim is perhaps unusually definite. I believe that the time has come, in art and literature, as in every other department of life, when we must take our bearings; when we must try to discover, if possible, the direction in which we are moving and—still more important —the direction in which we ought to be moving. we ought to make up our minds about certain fundamental principles, and say definitely whether we really want or do not want some of the new ideas which — to speak quite plainly— the police are engaged in suppressing and many critics of art and literature encouraging. It is time, in short, to wake out of our Laodocean slumbers, and decide whether we are on the side of development and construction or on that of destruction and a return to barbarism. The intellectual world is suffering today from a lack of any profound belief. It has lost its religion, and it has lost that central position from which it could once see life steadily and see it whole, under the eternal aspect. Rules and conventions, being no longer related to any central certainty, have degenerated into mere social codes which are subject to every whim of fashion, The ruling passion, with old and young , is the desire to be in the" movement , " no matter where it may be leading : and still more , the fear of being thought to be " out of the movement . It is a matter for curious reflection that these blind followers of the blind are doing precisely what they quite erroneously think was done by the nineteenth century . They are slavishly following conventions , and forgetting (simply because their convention are new) that there are realities , and eternal realities : standards , and eternal standards; foundations, and everlasting foundations.

elements; and eventually to transcend the natural sphere and pass on into the higher supernal regions; to indentify itself with the Self-at-all. It is a silent journey of the soul, through the sinuosity of Nature to infinity beyond. It is in short an elevator, an ennobler of both mind and matter.

Nations, as individuals, that have given a free play to their noble faculty of the mind have reached the acme of glory and renown.

Shakespeare and Milton, Newton and Bacon, Dante and Goethe, Firdausi and Omarkhayyam, Disraeli and Curzon — as, indeed, any other poet, philosopher, artist or statesman of note have owed their greatness and glory to the exercise of this divine faculty. Contemplation is, indeed, the ornament of life; for, as poetry beautifies and exalts the life. so does contemplation, from the sublunary to ethereal spheres of Existance. The pantheon itself seems to have conspired to endow man with the faculty. It is indeed a Divine blessing which man should enjoy and luxuriate in.

ZAHIRUDDIN AHMED.

dactyle touch which evokes a melodious strain from the harp. Indeed the touch is but the transfusion of the contemplation at play; for thereby that sleeping loveliness starts suddenly into a throbbing, palpitating beauty Contemplation is thus instrumental in investing life with its charms. It is thus the poetry of life.

Our poetry, our philosophy, our science, and our art, are all primarily the offspring of our contemplation. It had been savagery in the world in the beginning. Men lived like brutes, their perception restricted within the narrow limits of their primitive wants. Their acts were guided by the barest animal appetites, until they learned to think and to contemplate; and then gradually grew in their consciousness an appreciation of the existing beauties, and of future possibilities. This consciousness has ever since lent itself to the discovery of new facts, new phenomena, new arts new sciences, and new philosophies; so that man and the world have grown to be what they now are.

The world, now is indeed not the world of the pre-geo-logic antiquity; nor that of the prehistoric ages, nor yet of the medieval mediocrity. It has constantly grown to the discovery of new beauties, leaving behind trails and milestones marking the stages of its forward progress.

Is it, then, denying the fact that contemplation is the poetry of life, as it has been working out the sleeping beauties and charms of existance?

In all the three provinces of life, physical mental and spiritual contemplation equally functions to evolve order out of the seeming chaos, harmony out of the seeming discord, unity out of the seeming diversity. It probes into to the arcana of Nature; and rallies diverse forces into collective cooperation with a gradual harmonious evolution. Like poetry it brings into relief the sympathetic beauties of Nature, moulding diversity into one harmonious whole and tracing it finally, and by esthetic and metaphysical stages, to its one source of emanation ---- the Grand Cause, the Univerasal Essence!

Contemplation is the ennobling effort of the soul to realise itself to drink deep at the fountain of Nature; to establish its kinship with the

CONTEMPLATION IS THE POETRY OF LIFE

Life would be dull and uninteresting — a matter of routine, without imagination lending it its pictresque colouring. Without imagination it would be a mere matter of give and take — a purely business-affair entailed on the individual by the sheer necessity of existance. It would be withont a miracle which lends to things a flavour and a zest. It would, in fine, restrict the individual to mere animal existance, which is destitute of the poetry of life i.e. of its finer feelings, graces sensibilities.

Poetry is harmony; while imagination is a faculty that senses the harmony, and as such, it is the source of the pleasure that life has. It imparts a radiance, and an animation, to existance. Were there no imagination, there would be no sense of beauty, no aspiration, no emulation, no longing to compete for the amenities and the elegencies of life. And above all, there would be no desire to harmonise ourself with the economy of nature.

It is by the working of the imaginaton that one comes to the consciousness of the higher graces of the being. By it one is impelled and helped to contemplate on his own being and its possibilities and the interrelation of the vast array of Nature by which he stands surrounded. By it one is inspired with a curiosity to find out his relationship with Nature and withthat of the Creator of Nature.

Contemplation is imagination exercised and is a labour of love bringing one, as it does, to a more intimate and harmonious association with the phenomena of the creation.

Poetry has its being and lies concealed in the harmonies of Nature. It is a dormant potentality; while contemplation may be likened to the

a mystic." Building shadowed in the light of moon as the shadows of evening begin to fall and the sun sinks in the west behind the carenellated walls the dome and the minarets soon appear into monuments of soft celestial light. The gentle blowing of the breeze, the sweet songs of the birds and smell of roses think the heart and intensify the ecstatic grace and charm of the monument.

In the moon-light however it is all a dream and a fancy and sitting on the steps of the entrance gate, one would behold the moon drifting above the trees with its silver light stealing round the base of the tomb, creeping gently upwards to the pinnicals. Its golden beams on the oval round of the pretty dome shadow are not black, but something between umber and violet---the marble itself glimming like silver under the dusty velvet of the sky.

In short the subtle and alluring art of the Maqbara seems to convey something vital and significant. The building shrouded in white, symbolises some Eastern princess walking in the garden, guarded by silver-bodied maidens, and her nymphian beauty veiled behind the pardah shows modesty and charm which are so characteristic a feature of Indian womanhood.

he finds the pearly dome and the minarets of the Maqbara rising like a fairy palace, erected by the Guenii, as told in the Arabian Nights. In front of him, he shall find a short cistern with the red coloured fishes dancing in the water.

Advancing forward from the entrance gate and walking upon the path paved with smooth stones, surrounded with flower beds of various shapes, he shall find a long shallow cistern stretching from the main building to the entrance gate. Similar cisterns are to be found running in the right, left and back of the mausoleum. The ascent to the Maqbara is with a flight of marble steps set in the central part of the platform. The fine walls of the mausoleum are erected on the platform 72 feet square, which is also the height of the dome (Au. Gazette.). There stand beautiful minarets in the four corners of the platform. Standing in the gallery limit at the tops one would see the whole smoky city stretched before his eyes. There are three marble cisterns glimmering on the verge of the platform and situated in the north eastern and southern side of the tomb and there is a pretty mosque in west of the same. The platform is paved with blackish and red coloured stones. There is another platform just above the first to be reached with two white marble steps and is paved with polished marble stones. Through a opening in the centre with a descent of ten or twelve steps one can enter into the central shrine of the building. Here is the tomb of the Begum, which is usually covered with embroidered cloth. The tomb is surrounded by a pretty screen-work of perforated marble and where one is wonder struck with its carved sprangs, garlands and touches of brilliant and coloured. All round the Maqbara there is a green and flowerity garden with long and short cistern symmetricaly spotted all round. They are full of crystal water and beautifully sparkle in the sun and the moon. The corner spaces of the garden are thickly covered with mango trees, tall cypress and ever-greens.

The Maqbara forming a glorious picture presents many aspects of beauty at different parts of the day. If one visits it in the broad daylight, he will find the exquisite glimpses of its marble structure — of its bouyant cupolers and climbing camprinales, "as light and graceful as of

Moghal models; he founded for India, to quote Arnold again, "What comes nearest to a national style of building." This, though not being the distinctive feature of the whole Moghal architecture may yet be seen in many buildings erected in that glorious Era.

Love of architecture forms one of the most famous feature of the Moghal history. Shah Jahan, who by erecting the world famous Taj Mahal and it is immortalized in the common roll of the ages and has made their architecture a wonder for all time.

The Maqbara of Rabia' Daurani Aurangabad about which we are to speak in the short essay is one of the finest monuments of Moghal glory in the Deccan. It is, as its name illustrates, the mausoleum, and as it is said by lovers of arts much of the beauty and greatness of the Moghal lie hidden in such mausoleums.

It is the tomb of Rabia Daurani, who was the beloved wife of the Great Emperor Aurangzeb, and was bulit by her son, Azam Shah for the memory of his beloved mother. The period of its erection extends from the year 1650 to 1657. The chief architect employed is said to be one named Ataullah, and its expenditure according to Gulam Mustafa, the writer of the Tawariq Nama of Aurangzeb's reign amounts to Rupees 668203. (Aurangabad Gazetteer 1884). It would take more space than can be found in these lines to elucidate the beauty of this remarkable building.

The Maqbara is enclosed within an area, 500 yards long and 300 yard broad (A. G.) and the mausoleum stands just in the centre of the building. The surrounding high walls forming as a compound are crenellated with pointed and arched recesses from out-side.

As one wants to enter in the Maqbara, he finds a ground entrance gate in the centre of the south-sided wall, the high doors of which are covered with a coating of brass plates, decorated with the pictures of birds, flowers and trees. The walls and the ceiling are painted with designs of many coloured flowers still retaining their originality, colour and beauty.

If one standing on the entrance gate, looks towards the mausoleum,

THE MAQBARA OF RABEA DAURANI

BY

SYED NURUL MOHTEDA

II YEAR, OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE.

BEAUTY has always been the delight of man-kind. Ruskin has told us that the perception of beauty is a moral attribute, the interpretation of beauty, which is the work of artist, is likewise moral.

Architecture is one kind of art, it is one form of interpretation of beauty and happily it is one of the earliest arts, so profoundly developed by Eastern nations. Ancient Egypt, China and India are all fomous for their excellence in architecture.....the Pyramids, the caves of Ellora, after many centuries being still the wonders of the world. In the Middle Ages also this artistic impulse did not exhaust itself. The Arabs coming into prominence gave a fresh impulse to art, especially Muslim architecture created a new form named after them "The Arabesque," and left monumental works in Spain, Iraq, Palestine, Turkey and almost in the whole of Islamic Empire. The work of the Arabs influeneed the ancient architecture of the Persians and the Tartars, who had by this time embraced Islam.

The Muslim kings in India have been always lovers of arts, But the Moghal Emperors, being of a Tartaric origin, have surpassed them, all. It was the Great Emperor Akbar, who first started the movement of what can happily be called "Indianisation of Muslim art" and set himself, as sir Edwin Arnold says "To the idea of blending in India conquerers and conquered into people." He employed the Hindu artists and gave them permission to insert the beauty of their architecture in the old conventional, Arabic, Persian and

to show itself at the appropriate moment. He was very modest about his poetry, he knew its true value, and possessed a quite assurance of its future prosperity. He rarely spoke about his poems for he believed that they were but the words of God, not his own, and that he was the medium God had chosen to convey them to mankind, but, at the same time, he fervently hoped that they would be read and appreciated by all manner of people, irrespective of colour or creed.

LELAND J. BERRY.

I have mentioned are without their touch of pathos, for they are both closely identified with human emotion and waywardness.

There still remain his Darmatic Lyrics to be noticed, of which 'Peggy's Wedding' in my opinion stands out from the rest, although, of course, they are all good, written, as they are, in the Manx style of language. I will content myself with a last quotation from 'Peggy's Wedding," :—

" Aw dear ! aw dear ! aw the craythur ! aw poor Peggy
What's the matter with you now ?
Come in ! come in ! the sowl ! : the sowl (the soul)
What is it, Peggy, what ? and where have you left Dan Cowle ?
Is he outside in the street ? well where is he then ?
Did you call at the half-way house ? did he get—aw bless these men!
.....Don' t be foolish Peggy, we' ll have a cup o' tea
Then you' ll tell us.

Why Dan Cowle ! Dan Ballabroo !
A decent man, and well-to-do !
Dan ! Dan Cowle ! dear heart !
And the beautiful ye went away in the cart !
And you' ve tuk and left him ! left Dan !
Left the man !

In nearly all of his poetry Brown breathes the spirit of his country. It is inseparable from his charactar, and from his soul, and no man had a greater soul than Brown. He was beloved by all who were fortunate enough to come into contact with him. His voice was rich and deep, he possessed the most kindly eyes anyone could wish to see, along with a tender, though perhaps, ironical mouth. He loved rambling through the countryside above all things, although he was very fond of such sports as boating and bathing.

He possessed wild spirits and liked plenty of fun at the right time, but beneath his boisterous attitude there was a calm demeanour ever ready

That fronts Cornaa,
A black cloud leaned its breast
Upon the bay.....
Then Richard said—
" This is the place—
" Long years have fled,
" But still I see her face.
" Just where you are she was—yes, just here—
" I had long thought she loved me; but you know the fear—
" Had thought—but now by that sweet word made bolder
" I cannot tell;
" Only her dear head fell
" Upon my shoulder,
" And she looked up into my eyes—and this
" Was our first kiss "

And so he goes on to unfold the tragic story of Mary Quayle, who was betrayed by a gentleman visiting the Isle of Man. Then just a little bit from Bella Gorry to whet your appetite :—

.....Until, one night
Passing among the bents, I heard a cry
As of a child, and heard the murmured song
Where with the mother sought to quiet it—
And this was Bella Gorry. Round her rose
The swelling sand-heaps; it was in September,
A star-lit night. A fence of sods uptorn
Encompassed her; and she had hollowed out
The sand, and made such shelter as she could.
But it was cold and she had bowed her head
Over her babe, herself to sleep inclined—
And still the cry, and still the drowsy croom.

Bella Gorry is truly a beautiful narrative lyric embodying the true passions and thoughts of the Manx people. Neither of the narrative lyrics

And gorse runs riot in Glen Chass—thank God!.....
There is no silence here; the truculent quack
Insists with acrid shrieks my ears to prod,
And if I stop them, fumes; but there's no lack
Of silence still on Carraghyn—thank God !

It would seem that Brown had a hatred of Clifton, or, indeed any part of England, but it is only characteristic of the man that he should with the deep favour and pride of a Manx- man count all else beside his own wee country as naught. And it is only characteristic of him that after returning to the Isle of Man he should turn loving thoughts to Clifton and to other English villages and towns where he spent his time, and that these loving thoughts should be modelled and tenderly formed into exquisite verses.

There is much more that I could say about Brown's poems, and there are very many quotations that I could make for your interest, but I would prefer you to obtain the complete book and read them through at your leisure, it can be obtained from Macmillan & Co. who have branches in Calcutta, Madras and Bombay.

But before I close this little article on Brown and his poems I should like to say a few words about his narrative lyrics 'Mary Quayle : The Curates Story' and secondly 'Bella Gorry: The Pazon's Story.'

Nothing so interesting as these has come my way for a long, long time. The text is built up on so sure a foundation, that in the case of "Bella Gorry' for instance, the glory and sacredness of womanhood is carried to a divine belief on the part of the poet to such an extent that it is consciously communicated to the reader, whilst its lyrical passion is the sounding of divine music. The commencement of 'Mary Quayle, opens in a way that commands the whole-hearted interest of the reader:—

We went to climb Barrule
Wind light, air cool,
But when we reached the crest

purchased my freedom, and I will not lightly part with it.....I must be free—free to do what I like, say what I like, and write what I like within the limitations prescribed by my own sense of what is seemly and fitting. Literature is my calling.....with this in view I need absolute freedom, freedom to go to church, or not to go to church, freedom to commune with local preachers, freedom to smoke a pipe in a Manx public-house ...in short— absolute freedom !'

He had his freedom, and enjoyed it, but not for long. Quite suddenly on the evening of October 29th, 1892, he died whilst addressing the boys of a Manx school on the subject of " The Ideal Clifton," a subject to which, in later years, he had grown very attached.

His poem 'Poets and Poets' is only an attempt to display the great depths of his own heart, and as we read it we are at once aware of the wide range of vision that was his to scan at leisure :

He fishes in the night of deep sea pools,
For him the nets hang long and low;
Cork buoyed and strong ; the silver-gleaming schools
Come with the ebb and flow
Of universal tides. and all the channels glow.
Or, holding with his hand the weighted line
He sounds the langour of the neaps,
Or feels what current of the springing brine
The cord divergent sweeps,
The throb of what great heart disturbs the middle deeps.

In the verses which he has entitled 'Clifton' we see the deep yearning for his Manx home that for ever gnawed at him inwardly whilst he was away, and I think a few lines are worth repetition here :—

I,m here at Clifton, grinding at the mill
My feet for thrice nine barren years have trod;
But there are rocks and waves at Scarlett still,

He spent twentyeight years at Clifton, where he made great friends of many that he met there, both masters and boys. In 1892 his health gave way, and he returned to his native isle where he recovered, to some extent his normal health again. Although he was certainly more happy in the environment of the Manx atmosphere, he confessed frequeutly that he still entertained a warm feeling for the languid beauty and the tranquility of Clifton, and he has left us many verses in proof of this; his Lynton and Clevedon verses make very beautiful reading. It is hard to single out any one poem for notice, but the second verse of 'Lynton to Perlock' is well worth a perusal even if only for the deep fervent tone which the poet has employed:—

Sweet breeze that sett'est summer buds aswaying,
Dear lambs amid the primrose meadows playing
Let me not think!
O floods, upon whose brink
The merry birds are maying
Dream, softly dream! O blessed mother, lead me
Unsevered form thy girdle—lead me! feed me!

Whilst the beautiful simplicity of number one of his Clevedon verses leaves nothing to the imagination, the peace, the loveliness, and the sacredness of a summer day at Hallams, Church is all there.

A grassy field, the lambs, the nibbling sheep,
A blackbird, and a thorn, the April smile
Of broding peace, the gentle airs that wile
The Channel of its moodiness.....
While Joy, with busy fingers, weaves the woof
Of Spring.

There are, as I have said, many of these English verses, all of which should appeal to readers of every type.

In the succeeding years of his retirement Brown demanded peace and freedom, so much so, that when he was offered the Archdeaconry of the Isle of Man in 1894 he refused it. "At some cost," he said, "I have

All that was good and beautiful in the character of the father was inherited by the son. When young Brown was old enough to be put to learning he was taken under the wing of the parish schoolmaster to be trained as a scholar, but it was Brown's father who taught him the elements of Latin, and fired within him that love for beautiful literary style that hall-maked his career throughout. For many years after this Brown's life was almost entirely deviod of incident until, at the age of fifteen, he hnd progressed so well at school that he was sent to King William's College. In 1849 he left King William's College for Oxford, where he was admitted to a servitorship at Christ Church.

This was a tremendous step to Brown. Chirst Church meant a different type of procedure to the College at Castletown. After taking a Double First in 1853, which, he afterwards remarked caused him much mental agony and an amount of bitter mortification, owing to the fact it was considered to act as a bar to his being elected a student he reached the "summit of an Oxford man's ambition" in the following year when he was elected Fellow of Oriel. Shortly after having this distinction conferred upon him he returned to the little village of Castletown in the Island as Vice-principal of King Williams College.

In common with many other poets Brown was passionately devoted to Music; this was an art that he had cultivated from quite a young lad. He admitted once that he know of nothing that gave him more pleasure than a quiet ramble over the Keys after an absence of two or more months.

In 1857 Brown married his cousin Miss Stowell, in Kirk Moughold Church, and for ever afterwards Brown places Kirk Maughold first in his sacred reminscences entitled Epistola ad Dakyns.

Four years after this happy event Brown returned to England and went to Gloucester where he was made headmaster of the Crypt School. He was never happy in this new role at the Gloucester School, and soon he was yearning for his native Island declaring himself as one of "the most patriotic exiles it could boast."

A MANX POET

BY

LELAND J. BERRY

There are few more delightful places to spend a holiday than in the Isle of Man. The Manx folk are most interesting and congenial, and I have spent many happy hours among them. It was here, two and a half years ago, that I first made the acquaintance of T. E. Brown's poetry.

The Isle of Man lies midway between England and Northern Ireland. It is quite small, being only thirty miles in length by about twelve miles in width. By catching a fast boat from that famous English sea-port Liverpool I can be safely deposited in the Isle of Man within three and a half hours.

Douglas is the capital town of the island. It boasts its own parliament, and conducts its affairs in pretty much its own way, although, of course, it is controlled in all higher points by British Authority.

It was in Douglas, in the year 1830, the fifth day of May, that Thomas Edward Brown first saw the light of day, he was the sixth of ten children. His father, the Reverent Robert Brown, was incumbant of St. Matthews Church at the time of which we are speaking, but when young Thomas was two years old he was made Vicar of Kirk Braddan, which lies in the near suburbs of Douglas.

It is not surprising that such a deep foundation of soulfulness was laid to Brown's poetry when we pause to consider the atmosphere and environment in which he was reared. The son of a reverent gentleman, he grew up to be a pure deep-thinking man with a soul ever responsive to all that is beautiful in life.

एकं सद्विप्रा बहुधा वदंति
अग्निं यमं मातरिश्वानमाहः

The individualising instinct of Tulsidas was more keenly alive to the separation and divisions. He was also influenced by Muslim view-point. The result is that he conceived of God as his master, before whom he throws himself down in ecstacy, Love, which kindles and exalts both power and knowledge, is with Tulsidas the sole quality common to God and man, and it is by love that man can reach Him. Bhakti is the only way by which one can attain Him. Tulsidas himself is totally submerged in Bhakti. In a burst of passion he cries out like a child :

करम उपासन ग्यान वेदमत सो सब भाति खरौ
मोहि तो सावन के अन्धहि ज्यो सुफल रंग हरौ

By
B. N. CHOBE.
IV. YEAR.
OS. UN. COLLEGE.

Here is No. 78.

तोहि मांगि मागनो न मांगनो कहायो
सुनि सुभाव सील सुजसु जाचन जन आयो
तू गरीब को निवाज हों गरीब तेरो
बारक कहिये कृपालु तुलसिदास मेरो

To beg from you is no begging. Hearing you much-praised for your generosity, I have come to test you. You raise the poor and I am your poor slave. O kind one, say for once, " Tulsidas is mine. "

TULSIDAS' OUTLOOK ON LIFE

If a poet has nothing new to impart, nothing to teach us, then he, as it were, forfeits his claim on us to be heard as a poet. If he has only dry bits of morals to offer, it were better for him to take orders, or add one more system of philosophy and religion to the existing number. A poet should be gifted with aesthetic qualities, he must be an artist. He is most successful when he combines aesthetics with ethics, the heart with the brain. Tulsidas, as I have tried to show, is a great artist. He also teaches us something, the teaching of a poet and not of a religious leader, he has not a single follower. We have the Sikhs for Guru Nanak, and the Kabirpanthis for Kabir, but no Surdasi for Surdas or Tulsidasi for Tulsidas. It is primarily as a poet that Tulsidas comes to the forefront. But to understand his outlook on life we have to sift out his teachings from his poetic expressions, and this is not an easy task.

We speak of the highest in terms of the best, of knowledge, of power and of love. In India love is again divided into two Mumuksha and Bhakti. When speaking of the Absolute, Brahm, we use the former, which Bhakti is defined as love for God conceived of as a distinct personality from the life of Nature and of Man (सपरानूर किरशवरे). It is this love for the personal God, variously called the Diety, the Providence, Allah, and Ishwar, that constitutes the keynote of the poetry of Tulsidas. He also knew that It is one though the wise have called It by various names:

अग्निर्यथैको भुवनं प्रविष्टो रूपं रूपं प्रतिरूपो बभूवह
ऐकस्तथा सर्वभूतान्तरात्मा रूपं रूपं प्रतिरूपो बहिश्च
कठवल्ली उपनिषद

For want of space I shall give only two extracts, No. 102 and No. 78 (Sahitya-Seva-Sadan, Benares).

हरि तुम बहुत अनुग्रह कीन्हों
साधन – धाम बिबुध – दुर्लभ तनु मोहि कृपा करि दीन्हों
केटिहुं मुख कहि जात न प्रभु के एक एक उपकार
तदपि नाथ कछु और मांगिहों दीजे परम उदार
बिषय – बारी मन – मीन भिन्न नहिं होत कबहुं पल ऐक
तातें सहों बिपति अति दारुन जनमत जोनि अनेक
कृपाडोरि बनसी पद – अंकुस परम प्रेम – मृदु – चारो
एहि बिधि बेधि हरहु मेरो दुख कौतुक राम तिहारो
हैं स्तुति – विदित उपाय सकल सुर केहि केहि दीन निहोरै
तुलसिदास यह जीव मोह – रज जोइ बांध्यो सोइ छोरै

O Hari, you have been very kind to me. You have made me a man. Had I a thousand tongues, I could not praise you adequating for your generosity. Even then I shall ask one boon of you, do grant me, you are very kind. My mind like a fish does in water, takes delight with objects of desire and cannot bear seperation for a moment. I am, therefore suffering intensely, bound in a chain of births and deaths. Of your generosity make a rope and tie it to the couch in your foot. For the bail keep your love. Catch me thus and destroy my sorrow, it would be only exciting to you. Sruti mentions many ways of escape and many gods, but whom shall I worship? O Tulsidas, He, who has tried the mind with the rope of ignorance, will make it loose,

संग अनुज मनुज निकर दनुज-बल-बिभंग-करण
अंग अंग छबि अनंग अगनित मन मोहैं
सुखमा-सुख-सील-अयन नयन निरखि निरखि नील
कुंचित कच कुंडल कल नासिका चित पोहैं

Sakhi let us go to the banks of Saraju where Raghubir is coming. He takes away all the pain and misery of the world. With him comes his brother Lakshaman and a strong muster of forces which has been victorious against the enemy. Every limb of Ram is full of grace of cupid and people lose their heart to look at him. He is the very incarnation of beauty, of peace and of virtue. Look at his eyes, his hair formed in ringlets, and the beautiful rings in his ears and nose. His conversation is full of wit. All are rapt, they cannot move away but look at him with fixed gaze. Tulsidas says that the women who had assembled their did not know themselves, they forgot why they had come, from what place and with what object in view, so rapt were they.

And so on to the end:

अकनि बचनि चातुरी तुरीय पेखि प्रेम मगन
पग न परत इत उत सब चकित तेहि समोहैं
तुलसिदास यह सुधि नहि कोनकी कहां तें आई
कौन काज काके ढिग कौन ठाउं को हैं

We now turn to the Vinaya-patrika. It is a petition in verse as the name implies, to be presented in the court of Ram.

There are two hundred and seventynine songs in all. Of these the first fortytwo are addressed to various gods and godesses, such as Ganesh, the Sun-god, Shiva, Devi, Ganga and Jamna Kashi and Chitracote, Hanuman, Lakshaman, Bharat, and Satrughan, and Sita. The rest are to Ram himself.

Of this book I have only to say that it marks the culmination of the art of Tulsidas. His bhakti too is now firmly fixed. To him every thing has become equal.

नैक बिलोकि धौं रघुबरनि
चारि फल त्रिपुरारि तोको दिये कर नृपघरनि
बाल-भूषण-बसन तनसुंदर रुचिर रजरमनि
परसपर खेलनि अजिर उठ चलनि गिर गिर परनि
झुकनि झाकनि छांह सों किलकनि नटनि हठि लरनि
तोतरि बोलनि बिलोकनि मोहनी मनहरनि

May I view Raghubar. You have been married in a royal family and tripurari has given you four sons. They are very beautiful adorned with dress and ornament. They play together in the court-yard fall down and get up again; they bend, and peep, and cry out and fight together. Their lisping conversation and their beautiful appearance are bewitching.

Then there is No 42.

खेलत चलत करत मग कौतुक विलंवत सरित--सरोवर तीर
तोरत लता सुमन सरसीरुह पियत सुधासम सीतल नीर
बैठत बिमल सिलनि बिटपनि तर पुनि पुनि बरनत छांह समीर
देखत नटत केकि कलगावत मधुप मराल कोकिलाकीर

They play on the road and throw stones into the water. They snap the boughs and drink cold water which is like nectar. They sit under the shadow near the river and breathe the refreshing air. They watch the peacocks dancing and singing, the droming beetle (بھونرا), the swans the cuckoos and the parrats are chirping and talking.

We then go to No. 4 in Uttar-Kand.

राजत रघुबीर धीर मंजन भव--भीर पीर
हरन सकल सरुजतीर निरखहु साखि सोहैं

मानस सलिल सुधा प्रतिपाली
जियइ कि लवण पयोधि मराली
नवरसाल वन विहरन शीला
सोह कि कोकिल विपिन करीला

Ah! delicate dame, you are not fit for the woods; people will revile me on hearing of such a thing. Can the swan that has been nurtured in the ambrosial floods of the Manas lake exist in the salt sea? Gan the koil, that roars with delight through the luxuriant mango grores in a jungle of karil bushes?

Besides the Ram-Charit-Manas Tulsidas is reputed to have composed more than thirty collections of songs and lyrics. We know that the Ram-Charit-Manas was begun in 1575. We also know that he died in 1623. Now supposing that it took him five years to finish the epic he still had forty years at his hands, and he must have been writing and singing all the time, Again we have to guard ourselves against the other extreme, for it is not improbable that another great writer might have published his works under the name of Tulsidas. It is agreed on all hands that the following are his authentic productions :

(1) RamCharit-Manas,
(2) Kavitavali,
(3) Gitavali,
(4) Dohavali, and
(5) Vinaya Patrika.

As we could not get all of these here, we shall here discuss the third and the fifth.

The Gitavali is a collection of songs arranged into seven books as in the case or Rem-charit-Manas. The language used is Brajbhasha. Its main charm lies in its subtle music. Here is a song from Balkand No. 25. (Kashi-Nagri-Pricharini-Sabha).

बुन्द, अघात सहहि गिरि कैसे ॥ खलके बचन संत सह जैसे
सिमिटि सिमिटि जल भरहि तलावा ॥ जिमि सदगुण सज्जन पह आवा
सरिता जल जलनिधिमें जाई ॥ होइ अचल जिमि जिय हरि पाई

Clouds gather. in the sky and thunders roar; but my darling is gone and my soul is in distress, The lightening flashes fitfully amid darkness, like the friendship of the vile, which never lasts. The pouring clouds cleave close to the ground, as sages stoop beneath accumulated lore. The mountain endures the buffetting of storms, as the virtuous bear the abuse of the wicked. The flooded streamlets rush proudly along, like mean men puffed up with a little wealth. The lakes swell gradually and imperceptibly, like as when the quality of goodness developes in a good man; and the rivers flow into the bosom of the ocean, like as the soul that has found Hari, is at rest for ever. (Growse)

Thus the music rolls on. The book ends with a characteristic prayer. The poet asks for eternal unswering Bhakti which is to be a living force, of the same depth and intensity as is met with in love and greed.

मो सम दीन न दान हित तुम समान रघुबीर
अस बिचारि रघुवंशमणि हरहु बिषम भव पीर
कामिहि नारि पियारि जिमि लोभिहि प्रिय जिमि दाम
तिमि रघुबीर निरन्तर प्रिय लागहु मोहि राम

There is no one so poor as I am and no one so gracious to the poor as you. O Raghu-bir: remember this, O glory of the race of Raghu, and rid me of the grievous burden of existence, As a lover loves his mistress and a miser loves his money, so for ever and ever may Ram be beloved by me. — (Growse)

It is to be noted that Tulsidas takes his similies direct from Nature. Only two examples would do.

हंसगमनि तुम नहि बनयोगू
सुनि अपयश मोहि देइहिं लोगू

" Why so angry my queen? " and touched her with his hands. She put away her lord and flashed upon him a furious glance like an angered serpent, with her two wishes for its double tongue, and the boons for fangs. spying out a vulnerable point. Under the influence of fate, says Tulsi, the king took it all as one of love's devices. (Growse).

In the end come the demands

सुनहु प्राणपति भावत जीका ॥ देहु एकबर भरतहि टीका
बार दूसर मांगो कर जोरी ॥ पुरवहु नाथ मनोरथ मोरी
तापस वेष विशेष उदासी ॥ चौदह वर्ष राम बन वासी

"Hear, my beloved, what is the desire of my heart. Grant me for one boon Bharat's installation; and for the second (I beg with clapsed hands, O my Lord, accomplish my desire) may Ram be banished to the woods for fourteen years there to dwell in the pentential garb of a hermit." (Growse) .

One extract more from the Ram-charit-Manas. Sita is lost. Ram and Lakshaman are wandering in the forests, and the rainy season commences.

लक्ष्मण देखहु मोरगण नाचत बारिद पेखि
गृही विरत रत हर्ष जस विष्णु भक्त कहं देखी

See, Lakshaman, how the peacocks dance at the sight of the clouds, either a householder, enamoured of asecticism, who rejoices when he finds a true believer in Vishnu.

Then comes the description containing many figures of speech such as Alliteration, Consonance , Onomatopoeia and so forth,

घन घमंड नभ गर्जत घोरा ॥ प्रिया हीन डरपत मन मोरा
दामिनी दमकि न रहे घन माहीं ॥ खल की प्रीति यथा थिर नाहीं
वर्षहि जलधि भूमि नियराये ॥ यथा नवहि बुध विद्या पाये

stars and collers on his broad breast , across his shoulders a yellow scarf with fringe of gems and pearls , with lotus eyes and bright pendents from his ears and a face the very store - house of beauty , lovely brows and charming nose and on his forehead a most bewitching (tilak) while gloriously with knotted pearls and gems. — (Growse)

Now I go to my favourite piece in Ajodhia kand. Ram is married, and his father is going to make him Yuvaraj. Bhart is removed from the way, being sent away to his maternal-grandmother. His mother Kaikayi is kept in total ignorance, but she learns it afterwards through her maid Manthara. she goes to the kop-bhavan, angrily throwing away her robe and dressing herself in rags. And now comes Dasratha. The whole plot turns upon this one scene.

समय नरेश प्रियापंह गयऊ ॥ देखि दशा दुख दारुण भयऊ
भूमि शयन पट पोट पुराना ॥ दिये डारि तनु भूषण नाना
कुमतिहि कस कुबेषता फावी ॥ अन अहिवात सूच जनु भावी
जाय निकट नृप कहमृदुवानी ॥ प्राण प्रिया केहि हेतु रिसानी

Anxiously the king aproached his beloved and was terr ibly distressed to see her condition, lying on the ground in old and coarse attire with all her adornments cast away: her wretched appearance according with her wratched design, as if in morning for her instant widowhood. The king drew near and asked in gentle tones: "Why are you angry my heart's delight?" Growse.

The poet then brings in a simile. Kaikayi is likened unto a serpent with fangs and poison ready to attack an animal.

केहि हेतु रानिरिसानी परसत पानि पतिहि निवारइ
मानहुं सरोष भुजंग भामिनि विषम भांति निहारई
दाउ बासना रसना, दशन बर मर्म ठाहर देखई
तुलसी नृपति भवतव्यतावश कामकौतुक लेखई

Vedas and Puranas and celebrated throughout the world still it is not so dear to me as the city of Avadh: only here and there one can be found to comprehend this saying. Here is the delightful city, my birth-place, and to the north the sacred Sarju. The dwellers here are very dear to me; the city makes them my fellow-citizens both here and hereafter and is alotogether blessed,,

[*F. S. Growse*]

TULSIDAS AS AN ARTIST

Tulsidas wrote an epich which was his first production in the field of literature, but later in his life, he gave us quite a large number of collections of lyrical songs. The loftiness of his purpose I have already indicated. Now I shall take a few examples to prove his mastry of the language, which is a form of poetic art.

Srangar-nas is dominant in Tulsidas. I shall first, therefore give a pen-portrait of Ram when he is just to be married.

श्याम शरीर स्वभाव सुहावन ॥ शोभा कोटि मनोज लजावन
यावक युत पद कमल सुहाये ॥ मुनि मन मधुप रहन जंह लाये
पीत पुनीत मनोहर धोती ॥ हरत बालरवि दामिनि जोती
रूलकिंकिंन कटिसूत्र मनोहर ॥ बाहु विशाल बिभूशण सोहर
पीत जनेऊ महा छबि देई ॥ कर मुद्रिका चोर चित लेई
सोहत ब्याह साज सब साजे ॥ उर आयत सब भूषण राजे
पीत उपरना कांखा सोती ॥ दुहुं आचरन्ह लगे मणि मोति
नयनकमल कलकुंडल काना ॥ बदन सकल सौंदर्य्य निधाना
सुंदर भ्रकुटि मनोहर नासा ॥ भाल तिलक शुचि रुचिर निवासा
सोहत मौर मनोहर माथे ॥ मंगलमय मुक्ता मणि गाथे

" Dark in hue and full of untaught grace, his beauty put to shame a myriad loves, his lac-stained feet gleamed like some lotus, the haunt of bee-like saintly souls, his pure and lustrous yellow robe outshone the rising sun or lightning-flash; and the little bells on his waist belt made delicious tinkling ; long were his arms and clapsed with glittering bangles ; his yellowjaneo set him off to perfection ; his signet ring would ravish all heart; lustrous were all his many wedding adornments and the

For the sources of the book the poet himself has mentioned as follows:

नानापुराणनिगमागमसम्मतंयद्रामायणे निगदितं क्वचिदन्यतोपि
स्वान्तः सुखाय तुलसी रघुनाथगाथा भाषानिबन्धमतिमंजुलमातनोति

They consist of the Vedas, the Puranas, the Upa-puranas, the Ramayana of Valmika, the Bhushundi Ramayana, and a drama Prasanna Raghav by Jayadev. The subject is indicated thus:-

करन चहौं रघुपति गुनगाहा

The Ram-charit Manas has gained immense popularity which is due partly to the fact that Ram is revered as a hero by almost all the Indians, and partly, as I consider it, to the author's efforts for a sort of constructive unity between the Indian races. Vedic pantheism, Islamic monotheism and Christian bhakti are all happily blended together. He would have us go back to the treasures of the past and not waste the time away in creating jealousies and dissenssions. Speaking of the return of Ram, he says:-

वरनाश्रम निज निज धरम निरत वेद पथ लोग
चलहिं सदा पावहिं सुखहि नहिं भय सोक न रोग

The folowing was an advice of Tulsidas as he lay dying at Benares:-

मम ग्रंथ वेद मरयादि
तिनहि सुनहु सफुहु सरुचि चलहु ग्रंथ अनुसार

Patriotism is not wanting in him. Only he could sing the following:-

यद्यपि सब वैकुंठ बखाना — वेद पुरान विदित जगजाना
अवध सरिस मोहि प्रिय न सोऊ — यह प्रसंग जाने कोऊ कोऊ
जनमभूमि मम पुरि सुहावनि — उत्तर दिशि सरयू बह पावनि
अति प्रिय मोहि इहां के बासी — मम धामदा पुरी सुखरासी

"This city is so holy and the country is so charming, that although all men speak of Vaikuntha, which is indeed famous in the

It was in this atmosphere, when the sprit of union was abroad, that Tulsidas was born. We now directly come to his poetry, which is the main point of our consideration.

III. TULSIDAS AND HIS POETRY.

The first in point of time and also the first in popularity is the Ramcharit-Manas. It was composed partly at Ajodhia and partly in Benares, It was begun as the legend goes:

सुखद रामनौमी जब आई चैतमास अति आनंद पाई
संवत सोरहसै इकतीसा सादर सुमिरि भानुकुलईसा
वासर भौम सुखित चितचावन किय अरंभ तुलसी रामायन
बालकांड तंह पूरन करिकै अये मुनि काशी सुखभरिकै

The Ramcharit-Manas is in seven volumes. Bal-kand the first volume of the series end with the marriage of Ram to Sita and in the opening of the Ajodhia-kand, the second volume, Ram is to be made Yuvaraja, and in the end of the book we find him wandering as an exile. Bharat fails in his attempt to persuade Ram to return home and the third book ushers us into a forest where Sita is carried away by Ravana. In the fourth volume Kishkindha-kand Ram and Lakshaman find out the dwelling of Sugreev, who gives them much assistance in recovering Sita. In the Sunder Kand 5th. volume, Hanuman finds out Sita and delivers her his husband's message and then returns. A bridge is built in the opening passages to cross over to Lanka in the book named after the country as Lanka-kand, the sixth volume. The fight ensues, Ravena and his family are defeated and killed, and Bibhishan becomes king. Ram then returns home, In the Uttar Kand the last volume he comes back with his wife and brother, and is crowned king of Ajodhia.

The whole Ram-charit-Manas contains five thousand and one hundred choupais (i. e. four rhymed lines), besides a large number of Dohas and Sorathas and Chands. The language of the Ram-charit is the Baiswari dialect, but the eclecticism of the poet brings in many words not only of other dialects but also of Arabic and Persian languages.

observes, into the heart of India. Its effect was not unfelt in the Deccan. It was in the Deccan that Shankara-Chariya flourished (b 788, d 850) who went back to the vedas for religious guidance. The religion of Buddha had been accepted for mundane consideration and as the Mauriya dynasty came to an end, the people reverted to their old faith. Those who remained in its fold became corrupted and embraced Islam or the Sanatan Dharama in the eighth and the ninth centuries. Alberuni's account of India* clearly shows that the Buddhists were spread here and there few and far between. Islam it was that introduced Monotheism into India, and it became in time a part of Indian thought with the result that it was universally taught in sermons, and allegories. Some of the best allegories are still known to us as the puranas which were composed at this time.

In the first decade of the thirteenth century Qutubuddin Aibak founded the Sultanate of Delhi. From this time however great reformers began to rise and great bards came forth to teach and preach the unity between the two great races of India. Ramanuj and Ramanand, Nanak and Chaitanya, on the one hand, and Kabir and Malik Mohammad on the other, tried to weild the Hindus and the Muslims into one nation. Among the poets who contributed to this movement some important ones may be mentioned, Malik Mohammad who composed the padmavat in 947 A. H. (when Sher Shah was on the throne), Sur, Mirabai and Abdur Rahim Khan-Khanan.

---

*The mention of Alberuni's India leads me on to speak of another incident. Ferishta says, and all the modern historians repeat after him, that when Mahmud of Ghazni broke the idol of Somnath, he found within it a treasure much exceeding his anticipations. Making of hollow idols was never allowed by those who worship them. I discussed the point with pandit Shastri and was confirmed in my thoughts. Lately I read an article in the Madhuri, Vol: I. No. 6 by Mr Gorishanker Hirachand Ojha. Then I read the account of the idol in Alberuni's India (trans: by Dr. E. C. Sachau) Vol: II. ch. LVIII page 103–105. Alberuni was a contemporary of Mahmud, he himself saw the pieces of the idol which had been carreid away to Ghazni and I think his account to be more trustworthy. The great historian Ibnul Athir Aljazari says that the idol was five cubits in height and three in girth and must have been two cubits hidden in the basement. It had no appearance of having been sculptured. (Eliott and Dawson Vol: II. pages 469-471).

On his arrival at Ajodhia he was inspired to sing the praise of it's famous warrior, king Ram, and his wife Sita. The Ram-charit-Manas was however begun, we are told, on Monday, the ninth day of the month of Chaitra of 1631 (the spring, 1675 A. C.) and soon after the first of the seven books of the Ram-Charit-Manas was finished at the same capital. It cannot be ascertained how Tulsidas spent his later years. We know that when he lay dying, his disciples gathered round his humble bed and wished his last advice, to which he answered:-

मम ग्रंथ वेदमरयादि
राम यण गीतावली विनयपत्रिका आदि
तिनहि सुनइ समुझहु परुचि चलहु ग्रंथ अनुसार
अंत समय हठि मिलहिंगे दशरथराज कुमार

(2) The Zeit-Geist.

It would be pertinent here to give a short summary of the various currents and cross-current of Indian religions and philosophies running high at that time, but we shall confine ourselves to mentioning only those which have any bearing on the moulding of our poet's mind.

The vedic pantheism was superseded by the teachings of Gautama Buddha, but they became corrupted in course of time. Royal patronage soon brought their end, since we know that a large number of people adopted the Divine monotheism of Akbar the Great on grounds of personal gain and distinction, and it is not improbable that history might have repeated itself before in the days of Asoka the pious.

In the eighth century of the Christian era the Arabs came into contact with India. Mohammad Bin Qasim annexed Sindh and was fairly on the way of reducing the whole of the northern plains to Muslim arms. But he failed on account of his sudden removal. Walid I was succeeded by Sulaiman in the Caliphate and he reversed the policy of his predecessor, recalled Mohammad who was then cruelly put to death. It was not as conquerers, but as traders and bands of mercinary troops that the Muslims penetrated, as Col: Tod

TULSIDAS

I. LIFE

It was at the banks of the Ganges more than three hundred years ago that one of the greatest poets of Hindi literature departed form the world. To most of us he is the Poet in a special sense. Not a few regard him as a great saint, and these would think it blasphemous to point out any weakness in the sage-poet, yet it is much to be regreted that with all our love we have failed in our duty towards him. His life, the circumstances of his writing, his trials and his victories remain almost unrecorded. I shall here make a brief survey of his life because without the knowledge of a few biographical facts one is at a loss to appreciate his writings.

Priyadas, in his edition of the Bhakt-mala of Nabhaji published in 1714, appended an account of Tulsidas, but it would not stand the light of modern criticism. Until something to the contrary comes to light, two points in my opinion are specially important in this book. Firstly that Tulsidas died as the song is :-

संवत सोरहसै असी असी रुन के तीर
श्रवण शुक्ला सप्तमी तुलसी तज्यो शरीर

This comes to 1623 or 1624. Secondly Priyadas gives him the credit of vast learning :-

पंडित सकल शास्त्र विशाला
विद्यामें विश्राम अघाना

Tulsidas was a high-caste Brahmin. He was a worshiper of vishnu, but he was no sectarian. Little is known of his early life except that he was married at a very early age. After his seperation from his wife in his fortieth year—whether she died or he himself left her as the legend goes, is yet to be settled — Tulsidas devoted himself to study. He was also very fond of travel and seems to have visited all the sacred places in the fertile Doab.

therefore incumbent on you to strive to rise to the highest standard, and for each future generation to do its utmost to raise that standard higher still? You must never forget that the real work of citizenship consists in each man contributing to the community and to the State the best that is in him. However humble his contribution may be, it must be the work of capable hands guided by a capable and generous mind. And a University is under an obligation both on account of its professed aims and of its facilities to produce and supply to the State capable minds to guide and capable hands to work. And this in future will be the test of the gratitude and loyaldy of the Osmania University to the Ruler and the State by whose great munificence and continued support it has been started on its useful career.

While congratulating those of you who have achieved some distinction in your academical career so far, I may be permitted to express the hope that most if not all of you will furnish the type of highly cultured, noble-minded, pure-hearted, strong and capable man that I have in mind.

Last of all a word of warning against communal dissension. Reluctant to waste words on the obvious, I will only say that none but ignorant and mischievous and foolish men fight over religious differences. Hyderabad has always been free from this vice and, will, I hope, remain free for ever. But it is for you students to keep watch and ward at the gateway of the future.

we ought to take it. I advise you, exhort you, entreat you all to give serious thought to this, and to equip yourselves in time for the so called battle of life in which you have tos trive with deeds and not with words — with your hands and not with your tongues. Change your point of view and regard degrees only as a preparation for doing the practical work of life, and let not your minds be ashamed, because of a little acquired learning, to do that important and necessary work which can only be done by the hand under the judicious direction of a well-trained intellect. It is a matter for congratulation that our Government has at last felt it to be its duty to provide the means of imparting suitable technical instruction to its subjects, and I look forward to the happy day when the Osmania University will join hands with the new Institution and work with it in a truly sisterly spirit.

Politics

I cannot end this address without saying a few words to warn you of the danger of being drawn into the crazy politics of these unsettled times. Whether rightly or wrongly understood, politics have a strong attraction for the human mind ; but they are a dangerous subject for immature or untrained minds to dabble in, being apt to throw them off their balance. Good minds, remember, will make good politics and bad minds will make bad politics ; the history of the world has proved, and is proving this. I would therefore advise students, who are concerned with higher things, not to allow their minds to be distracted by politics while they are pursuing their studies, except in order to study politics as a science the foundation of which rests on ethics. It was a wise forethought of Aristotle to indicate the inter relation between the two and to make his treatise on ethics 'an introduction to his politics'. If politics are to be for the good of a human polity, it is essential that the human beings forming a polity should be made good first; and this can only be done by sound ethics. Whenever we lose sight of this important fact we go astray; and this too is amply proved by the world's history.

By way of summing up all that I have been saying, I must remind you that a University is a factory for turning out good, capable and useful citizens. It produces these and by doing so sets up a high standard of quality. Is it not

would gain by studying and taking to heart all that is best in your inheritance from the past, and what you would lose by neglecting it. I do not for a moment suggest that you should treat lightly the best that comes from the west. No, you should, on the contrary, prize it as a most valuable gift which will be useful in training your faculties to appreciate more readily what is your own, and which will, moreover, make you more efficient as workers under modern condition.

Technical Training

I now come to the important subject of technical education. And I wish to remind you that there are different kinds of work appropriate for the mind and for the hands, and that man in this life has to busy himself with both. While your mind labours to achieve the highest reach of thought let your hands be busy making useful things to make life more comfortable and to adorn it in its external aspect. In this lies the secret of a people's greatness, and this is how the nations of the west have made themselves wealthy and powerful and succeeded in theend in making their wealth and power the means of ruling the world. They have learned this art in the University of the world and it is for academical Universities to consider and examine and discuss this fact in all its practical bearings so as to attract the minds of their pupils to this central fact of modern life Universities are no longer regarded by the progressive world as seed-beds for the cultivation of empty words, or for growing degrees for show! A degree signifies, or is supposed to signify, some kind of efficiency, and efficiency means fitness for work in the practical affairs of life. It follows frem this that a degree-holder should be able to but his hand to some kind of practical work in this world of work both in order to earn a competence and to make himself a useful member of his community. But the majority of Indian degree-holders do not sufficiently realise this. They consider their Hallmark sufficient for claiming high places and privileges in the economy of life, and their vision is confined to Government service. And what is the result? The machine of life goes on and leaves them behind—a soured and discontented body. The warning given by British India is before our eyes, and if we have any power of judgment and discernment left

Oriental Studies

Now I wish to invite your attention to the importance of oriental studies side by side with other studies. It will be sometime before our University will be able to compete with older Universities on their grounds, but it can safely compete with and surpass them on its own grounds within very short period if it chooses.

It has long been a dream of mine that Hyderabad might in course of time be one of the chief seats of oriental learning—especially so far as the treasures of Arabic and Persian literature are concerned. They may be said to be our heritage, for we are the only representatives in India of those civilizations and of that culture of which they were the efflorescence. It is not too much to hope that, living in a calmer political atmosphere than that of any other oriental country which has inherited the same traditions from the greatness of the past, we may be able to achieve something in this direction if the Osmania University undertakes the task. It would be a great service since all the greatness that is enshrined in oriental literature is by no means a spent force if the memory of it can be revived by us so as to become a source of inspiration to us in our present life which will shape our future. You are to remember that though suggestion and guidance, and even effectual direction, may come from the study of foreign literature and foreign institutions and foreign methods, yet real inspiration which can stir the heart and energize the soul of a people comes only from dwelling on all that was best and vital in the history of one's own race or nation. We have done great deeds in the world and our history is writ large on the face of three continents. From a very small beginning which consisted of a few words spoken by one man we were able to gain within a few short years an empire that extended from India to Spain, as wide in extent, and not less well-governed, than the Roman Empire under Augustus. And the strange thing is that our Empire as contrasted with that of Rome represented a civilization and culture which is now independent of territorial bounds, for it has created a new world of thought and feeling and mode of life. I just remind you of this in order to enable both Hindu and uslim students to realise what you

world and a new civilization burst forth amidst his squalid surroundings and burnt up all the impurities of a nation and made it great in less than half of a life-time ! This is the way in which a superior man excels his fellow-beings and not by wasting the energies of his soul in the pursuit of worldly advantages. Make your education show you the right path and not mislead you !

Moving with the Times.

All this perhaps sounds a little too dreamy and unpractical to some of you, who think " but we must move with the times ". Yes, but you have to see where the times will lead you if you follow them like sheep. Times are man-made, and not necessarily God-made. Since man has a hand in their making there is much in them that is bad, and much that is unnecessary for the higher needs of man. We must not, therefore, accept the infallibility of the times as an article of faith. Man, we know, feels wound up at times by some irresistible force and goes blundering on, doing much that is foolish and bad, and a little that is useful and good. Out of all this shapeless mass of jumbled facts and events we have to extract the principle of moral life. If man can make the times bad he also has the power to make them good, and this is what we want you to aim at doing when it comes to your turn. Can you mention the name of any one of those who have contributed the best thoughts and feelings to the world's store who moved entirely or blindly with the times ? I cannot think of a single great man who was swept off his feet and carried along by thc tide. If such had been his fate he would not have been great. Every one of the great men of the world still stands in his high place above the nosiy tide of tumultuous human activities to throw his light upon the dark places of life, and this is because he was not swept away by the tide.

In civilized life the direction must always come from the highest in man , and this is possible only when it comes from the highest and best type of mind, which it is, or should be, the chief aim of education to produce.

ever retain their place in the heart of man and continue to impel him to high endeavour. And all sound education has to recognize this fact and avail itself of the help of these allies if it wishes to prevent moral degeneration.

Education and the Desire to Excel.

I must not forget another aspect of education. It is only natural that education should excite in the mind a desire to excel. But how and in what to excel our fellow beings is a question to which little serious thought is given by us. We are never free from the desire to excel our fellow-beings in some, if not in all, things. But we find that this desire is confined in most cases to the possession of certain worldly advantages, which obsess the mind, such as rank, office, position, wealth, etc; it is not concerned as a rule with moral or intellectual superiority. Now let us consider whether it is always in our power to gain worldly advantages and become wealthy? This depends upon circumstances, and to a great extent upon the help and co-operation of others, which we cannot always beg or command. Would it not be far better, therefore, if we aimed at those conditions alone which it is entirely in our power to attain? Could we not by strengthening our moral nature attain power and reach a height of excellence that might give us a better and more lasting title to eminence? What is there to prevent the poorest man among us from being honest, sincere, truthful, just, unselfish, brave and strong so as to help his community and his country by means of these qualities? And why should we not, like many great men before us, scorn the wordly advantages aimed at by vain and petty-minded people and steadfastly continue to foster and strengthen the good and great qualities of the soul which alone can make us strong? Look at the founders of religions and philosophies and ask your own heart whether rank and office and wealth had made them great. Our prophet was called 'the Trusted' long before he came before the world's eyes with his mission. Why? Because truth and sincerity and fidelity were in him. These were bright lights shining through his mean garments. It was by these qualities that GOD made him excel all his contemporaries, and it was by their means that the light which was to create a new

flow a great many evils of the modern times. Such reflecticns lead one to think that the best education is that which not only trains our faculties, but guides our feelings aright. We have a light within us and we have besides, the gathered wisdom of ages to show us the way; but it is for education to trim that light and keep it steadily burning so that we may be able to utilize fully all the wisdom of the past. The whole problem of life, and therefore of education, is this: how to live a clean, healthy, simple and efficient life of useful work? It is a remarkable fact that the greatest and best men the world has produced acted more in accordance with what they felt than with what they thought, for thought in them was always subservient to some great good generous impulse. We have to reach this stage through education. We need not therefore trouble ourselves with the complicated machinery of thought erected by our modern civilization. We have only to try and get back to purer impulses under the guidance of proper education.

Having said so much about the moral purpose of education, I must tell you what I think of the connection that I believe to subsist between education and man's sense of religion and that peculiar sense to which the name chivalry has been given.

I have no hesitation in saying that education worthy of the name regards these as true friends. It seeks their aid to purify itself, and lends its aid to them to clear all misunderstanding. All that is best in human nature comes under the influence of these two allied sets of sentiments, ideas and feelings, termed, respectively religion and chivalry, A refined and ennobling instinct of reverence runs through them and developes into virtue in action; for both are concerned with high sentiment animated by faith and embodied into practice. They vitalise morality, and give noble aspirations to it , together with a marvellous capacity for heroic self-sacrifice. Though they may be regarded as institutions in their external aspect, and have been treated as such, their source lies deep within the heart of man. They are the best guiding principles of human conduct even now, and as such we cannot safely dispense with them. Their forms may change with the times, but their essence cannot change. They must

his ambitions and his conquests, not as facts in themselves to be proud of, but as facts which in their turn helped him to a nobler vision of life. Man has learned from experience, and history teaches you what his experience has been, and it will enable each new generation to avoid the errors of its predecessors and to emulate and to improve upon their good and great deeds.

Science

Do not neglect science. In its original signification it means knowing. and it is man's privilage and pride to know, And surely it is the highest function of the mind to know reality. Science helps us in this; and to use the words of Milton, it justifies the ways of God to man. Thus science leads to, and not away from God. To see how things are is to know how they are working and how they were made. When you get to know this you cannot possibly believe that they must have made themselves. Evolution is all very well in its own place, but within and above and around and beyond evolution is the Power that made evolution be! Thus science brings you by a very interesting path and through a varied landscape of beauty and mystery and wonder back to God.

With apologies for this digression I return to the subject of education. Now I must tell you where, I think, our modern system of education generally fails. Little attention is paid under it to the proper 'finishing' of each individual soul, if I may so express it. It does not seem to train the mind to distinguish between permanent and temporary values – between essential and accidental needs. How many of us after taking high accademical degrees are really better off in respect of unselfish purity of mind, truth sincerity, sympathy, generosity, temperance, moral courage, sense of honour and true self-respect, than the so-called ignorant masses? It is a saddening reflection, but true. The older schools at least tried to keep certain sentiments always uppermost in the mind—those relating to God and the responsiblity of the human soul. These have been eliminated from our modern system which tends to deprive us of all ennobling sentiment and even of reverence for what is higher than ourselves. And from this

I do not minimise the importance of books, nor do I forget that University life is primarily associated with books and gives you the best opportunity of making friends with books. But I certainly advise you to be discriminate in your reading; for there are good books and bad books, as there are good friends and bad friends. The practical test is this: Good books are those which give you good thoughts and help to make you good. When you read a book do not forget to measure its merits by this standard. And also bear this constantly in mind that one of the disadvantages of reading books is that one gets into the habit of thinking other people's thoughts and the end comes to believe them to be one's own! Be on your guard against this. It is desirable that an attempt should be made to label all such acquired knowledge with its proper title, and to retain that label in the memory. And you ought to keep wide awake while reading and to think out the thoughts suggested by what you read and then to use your own judgement and to make your own conclusions and thus try to reach and understand the truth by your own effort. Besides this you ought to go to the very object themselves—to nature within and without— for gaining a proper understanding of what you have read and for verifying the truth you have found. Reading should reinforce the power of thinking, not supersede it.

While on the subject of books, I should like to add a few remarks to what I have already said. I would particularly advise you to read history. History is a most important branch of knowledge, because it is a record of man's work on this earth. The instincts of his nature have compelled man not to be idle but to do some work, and he has been doing it well or ill through a long series of centuries. He has gone blundering on, misled sometimes by his evil instincts and his passions, but he has found truth and beauty and goodness in his path which his good instincts have enabled him to recognize. And here has from that moment been a constant struggle in him between two opposite tendencies and he has been drawn this way and that, but thanks to this perpetual struggle he has been able to achieve something of permanent value in this world. This is the lesson History teaches us, and the collective history of the world is only man's autobiography on earth. What you have to do when reading history is to dive to the heart of man's work through the heaps of rubbish of trivial facts that often hide it; and you have to consider his errors and his follies,

us to avoid the error commit ed by others? If we do not, I am afraid, our schools and colleges and universities will only be expensive factories for the production of inferior articles made in imitation of foreign goods and help to create an atmo phere of dissatisfaction and unrest as is happening elsewhere. Personally I am one of the greatest admirers of all that is best in western culture, — having belonged to one of the old English Universities — but I cannot persuade myself to believe yet that what our Indian institutions are actually imparting to the human mind is that culture at its best.

The word culture' reminds me that we talk so much about it and yet do solittle to acquire it. The word has unfortunately become synonymous with wide reading and extensive knowledge. Merely storing the mind with fact ancient and modern may serve to make a museum or an Encyclopedia of it, but it does not necessarily impart to it that fine quality which is implied by culture, that quality which makes it responsive to the suggestions of goodness, beauty and grandeur in nature and in human action. True culture does this and makes the mind a sensitive instrument highly susceptible of fine emotion.

The powers of truth, beauty and goodness are always in us and arround us, and we can makeo urselves happy by being in constant touch with them, and this true culture enables us to do. But often in our pursuit of more tangible worldly benefits as the only reward of education, we forget this important truth. To make our lives beautiful and good and true is an imperative demand of our higher nature. It is, in fact, a law of our nature and true education therefore, has to create for us an atmosphere from which our higher instincts may receive light and nourishment and be freed from the parasites of selfishness and greed and all the evils flowing from them. The noblest aim of education remember, is culture in the best sense; and nature is the great teacher, not books. Books can only record nature's work, and the best of them do it in a way to lead us into the very presence of nature. When books have done this service to us aud we feel a thrill in our hearts when face to face with anything that is good and beautiful and harmonious, or grand and sublime in nature or in man's work, then only can it be said that we have derived culture from education.

I hope the time is fast approaching when our hopes will be realised and we shall see many good residential colleges under the wings of our University which will become a Residential University. This, I think, will be the saving of our young men — which means of future generations. Experience shows that the social conditions prevailing in Hyderabad are largely responsible for the breakdown of our young men at the most critical period of life. Boys up to a certain age – say 14 – show great diligence and much interest in their work, and seem full of promise, but a year or two after this age there is a decided falling off. They find many things to distract their attention from their books, they find evil companions and shun good company, and thus their minds are not only diverted from work to pleasure, but become depraved. This happens because their home-life has no attractions for them, there is no society for them there, their parents seem too far above and their younger brothers and sister too far below. This uncomfortable feeling of not fitting into the home circle inclines them to seek society outside the house, and there they find their ruin.

As it is of the utmost importance to save our youths in order to make them good and useful citizens, so surely, it is our duty to provide proper conditions and environments for gaining this object.

I hope to see the Osmania University taking the foremost part in this great work of redemption when it has become a residential University and foster-mother of many boarding schools and colleges.

Now I must tell you, at some length what my own idea of education is.

Education and Culture

I take education to mean man's spiritual progress and refinement through acquired knowledge.

Viewed in this light, education is the most serious of all our life problems, and we have to solve it here for ourselves as best we can. Why is it that after centuries of useful progress the West is beginning to realise its spiritual deficiencies now? Can we not take a warning from this and adopt such methods in our system of education here as may help

has been refined so as to move constantly in the direction of the noblest ideals of life or whether your superficially acquired knowledge has fostered in you the ignoble desire to utilize it merely for mercenary ends. I need not tell you that the man who acquires learning only in order to be able to sell it for a high price is not one of the noblest products of nature or of a University either. The best type of educated man is he who holds his knowledge and capacity and trust for the benefit of his kind, and uses them for himself as a guide to the right path, whatever may be his station in life, and whether he may be rich or poor.

Duty

Do not forget that the post of duty is the real post of honour, and that the educated man can perform his duty wherever he may be placed. Duty means doing what is due from us to others and to our own conscience. The different relations of life place us in different situations, some called high, other low; but the post of duty remains fixed by its direct connection with our conscience. We have to train the mind to recognize its duty and to accept it as the only post of honour within its reach. To do the best we can according to our lights, even at the risk of sacrificing our wordly interests, and have the consciousness of not falling far short of one's own standard of uprightness and integrity in the performance of work that we have to do in life, whether allotted to us or self imposed whether in itself high or low, is to have a proper sense of duty, which gratified, must induce a feeling of satisfaction with one self for having acted in an honourable way. The educated man, more than any other, realises that duty and honour are thus inseparably connected in their innermost relations.

A few words would not be out of place here, regarding the need of a residential University for the purpose of creating the right kind of atmosphere.

It is an accepted fact that proper education can only be imparted under certain favourable conditions; hence the usefulness of boarding schools, and of residential Universities.

There is no fear, I assure you, of my getting into the academical mood and talking learnedly that is one of the things I do not love. My desire is always to get to the heart of things in order to discover their beauty or utility and the real purpose of their being, and this has made me give thought to some of the higher concerns of life and to reach certain convictions which I will now place before you. Though I have never been associated with the actual machinery of education, I have been thinking for many years of the real purpose of education and its relation to the mind and to the needs of man.

To get to the point straight — let us put the question in this plain fashion :

> " What is the use of education to man, and
> What is the use of Universities ? "

I shall take the second question first:

What is a University and what purpose does it serve?

We need not attempt a definition in answer to this so long as we have a proper understanding of the subject. Let us say that a University is an association of young minds for the purpose of acquiring such knowledge as may on the one hand enable them to become efficient workers in the business of life, and on the other lead them on to high standards of truth and goodness which together constitute moral beauty in conduct. For this is the essential condition underlying the whole superstructure of knowledge. We know that young minds living and working together under the guidance of maturer minds in a calm atmosphere of high thought and refined feelings will, presumably be better equipped for the varied functions of life than those to whom such opportunities are denied. In this lies the justification of a University. You have to bear this in mind, not only while you are working in your University, but also when you proceed from it to work in the larger University of the world. For you will be expected there to show at every turn what stuff you are made of -- whether the purer metal of wholesome knowledge predominates in your mental composition or the alloy of adventitious learning — whether your nature

CONVOCATION ADDRESS

BY

NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR, Kt.,

C.I.E., O.B.E., M.A., LL.B. (CANTAB)

MR. CHANCELLOR, MEMBERS OF THE

SENATE, GRADUATES AND GENTLEMEN,

WHEN I was informed about a month ago that it was the desire of the Chancellor that I should deliver the Convocation Address this year, I hesitated at first to undertake such a heavy task to which I felt unequal. But on reconsideration the sense of duty prevailed, and though I was not, qualified to deliver a grand address – never having suffered from the ambiton of an Orator – yet I thought I might be able to tell you some of the thoughts I have been thinking and some of the truths I have been feeling in my course through life from my student days right up till now. As those truths have been like lights to guide me on my path, it is possible that they may be of some help to young men whose minds have not yet become indifferent and callous by actual contact with some of the ugly realities of life. You students of the Osmania University are still in a position, I hope, to regard life as a noble enterprise which you will make more glorius by your own efforts. This is the spirit in which you should work, and I have come only to remind you of it. I will not lecture you but talk to you in plain language of what my be of some interest and some benefit to you now and in future.

They are a living source of all secrets. All strange and fresh news, political and social, owes its publication to them. None but the sane persons alone believe me, for it is said; *Omina bona bonis* when I shall state the fact that they are very honest, polite and sober. In order to encourage virtue among them they severely condemn their fellow - brethren who are seen railing and rolling in the taverns. They are sure to lend a helping hand to a passenger just stepping into it to sit down, but change into a living. Nemesis as soon as he gets down, being a slight careless to the distance or time agreed upon before starting.

These are some of the interesting features of the character of a Jhatkawala.

An opponent of mine pronounced the theme of a Jhatka to be most worthless for writing an essay upon; but by the bye gave a philological origin of the word Jhatka. His explanation was; " Jhatka is called by that name because it gives unceasingly 'Jhatkas' or jerks to the persens seated within." After requesting the readers, who kindly dove in my Jhatka for such a long time, to condemn unanimously a dangerous practice that is gaining strength among the Jhatka - owners, I beg to stop. It is this that the moment a Jhatka grows extremely old and becomes out of use, they never try to construct a new Jhatka out of it but manage to make it a tonga instead. The future consequences of such original production my readers are sure to imagine

BY

R. M. Joshi

(Old Boy)

his full burden fell on the jhatka the forepart of it with the horse and all was lifted up . The whole would have been completely topysturvied but for the substantial prop of the foot - iron which by the good - luck of the horse was strong enough to resist the weight . As to the bottom of this wooden room , it is said that the chinks between the planks have tried to deal a death blow at the careless and idle Indian habit of taking out shoes from the feet by allowing them to leak out . The warm and serene rays of the sun and the cool and mild showers of the rain are seen clearing their way through the top . The artistic bending of colours that is revealed by the jhatka is by itself sufficient to stand out in the estimation of a thoughtful mind . Only some mention about the lights of the jhatka and the second part would be over . Abiding by the police order , the meek and loyal jhatkawalas never dare to go at night without lights . Still the mischievous policemen try to disturb them in their routine . Personal experience prompts me to recall a dispute quelled down in favour of the jhatkawala—by my own self . At night a policeman bent on mischief found fault with the jhatkawala for driving the jhatka without lights . The jhatkawala demurely stated that they were lit . The policeman arrogantly denied it , but the other maintained his point with reasonable tenacity . I with my usual officiousness poked my nose in to the matter and after a careful deliberation gravely put in , that to decide whether a thing existed or not in darkness was madness , and suggested them to bring a third lamp and then judge it . I am very glad to write that with the ready and opportune arrival of a lantern the bright flames of the jhatka-lights became clearly visible . Needless to say the policeman took to his heels .

The third and the most important part of the jhatka is , the jhatkawala . Men of different grades of age are seen to prosper in this profession . They are generally grave in the morning , gay in the evening and both at night . Look at them at any time in the day and you might find them as if just coming out of their beds . They are extremely intelligent , because they come in contact with all types of human nature . They are the masters of physiognomy and are ready to sympathise with the passengers in their weal and woe . One ingenious illustration of some times giving up the whip or even a simple piece of rope and using a long rod with a nail fixed at right angles to goad the horse permanently is enough to prove my remark that they are full of originality .

There they were catechised as to their destination by the jhatkawalla. To cut short the story the contract was settled and they began to drive in the jhatka. They went to the house of the host. The first question that the host put to them was "Hallo! why did you disappoint me by writing that you would come by the morning train if you seriously intended to come by the evening one?" "Please allow me to tell," he answered "that the morning train had surely arrived at the correct time!"

The second element that constitutes the Jhatka is the wooden room supprted by two wheels. This part alone is the Jhatka proper. The arrangement of the different parts of it is so compact that they generally do not retain the original design of the artist and hence mostly undergo a diurnal change. Upon it is produced a unique music which being incomparable with any other of its own kind in the whole world is to be called the Jhatka music. Almost all the musical instruments become less harmonious and less loud as they grow old, while the Jhatka music, like wine, becomes more praiseworthy as the Jhatka grows riper in age. A fastidious friend of mine once pointed out to me a very serious-according to him only – defect in the Jhatka. He meant the absence of the caution-bell. But the reasonable explanation that I offered as to the perfection of its structure dispelled the clouds of suspicion from off his mind. I said it is not just redundant to have a caution-bell, when the peerless music of its own is sufficient enough to extort the attention of pedestrians walking at even a distance of a furlong or more'? Some diligent Jhatkawalas augment the noise by putting into the spokes of the Jhatka the handle of the whip. The wooden room is ventilated on all sides with blinds just pending to screen at will. The body of the Jhatka is so delicately balanced on the axle of the wheels that it is not possible for passengers to seat themselves comfortably without making trials to get the balance adjusted! The Government license allows the Jhatkawala to seat three persons besides himself; but this custom is more honoured in the breach than in practice. Two are seated at the back facing the direction towards which the conveyance has to go and the third sits along with the Jhatkawala in front and in the same position. Once a fat man rather a hill of human flesh was trying to get himself accomodated in it; but the moment

restaurant or lodge in the house of some aristocrat. They are preinformed of the things and places worth seeing and hence do not have the opportunity to appreciate things of simple beauty. Most of these visitors perhaps travel from the Mecca Masjid to the Falaknuma and from the Falaknuma to the Osmansagar in that costly conveyance the motor car drawn without horse, the most faithful and noblest of creatures. They must have stayed here for a week or more and should have moved amongst a group of men styled by them" The cultured, the fashionable and the genteel". But such persons can be said to have seen only ten per cent of Hyderabad, while ninety per cent of it can never be claim to be seen by them unless they come down from the respectable height they are proud of occupying. Without much expatiating upon the acknowledged seclusion from life that these persons have, I come to the Jhatka.

As a piece of irrelevancy which I purposely did not avoid I wrote about its size and weight which are square and light. As far as I know the Jhatka is flourishing in our Hyderabad city for the last fifty years. And from that time full many a lover has it taken to their pining sweet - hearts and full many a marriage procession has it bedecked with its gaudy flowers!

It is a thing in three parts, one is the horse or the pony, the other is the wooden room supported by two wheels, in majority of cases, unequal in size; and the third is the human being or the man who by the general opinion is dubbed the jhatkawala.

The horse is generally a mild and lovable creature. It knows the nobility of work. It also knows "Spare Fast with gods doth oft diet". It is a living book for a Veterinarian. It is capable of a very high speed but does never resort to it through prudence. It is more than problematic to distinguish between its average running speed and walking. But it must be clearly told that it is an honest creature, and does but always run rather than walk. The readers might be just prepared to applaud it for its speed but I request them to do so after reading an incident which is as surprising in its nature as genuine. My neighbours reisding at a distance of some three miles from the Railway Station, once expected two guests by the morning train. The guests duly got down from the carriage at the station and came out of the imposing building.

JHATKA

THE HYDERABAD DECCAN CURIOSITY

LEARNED tourists who have visited the important cities of Europe and America have given picturesque descriptions of wonderful and charming things that had engaged their attention there. Some wax eloquent in speaking at length of the picture-galleries that revished their mind; while others exhaust their erudition in describing the wealth and beatuy of the roads and buildings of those commercial centres; some try their level best to give an artistic word-picture of the overflowing richness of Nature around; while others dilate upon the mechanical culture the cities have. Even in India good many cities have got sufficient claim to importance in one way or the other. Our Hyderabad too has some. It has been praised for its historical importance, its Charminar, the Mecca Masjid, the new High Court, the Osmania Hospital, the Town Hall, the Public Garden and the tanks in and around the city. But a very wonderful and privileged thing of Hyderabad generally escapes the attention of all. A thing which is one of the strangest pieces of Art ! A thing which lies on the farthest limit to which the keenest inventive human-brain can be strained !

This wonderful thing I want to describe to my readers. I mean to subordinate all of my talents to this task, in spite of knowing that it baffles all description. It is square in size and light in weight, by which I mean our cheap conveyance the Jhatka. With a word of explanation as to how it escaped the inquisitive ey e of the intelligent tourists and journalists who visited Hyderabad I begin to tell you something about its special importance and charms. All eminent tourists, who come to Hyderabad take a residence in some royal

must honourably face the consequences of her conversion and allow to India the right to follow in her footsteps, if Indian administration and thinkers consider it to be for the country's good."

It is to be hoped that the epoch-making report of the Simon Commission and the far-reaching results of the Round Table Conference will bring the British people to a frame of mind favourable to a correct appreciation of Indians' place in the Empire and their duty and responsibility towards its people. Only on basis of fiscal freedom for India can a reasonable scheme of Imperial Preference be framed which will be conducive to the economic progress of this country and the greater solidarity of the British Empire.

BY

Ahmad Abdul Aziz

M. A.(Alig.)

(Old Boy)

there is no real reciprocation they will naturally receive no favourable response in this country.

Opinions may differ as to the suitability or otherwise of a protectionist policy in India. Whether protection would de advisable in an industrially advanced nation like the United Kingdom and unwise in a backward country like India with her infant industries struggling into a vigorous life is not a difficult question to solve. The demand for fiscal independence for this country is growing stronger every day, and neither the Government of India nor the people will acquiesce in a fiscal policy which holds out no substantial economic advantage to this country. The opinion of the educated Indians leans strongly towards protection. It believes that if free trade is good for England it is not equally good for India. It appears, however that a modified free trade policy shall be more good to us than the sort of Imperial Preference which has been offered for our acceptance. The Indian Government wants the same fiscal liberty as the Canadian Government enjoys and unless that is conceded, India shall not be in an advantageous position to join in the schemes of the Imperial Preference. The views of professor H. B. Lees Smith in this connection are valuable, though we cannot subscribe to everything he says regarding Indian protectionism. He observes:-

"By preferential tariff Great Britain will lose heavily in her Indian market. India, however, has little either to loose or gain from preferences themselves. Nevertheless, the proposals for preferences are of the highest importance to her. If they are ever adopted by the United Kingdom, they will be undoubtedly accompanied by a return to protection. India will then have a unique opportunity of gaining her fiscal freedom. Although I have not disguised my suspicions of the prevailing protectionist sentiment of India, I wish to see her freely adopting the fiscal policy which she considers most for the good of her own people. India, of course, means for this purpose the Indian Government helping, I sincerely hope, in conjuction with the educated opinion of the country. My advice to the leaders of Indian opinion is simple. They should make it plain that if a preferential scheme is adopted, they are willing that India should have a palce in it. One fact, however, must stand out clearly. Should Great Britain adopt protection she

make a bargain on these terms; nor will a fair minded person have the hardihood to offer them. Indian trade with the Colonies and other Dependencies is too small to be taken into account and mutual preference in their case will not affect the Indian situation in any way. To the united Kingdom the trade with the colonies is important, as British exports to the self-governing Colonies taken together are nearly 25 per cent more than those to India.

So much has been discussed about the business side of the question. As regards the sentiment involved in it, Indians have not been admitted to a partnership of the right of the Empire, and therefore they cannot be blamed if no cord of enthusiasm is touched by an appeal to the Imperial sentiment. The blessings which British rule has conferred upon India are known to every one and none are more conscious of and thankful for them than the Indians themselves. They have up till now firm faith in the noble traditions and instincts of the British race and wish that the lofty ideal of the British statesmanship that India ought to be governed in her own interests should be translated into practical action. The attitude of the self-governing Colonies towards India is not such as to foster any imperial fervour in the mind of its people and a change in this attitude is urgently required if this Dependency is to take its proper place in the community of nations which constitute the British Empire. What a deplorable thing it is that everywhere Indians in the self - governing colonies, are treated as subordinates to them. In South Africa the ill considered class Areas Bill is passed, and by courtesy of this bill the Indians are debarred from the social, political and economic equality and right of equal citizenship. When such is the deplorable state of affairs how India is expected to grant special concessions to the self-governing Colonies in matters of preferential tariff problems. A change in the mentality of the self-governing Colonies is highly desirable. If such a change of liberality, fraternity and equality with Indians will take place India will not be unwilling to do her duty by the Empire and make sacrifices as she has so often done in the past. If the advocates of preferential trade within the Empire are really serious in doing justice to every member of it, let them allow India to retain her import duties on cotton manufactures for the protection of her indigenous industry and she will give preferential treatment to British goods. The schemes so far formulated are only one sided and if

England is really seeking the opportunity to capture the whole cotton Industry market of India. Twenty per cent import duty has been levied on Japan manufactures and fifteen per cent on English manufactures which had made the position of India very delicate and awkward now, if as it is the expected danger. Japan plays the same hand on Indian raw- materials imports. there would be another blow to the flourishing trade of India. We are told that the abolition of import duty on British cotton manufactures will make clothing cheap in India, but how dearly shall that cheapness be bought ? The price will be loss in revenue and the ruin of the indigenous textile industry, the only substantial Indian industry in existence. Again if foreign articles which the United Kingdom cannot supply are subjected to heavier duties, they will be dearer to the consumer and this will of course fall the argument to the ground. Of the export of Indian tea Great Britain takes a substantial share and remission of the import duty in British ports is not likely to be much advantageous to us. An export duty on our raw materials, taken by foreign countries, it is argued, will be productive of revenue and advantageous to Britain. Foreign nations cannot do without those goods however burdened with duties. But as the Government of India remarked in their famous despatch of 1903, this will only involve us in tariff war and foreign countries may very well retaliate upon us. Even granting that the export duties are levied upon foreign purchasers as the Government of India might well do on purposes of revenue, it will only be an indirect gain to the United Kingdom. If Great Britain can offer us something worth for bargaining surely then the proposals of the tariff reformers might be considered seriously. So far as the formulated schemes of preference are concerned, they seem to be intended, only to utilize India's raw materials to assail foreign rivals of England and to make the Indian market a monopoly for British manufactures. The advantages that are put to the credit of India in the preference account are illusory, while the items on the debit side are substantial. Some advocates of preferential trade have frankly confessed that owing to India's peculiar economic conditions she does not stand to gain anything by such trade for many a years to come, but all the same, they want to make this dependency a lever with which the united Kingdom is to recover the economic ground it has lost to her rivals after the Great War. No shrewd man will

marked as that of the tariff reformer, unless he is to be supposed to be animated by pure selfishness. If that is so, his vaunted Imperialism is a cloak to hide his interested motives. No wonder then that the advocates of protection in India are suspicious of the blandishments of the tariff reformer and prefer his rival, the apostle of free imports.

For India unmitigated free - trade is bad. But at the same time there is strong reason to fear that Imperial preference would be worse. The latter idea is based upon free or preferential trade within the Empire and high tariff walls against the world prdectionist upon mutual concessions and sacrifices among the members of the Empire for the good of the whole. The common benefit, however presupposes the benefit of the several constituent members. With every desire to do her part of the Imperial compact India will insist on all things to be considered, upon the balance of the advantages which preferential tariff are supposed to be capable of yielding, however slightly, in her favour. If all British goods are admitted, free of duty, into this country, foreign articles taxed, and commodities exported to non - British nations subjected to a duty, what will be the gain of India that would set off against the obvious loss ? The cotton excise could be removed and the revenue duties against the imports of Indian tea and tobacco could be taken off , but it means a considerable loss of revenue on the one hand unaccompanied by any gain on the other. As things stand at present, 64 per cent of the import and 25.6 per cent of the export trade of India falls to the United Kingdom. The remaining 36 per cent of the imports consist of articles which Great Britain cannot manufacture and no amount of concessions can create those manufactures there. As to the exports a similar remark may be made . The United Kingdom does not import more than 25 per cent , because it does not want more from India, while Great Britain exports more than 60 crores worth of cotton manufac - tures to India. Japan comes next to England . This harsh competition of Japan not only destroyed the cotton Industry of India but also proved a formidable rival to England in Indian market. This was a mortal blow to England. To avoid such an aggravated state of thing she at once decided with firm determination to enforce the policy of Imperial preference with full application on India in particular. Hence under the disguise of giving protection to Indian Industries from the cut - throat competition of Japan,

interest but also the duty of the Indians to do every thing possible that might tend to the strength and prosperity of the Biritsh Empire. Since a strong and sympathetic British rule in this country would be the condition of its progress and the strength and the prosperity of the whole would presuppose the strength and the prosperity of the individual members of the Empire. Yet no Imperialism which does not recognise this and help's the country the future instead can find acceptance with the Colonies and the Dependencies, though it is made to be accepted by force in India.

Free Trade principles are applied in India with all their rigidity and nakedness. The apostles of Free Trade very pertinently twit the Tariff Reformers on the flagrant injustice they will have to do to India if their scheme were ever to be carried into operation. Suppose they say, Great Britain turns protectionist to morrow, will they allow to India the same measure of protection as they seek for themselves? The question is unanswerable. Lancashire will not tolerate the idea of its stuffs being taxed heavily in India. Free Traders avowedly believe that protection is bad in all its forms and that protective duties are mischievous. It is therefore quite in consonance with their theory that a counteracting excise duty should be levied on the mill-produced cotton-fabrics in India, if they receive benefit from the import duty on foreign cloth. But British protectionists cannot consistently claim protection of thier own industries and refuse it for those of India. (Lees Smith) an exponent of the British free Trade policy recently wrote in answer to a tariff reformer. He says :

"The policy of the Tariff Reform League, so far as it had been defined, means the admittance of British goods into India free of protective duties. The policy of Indian protectionist is to shut out British goods by prohibitive duties. The attempt to reconcile these policies is as futile as the attempt to square the circle."

Indian protectionists do not certainly want to make British goods a special point of their attack, though they are keenly desirous of encouraging their industries by means of import duties and otherwise. It is curious to note that the British tariff reformer is a protectionist at home and a free trader with reference to India. The position of the free trader is intellegible, not

and Free Trader abroad, especially in her dependencies. The idea of Imperial preference is the natural outcome of that at-home protectional policy. Preferential Tariff and Imperial preference are the two compound words which have been coined to express the different sides of protection. During the last thirty years, the Imperial sentiment had become very strong in the colonies, which have shown their readiness to make concessions to and sacrifices for the mother country and for one another. The question is naturally asked, is the Mother-country to make no response to colonial sentiment and offers of sacrifice? This question practically has been solved in the Imperial conference of 1927 which was held at London in which a declaration was made as to the complete fiscal freedom of the dominions. Through force of circumstances even liberty in forming political relations with other countries, without the sanction and approvel of the Imperial government has been accepted by England. Consequently the Independent States of Canada, Australia and South Africa have really speaking completely going out of the Economic control of the Home Government in England, and are at liberty to severe at any time their connections from the central Government. From a practical point of view they cannot bear the brunt of the injurious so called Imperial preference policy. If they were ready to accept this preference policy they would accept it with due safeguards to their vital economic Interests. But the case of India is quite different. She would not but agree with the policy of the Imperial preference although this policy was not conducive to her vital economic interests. If she were to be accorded the authority of fiscal Autonomy it was just possible for her to adopt a policy which would safeguard to her commercial and Industrial problems. One fundamental weakness in the advocates of the Imperial preference for India is that while essaying to consider the question from the Indian point of view they have to assign a comparatively subordinate place to her interests a opposed to those of the United Kingdom. The principle of mutual assistance and sacrifice agreed to India should have had the assurance of being dealt with in a spirit of justice and fairness. But it is amusing to note that while no such assurance being given the sacrifice of Indian interests is more definitely insisted upon. As a matter of gratitude India would not be unwilling to discriminate between British goods and those coming from foreign countries and to give preference to the former. It should not onlybethe

which have contributed to shape this desireable tendency, none is so important as the loyalty of India during the Great War and her unprecedented devotion to rescue Great Britain from the greatest calamitywhich has ever befallen to the English people in their whole national life. This unique distinction of her faithful aliance with the British Empire and her spontaneous outburst of loyalty to the British Crown which the Great War events have evoked among Indian people. should as a matter of justice bring home tot he mind of the British race the fact that India ought to beaccorded no inconsiderable position in the British Empire. The eyes of the whole Empire and of the world are at present turned to this most essential factor of that glorious organisation ; the auspicious event of British Victory in the Great War, which had been celebrated throughout the length and breadth of India had gone a great way to cement still more strongly her loyalty to the Crown. But unfortunately a sort of the recognition of her services , her legitimate political aspirations, have never been up to the present favourably considered by the British statesman, the final and the most important part of which is to be able to obtain all the rights of British citizenship and to give the Indian people and their land its proper rank among the self-governing dominion of the Empire.

As has been said above this rank seems to have been denied to India and her voice has never been lent a willing ear to the English councils. All the three political parties in England do what they think wise or expedient on behalf of this country, and never care to take into confidence the best exopnents of Indian public opinion. Of course, the parliamentary parties of England hesitate to intervene in anyinternal affair of the self-governing Colonies and impose their political and economic doctrines on India without any hinderance whatsoever.

When the Liberals were in power Free trade had been their dominating vote of economic and fiscal policy. The present Labour government is also adopting the same free policy very strictly. But the Conservative party is not so rigid in its faith of Free Trade, protection being one of the main items of its party programme.

It is curious to note however that England wants to be protectionist at home

India and the Imperial Preference

THE true aim of the Imperial preference is the commercial domination of the so called Great Britain on various colonial markets of the British Empire. But there is a vast difference in the constitutional status of Canada, Australia, and South Africa as compared with India. The above mentioned colonies are self-governing States and have recently obtained by compulsion of circumstances the rights and privileges of Dominion Status from tho Imperial Government. They are legitimately enjoying the power of physical Autonomy, and are in a position to counteract any economic proposal which might endanger their vital economic interest. When we take into consideration the problem of the economic Independence of India there is seen a gloomy picture of her impoverished state which has been constantly debarred from obtaining the right of complete fiscal freedom. For obvious reasons India has not occupied with the British policy the same place as the self governing and other colonies have done. The average British ignorance about this country is proverbial through natural. India has long been commonly regarded as a convenient field for exercising the administrative and the military talent of the English race and the prospects of developing its rich and untapped natural resources have been held out as a temptation to lure public attention. The strategical position of this 'pivot of the Empire', its enormous trade potentialities and its teeming millions, its ancient civilization and superior spiritualism, have often been advanced as her claims upon the regard of stay-at-home Englishman, Imperial and the Colonist. With regard to Indian questions the interest evinced by the people of Great Britain and Colonies, absorbed in their own problems could not but be languid, and the sense of the Parliament's responsibility in the matter of the proper governance of this country is easily satisfied by the conviction that in the hands of the Secretary of State and the Government of India everything would be right. This attitude is happily undergoing a slow but sure modification and the factors

was highly pleased with the entertainment given by him he resolved to justify his case in a conducive manner. The next day however he ordered his grand vazir Ja'fer to present the young man at the court. When he was submitted with great honour before the emepror, he paid his homage according to the royal etiquette and long prayers for his prosperity. The Caliph ordered him to be seated and said: "Nurud-din, I desire to hear your legend once more since it is so very strange and interesting". The young lover answered: "Your Majesty, unless I am pardoned for my fault I shall not feel satisfied". At last when he was assured of the royal pardon he recited his story from the beginning to the end.

When the Caliph found the young man still loving Dina in earnest, he asked him: "Nurud-din, do you still love and want to see your beloved?" Getting his answer in the affirmative he ordered Ja'fer to present Dina at once. When she arrived at the court, His Majesty pointed towards her lover and asked her if she could recognise the young man. "Do women recognise strangers, my liege", she replied.

The Caliph could not but smile, and said: "We have come to know enough of it my dear". Dina lowered her eyes and said: "I regret the inevitable past Your Majesty, and humbly beseech your royal pardon".

Granting her pardon the Caliph sent for the kazi and Dina was remarried to her lover in his presence. Nurud-din spent the rest of his days peacefully as the aid-de-camp of the Caliph Harun-al-Racshid.

By

S. Ahmedullah Khan.

III year.

(Adopted from the history of the Barmecides)

"We are very pleased to find that your beauty coincides with your fame. We know that you are a good musician we wish you would play us a tune on the Ood.'

I obeyed Her Majesty and she was very highly pleased with my masterly handling of the instrument. On my departure towards home she gave me her blessings that my attractive beauty might be saved from evil eye, and ordered me to reach my home before Dina's return. Accordingly I returned myself accompanied by the same old woman. But alas! I was too late to find that Dina was already there. She feigned to be sleeping on the couch where I had intented to settle myself quietly. Regretfully I sat at her feet, when seeing me she drew her legs and kicked me so violently that I came down from the heavens to the earth. Furious with rage she exclaimed: "Nurud-din, thou hast broken thy oath like an infidel and quite contrary to my wish thou hast visited Zubaida. By God had I no fear of ignominy and scandal I would have battered her very roof upon the head of Zubaida". Then she called her slave Sawab and said: "Take away this mean liar from me and behead him at once. I have no need to keep him any more". Submissively Sawab tied fast my hands with a rope and a bandage on my eyes. He was just about to fulfil his task when almost all the inmates of the palace ran and prostracted themselves before Dina. Begging her my life's pardon, they beseeched her thus: "Your Ladyship this is Nurud-din's first fault; he was little acquainted with your ladyship's disposition, and we can see that he has done nothing to be condemned to such hasty death". Allayed a little by the recommendations of the maids she spared my life but said: "Well, I pardon him but he must bear some mark on his body to remember this occasion". So saying she commanded to cauterize to my body and turn me out, which was immediately done. Hence the scar on my brow that you were so very anxious to know about. Thus humiliated and disgraced I reached home and attended the doctor. After my recovery I repaired to my shop, sold everything I possesed and with the money bought four hundred slaves and this gondola in which I come out every night under the psuedo-name of a caliph. I have spent one whole year in this merry pastime".

With an embittered heart the poor fellow began to weep, remembering his beloved. The Caliph was deeply moved by his story and after showing compassion for his suffering he took leave of him and went home. Since Harun

I began to apologise her in these terms: "Pardon me madam, mere lust of gold brought me to this place. ", but Dina interrupted by saying: "Never mind. I have got to oblige you any way. I am independent here, so I shall be pleased to call for the kazi right away. Accordingly the kazi and witnesses were sent for, Addressing the kazi she said: "I want to offer my hand in marriage to Nuruddin Ali, please read the sermon". So it was done and then I presented her the same necklace as dowery-money. Songs of blessings and congratulations were sung from every nook and corner of the place. Pretty maidens entertained us with music, and danced at every turn. I still remember a beautiful couplet sung on that occassion

Pure is He who bestowed on thee all the blessings of Nature,
So that I too got entangled like others into thy chain of love.
O thou who charms the whole world with thine beautiful eyes!
Both fire and water are mingled in thy face.
And the rose is but a grass which blooms on thy cheeks;
Thou art the fire of my heart as well as its balm,
Thou art the bitterest and the sweetest in my heart.

Done away with this we went to bed.

Nearly a month passed in such delightful enjoyment and luxury. My shop, my home, and all my relatives flew out of my mind. I am ecstatic and enraptured even to this day.

One day when Dina was going to her bath she entreated me not to stir out of my room until her return. What motive she had in mind I knew not; yet she wanted me to promise to fulfil her desire. She did not step out until I assured her by taking an oath. Shortly after her departure an old woman entered my room and announced that Zubaida wished to see me at once. I made an excuse by saying that according to my vow I was unable to go out, but she insisted by saying that it was easier to break my vow rather than to disobey the empress and stir her wrath. Seeing no other go than to yield I followed the old woman. Submitting myself to the empress I paid my homage. Her Majesty asked me; "Nurud-din are you Dina's fiance about whom we have heard?"

"I remain your obedient slave your Majesty", I replied.

my desire please"?, she asked. "Madam, I shall try to present whatever I have got with me, if any of them meets your approval I shall be fortunate", I replied. Consequently I took out one hundred strings from my jewel-case, but she did not seem to like any of them, instead, she asked me for better ones. Thereupon I fetched the finest little string of my stock which had been purchased by my father at a cost of a million dinars and humbly informed her that it had not got its match even in the treasures of kings and emperors. She was extremely delighted by its beauty, and said that she was long waiting for such splendid pearls. Then she asked me the price. I told her the cost-price to which she answered that five hundred dinars and a beautiful slave-girl shall be added on her own behalf.

I meekly answered: "Honored lady, the necklace as well as its dealer both are at your service, if it pleases your lady-ship". Hearing this she stood up and said: "No, you should get the profit as well as the price" and just before going she took my oath to go to her house for fetching the price. I at once closed my shop and followed her.

At a short distance we reached at the gate of a magnificent palace. God be praised, it was a most splendid building and on the arch were inscribed the following verses.

Home, may not woe enter thy walls,
And may not Time betray thy owner;
Thou art a beautiful refuge for thy guest,
Especially when he has no home to rest.

I had not long to wait when a maid ushered me in and asked me to go in with her and take the money. A chair had been placed for me in one of the corners, and close by hung a screen of red silk. My customer sat on a silver chair in front of me wearing the necklace she had purchased from me. Seeing me she got up from her seat and said: "Nurud-din, I wish you to be here with me", and began to talk so amiably that every word of her spoke of love in earnest. She said: "I am the daughter of Yahya the Barmecide, and Ja'fer the Caliph's prime minister is my brother. My name is Dina". Trembling with fear as I was, I was consoled by hearing the name of that generous family. By the way

the state of affairs" , the master said angrily.

The Caliph nervously asked the secretary about the matter, to which the latter replied, that their was nothing in particular, only that there was one question which his master was very anxious to ask. Giving him an oath of God, he entreated the Caliph to answer his question quite correctly, asking him the reason of a scar visible on his forehead. The Caliph was dead silent, and seemed to try to identify the master and his secretary. At last trembling with fear he began to weep and related his story in extompore verse. In this connection he also recited the following piece with a faltering voice

My heart convinces the fact that there is our royal master here.
Who comes of a noble descent, and is the Caliph at the present age.
The other his companion, is Ja'far the prime minister,
And the last 's masroor who is executor of his vengeance.
If this be true I have found what I have desired.
My heart's wish has come to me from all sides.

Despite the fact that his verses spoke of the guests being indentified, the secretary tried to refute his idea and turn the bent of conversation to some other channel, but the host persistently declared in plain language that he had discovered the gentleman who was accompanying him. "By God, he is our Amir-ul-Mominin Caliph Harun-al-Raschid" , said he and you sir, I think I know you also : to be sure you are his prime minister, and the last man is Masrur. So first of all I ask my life's pardon that by adopting Your Majesty's title I was so long enjoying the gandoling on the Tigris. Presently I venture to relate my life story before Your Majesty".

"Amir-ul-Mominin, my undisguised name is Ali bin Mohammed the jweller. My father was a very famous merchant. At his death he bequeathed me a great fortune, by means of which I led a luxurious life. One day it so happened that I was at my shop when a young lady came to me riding a mule. She was attended by three handsome maids. She asked me if I was Ali bin Mohammed the jweller.

"Yes, at you service" , I replied.

"Have you got the finest pearl necklace which shall unfailingly meet

after he was composed: putting on a new dress he pondered a little, and clapped once again. Another maid presented herself as on the first occasion, and began to play on the same instrument. When these guests found the Caliph absorbed in music they began whispering to each other.

"Everything here pertains to the dignity of the Caliph, is it not"? hinted the master.

"Your are perfectly right my lord, but could you make out anything what is all this about ? "

"Do you observe any mark on the Caliph's brow? " enquired the master.

Here they were again interrupted by the Caliph demanding the subject matter of their silent discourse. The secretary replied: "Our master is repeatedly applauding your munificence Sire, because at every entertainment given by the four maids, Your Majesty tore away your costly robes each of which seemed to be worth not less than five hundred dinars, and gave it away to the servants." Then, just to divert the Caliph's attention, he recited the following couplets :

Methinks Bounty itself dwells in thy hands my lord,
Thy wealth therefore all equally enjoy.
If Genorisity once shall close its door
Thou shalt serve as a key to the lock.

He was very much gratified to hear them, and ordered one thousand dinars and a robe of honour to be presented to the guests. A second round of wine, and when the Caliph was a little intoxicated the strangers renewed their whisperings.

" I see a scar on the Caliph's brow, I am sure my eyes do not fail me, do they ? "

" No Sir you are right, I am also seeing it as clear as day-light. "
"Shall we ask him about it then ? "
"Just wait a little my lord, it is not yet time. "

"By the tomb of Abbas I would not be satisfied until I would investigate

master observed: "I wish I could know the details of this place more fully." The Caliph who was all ears to hear the conversation attracted attention and asked what was it they were reflecting upon. The secretary replied: "Our master is enchanted with the beauty of this place, and is admiring Your Majesy's fine taste of decoration and management by speaking commendable words before me."

"Do you think anything is wanting here," inquired the Caliph. The secretary replied: "How can we dare speak of such a thing, my lord, when by God's grace every thing is so well-equipped and well-furnished?" The Caliph said: "No, do not hesitate to speak out any thing that is lacking here. Emboldened a little the secretary remarked: "Your Majesty, our master thinks that drinking wine without music is a waste of time."

The Caliph smiled at this and at once clapped his hands. A door opened immediately, and a servant issuing out placed a chair, made of ivory, in the centre of the hall, after which a very beautiful maid appeared, and seating herself on the chair began to play on the Ood *. She played about twenty-four tunes, every note of which amazed and enamourned the senses of the audiance so to say. Her melodious voice added to her enchanting beauty almost captured the soul of the listeners. She began to sing the following in sweet ecstacy :

The soul of Love speaks in my eyes,
And says: "I love thee".
My love-sick heart is a witness, my dear;
Ah! how my soul wounded of thee
Throbbs with thy severance.
How long should I hide the love which has melted my soul?
My heart bleeds and my tears are but poisoned drops;
I know not what love is, my friend,
God has proclaimed his sacred command on earth.

These lines were sung in such a pathetic tone that the Caliph was enraptured and suddenly raising a cry even tore down his clothes. It was long

* A musical instrument of the Arabs similar to the English guitar.

began to follow in the Caliph's tread. Scarcely had they gone a few yards when they were detected by the torch-bearers, who taking them to be strangers, raised a havoc which resulted in thier immediate arrest. They were soon presented before the Caliph.

"Who are you? and how did you happen to come here"? questioned the Caliph.

The secretary replied: "We are travellers, Your Majesty, and have newly arrived at Baghdad as merchants".

"By whose compliance did you manage to reach this place"?

"Our stupidity plotted with us, Your Majesty, and induced us to take a pleasure trip on the Tigris, for which Your Majesty's servants arrested us, but we think it our good fortune to have been honoured by the sight of your imperial presence. As for the future we give up ourselves to fate."

The Caliph said: "Had you not been strangers but citizens of Baghdad you would have been surely murdered according to our Marine Law. But now you are our guest, make yourselves at home and rest here for the night in comfort". Turning to his grand vazir he declared that since the strangers were his guests they should be allowed to partake their private party, to which the vazir assented in submission.

Walking a short distance they reached a magnificient palace, well-furnished and decorated in a royal fashion. When every body had taken his respective seat in thc spacious hall, dinner was served. All of them did full justice to the meal after which there began a pleasent round of wine.

When the cup came to the strangers, the master making an apology refused to take part. The Caliph demanded the reason to which the secretary replied; "It is long since our master has vowed to abstain from drinking wine." Unheedingly however, the Caliph and his courtiers drank to their full hearts and began to swing with intoxication.

When the strangers had a chance of a short privacy they began to applaud the highly decorated palace and its costly china and furniture. The

silken livery was holding a torch with a handle made of gold and set with jewels on which was being constantly poured a very fragrant incense. The central part of the barge was lit up by wax-candles and in the middle was sitting a handsome young person in black. On either side stood in rows about a hundred slaves, while stood in respect of their ranks twenty courtiers besides.

The master addressing his escort said: "Do you see the scene, Sir? What a fine course of pleasentary they have adopted"!

"Really, he seems to be the Caliph himself," answered the secretary. The master smiled and said: "This is the mischief played either by Amin or Mamun."

"By God you are right my lord, he seems to be the Caliph himself", exclaimed the secretary.

The master took a second and a closer view and remarked: "Why ? the whole scene belongs to the court of the caliphate. Look at the man standing in front: one seems to be Jafer (the Barmecide) the grand vazir, and the other by his side, Masrur, the negro slave.

"I fail to make out anything of the matter. It seems I am at my wits end". Confessed the secretary.

Their discourse had continued so far when the barge went out of sight. They gave up the chase and the secretary enquired the boat-man whether it was usual with the Caliph to come out in his barge every night in that manner, to which he replied that it was so. They took leave of the old sailor promising to return again.

The following night, the old man expecting more reward was waiting with his boat at the same place, when these strangers arrived, and as soon as the royal barge passed by them they took to oars following it. To their wonder they found that it was adorned more majestically than before. Two hundred more slaves excluding the first two hundred were humbly dancing attendance. At last they arrived by the side of a garden. Two slaves were standing there ready with a comfortable conveyance. The Caliph alighting from the barge mounted the royal mule and started towards the garden. These travellers also came down on land and courageously

Gandoling on the Tigris

IT was night. The Tigris was flowing as calmly as ever. Perfect tranquility prevailed over both of her banks, and on account of the intense darkness, neither the ferry nor the boats were discernable. On closer examination there could be seen a small canoe, on which was sitting, his head dropping over his chest, an old boatman, and three men in merchant's guise were standing close by. One of them apparently seemed to be the master, the other a secretary and the third one the servant. Coming forward the secretary addressed the old man:

"Dear old man, will you please give us a pleasure trip over the Tigris?, here are two dinars for your service which we hope you will kindly accept."

The boatman answered: "Sir, it is not in my power to fulfill your desire, as it is usual with Caliph Harun-al-Raschid to come out in his barge at this hour of the night, while an escort of his announces a warning: 'Beware, anybody be he great or small, young or old, a free man or a slave, whoever dares to boat on the Tigiris at this hour shall be beheaded at once".

Their conversation had not yet reached its end when a barge appeared near the horizon gorgeously illumined with torchesa nd candle-lights. As it floated past them from a distance the secretary insisted and at last succeeded in presuading the old sailor to row them over the river with a promise of giving him ample reward. So their canoe calmly followed the barge that had just passed by. When they approached near, they saw that a torch-man robed in red

The main importance of these researches is that certain passages in the text have assumed new complexion which has changed the significance of the various speeches of characters; and hence a new interpretation of Shakespearean characters has been made possible. It is on the text that we always rely for their interpretation.

BY

ITRAT HUSAIN ZUBARI.

(Old Boy)

the ninteenth century. Some critics including Shakspearean scholars of Germany held that the "corruption" in one or all these cases was sufficient to explain the divergences of the various texts of these 'bad Quartos'. The second school rewarded the argument that some of the later Quartos including the second Quarto of Hamlet show divergences such as alteration of names, and changes in character because Shakespeare had revised them again and they therefore represent the final authorized text of Shakespeare. The closer study of Elizabethan playhouse and printing house has led the critics to this conclusion that these "later bad Quartos" show that (1) the abridgement of the original full length play in the theatre partially revised by Shakespeare (2) the corruption in the text is due to the actor who sold his professional knowledge of the text to the pirates. This discovery was made when it was found that in some of these plays the normal imperfections of the text at once disappear in some rule, a fact which can be easily explained by the assumption that this part of the text was finished by one who in the ordinary course of business had learnt it by heart.

Thus the authority which was attached to the Folio text in the ninteenth century has been now transferred to the 'good Quartos' and in part to the 'bad Quartos'. Mr. pollard's researches have been embodied in a series of books from 1909 and especially in his classical account of "Shakespeare's Fight with the pirates" (1917). The textual criticism was further facilitated by the very original researches of Mr. Percy Simpson on 'Shakespearean punctuation'(1911) who has shown that the punctuation in old texts for the most part irreconcilable with grammer was meant as a guide for the actor to the rhythmical and rhetorical not to the grammatical delivery of his lines. The commas and semi-colons indicate pauses of various lengths and have nothing to do with syntax. Inverted commas were used not to mark quotation but to indicate "sentences or opposite aphorisms such as are launched at one another by the Duke of Brafanted in the senate-house scene in Othello." This discovery about the old printed text also supports the theory of Mr. Pollard that the 'prompt-copy was used for printing'. Sir Edward Thomson's monograph in Shakespeare's Hand Writing threw new light on the textual authenticity of Shakespearean text.

New Shaspeare (1920).

Mr. Pollard's method of criticism is very systematic and convincing. He has divided the Quartos in two classes. The bad Quartos are those which contain unauthorised texts—Romeo and Juliet, the Merry Wives, Henry V, Hamlet (1603) and Pericles. The remaining fourteen Quartos, he has classed as 'good Quartos' for which he claims an authority superior to that of the Folio. He has given sound argument for the support of his claim which has now been acknowledged by all the competent critics.

All the 'Good Quartos' with the exception of two, were authorized by the company of players and therefore printed directly from the manuscripts of the author in possession of the company. Mr. pollard has further suggested that the versions used for printing are not likely to have been transcripts made for this purpose but the "prompt-copy" used in the theatre for the instruction of players, which itself was substantially of the autograph MSS of the author. This has been proved by a careful examination of the text of the 'Good Quartos' The printed text of these Quartos some times gives us the prompter's note made on the prompt copy and accidently not excised by the printer, for instance "Will-Kemp" the famous clown of the company is named at the head of a speech of the character he played, This is a conclusive proof in support of Mr. Pollard's theory that the 'Good Quartos' were published directly from the 'promt-copy'.

The reasons for using the 'prompt-copy' for printing would have been two, the making of duplicates would have increased the cost of the printed plays, and the risk of piratic publication would have been increased by multiplying the number of versions of the plays. It is why the plays "existed only in a single, authentic and closely guarded manuscript which was used for all purposes, performance, censorship and finally printing". The main importance of this conclusion is that we can claim to possess the authentic version of the play as it was used in Shakespeare's play house.

The 'bad Quartos' have, however not been neglected. and the problem of their origin cannot be easily explained by 'corruption' which has been further complicated by the fact that we have two interesting Quartos, of Hamlet. This problem was fully debated by two schools of criticism in the later part of

method of textual criticism which is the main object of this little essay. Shakespeare's plays have come down to us only through printed texts, all manuscripts having perished. They are known to us in one or both of two forms-the "Quartos" aud the "folios". Though Shakespeare issued no authorised edition of his plays in his life time, Quarto editions of about half of his plays appeared during his active career. Some of them are imperfect and were issued by pira es without the consent and sanction of the author and the company. The case of the rest of the Quartos have been prejudiced by this.

The first folio edition of Shakespeare's plays was issued by two of his fellow actors with great care and authority, but seven years after Shakespear's death. In the early period of the nineenth century critics like Coleridge declared the folio text to be the most authentic. But as the 'verse-test' was applied the critics began to doubt the authorship of the plays wholly in part attributed to Shakespeare, like Titus Andronicus, Henry VIII, Henry VI Part I, Timing Athens, Taming of the Shrew, and they questioned the authenticity of the Folio-Text. It became evident that many undoubtedly authentic passages which were omitted in the Folio are to be found in Quartos. The reasons which led the critics to doubt the authenticity of the Folio Text are reasonable and convincing. The claims of the editors to have printed them uniformly are not supported by the actual text.

It is proved that the folio is a completion of text of varying characters and original and has not been handled on any systematic and uniform method.

The division into Acts and Scenes is now supposed to have been different from Shakespeares, own practice. It is the division which was adopted by the king's men after Shakespeare left them. This division often breaks the continuity of scene, as in the III Act of A Mid Summer Nights' Dream. The principle feature of Shakespearean bibliographical criticism during the twenteth century has been to restore the authority to Quartos which were evidently not 'pirated'. Mr. Pollard is the leader of this new school of textual criticism and his conclusions have been extended and applied in detail by J. Dover Wilson in the

logist and the American with the playwright. Prof. Brander Mathew in his "Shakespeare as a playwright,, 1913, has applied the new method of criticism to the interpretation of Shakespeare's personality and the charater of his creation. Prof: G. P. Baker, of Harvard University has tried in his "The developement of Shakespeare as a dramatist " (1907), to trace the growth of Shakespeare's genius from the point of view of the new school. He analyses for instance the taste of the "the public of 1590" for which the "prentice" Shakespeare wrote his early comedies. Another distinguished American scholar Prof: E. H. Wright has also handed the new method of criticism in his "Reality and Inconstany in Shakespeares' characters" (1916) with great accuracy and critical judgement.

In England the effect of the historical school is seen in Garrell Figgis' Shakespeare (1911) where the principles of Elizabethan stage-craft, were kindly expounded. Sir Quller Crich delivered during the early period of the Great War a series of 'breezy lectures' at Cambridge and discussed many problems connected with Seakespeare's Workmanship. Prof: Bradley has made a distinct contribution to the theory of Shakespearen Tragedies and has discussed Shakespeares' personality in his 'Academy lectures', and though he does not belong to the new school, his accuracy, critical insight and historical knowledge show sound Elizabethan scholarship which is so prominent a feature of modern method of criticism. Even in Germany once the stronghold of philosophic criticism, the new method has triumphed. Alois Brandl in his Shakespeare (1922) recognizes that the theatre was always the controlling influence in his art.

A great amount of research work has been done about the Shakespearean stage and audiances, which has resulted in the appearance of such books as G. F. Reynold's "Some principles of Elizabethan Staging" (1905) and the Playhouse (1916) by Lawrence Arccer.

This brief survey will give an idea of the vast amount of research work that has been done during the last thirty, years. It has not only altered our conception of Shakespeare's technique and art but has also changed the whole

SHAKESPEARE'S TEXTUAL CRITICISM IN THE TWENTIETH CENTURY

Twentieth century has seen a great advance in Shakespearean criticism in all its branches. Every problem connected with his enigmatical personality, and the development of his mind and art, the interpretation of his characters, and their soliloquies, the stage where heacted, the prejudices and taste of the audiances for which he wrote, has been attacked by Shakespearean scholars with a new force and a different angle of vision. The close scrutiny of the Elizabethan theatre, the interests of the companies and audiances have compelled a withdrawl from the extreme type of æsthetic theory which formed the basis of Shakespearean criticism in Germany.

The picture of a great artist's soul, steadily evolving into four definite stages with marked characteristic of each, has grown less interesting and improbable even to critics like A. C. Bradley and Crose who refuse to recognize any external force to have moulded the genius of Shakespeare.

We have also to remember that Shakespeare was himself an actor, and Globe shareholder, that he wrote for his company with an eye on the taste of the common people whom we now call "Groundlings" and within the limitation imposed on his art by stage craft of the Elizabethan age.

The idealistic interpretation of Ulrice and Gervinus has given place to the realistic interpretation of Prof: E. E. Stoll and Prof. Lewin Schuckling. Prof. Brander Mathew of Columbia University has declared that English criticism of Shakespeare is preoccupied with the poet, French criticism with the psycho-

learned and the advanced ; so the student should ever try to mix with his professors, learned men, high officials, cultured friends and senior students. He should spend his leisure hours, even some of his engaged periods, if necessary, in conversing with men of higher taste and culture. Thereby he shall unconsciously receive the charm of society as the flower receives sunshine. His outlook and his ideals shall expand; he shall ever feel embibed with high aspirations, and shall never sink beneath the tide of low mindedness.

In the end it is also necessary that a student should have an experience of life in general and should be in touch with the activities of the world. A careful amity with people who are engaged with life outside, and a constant perusal of news papers and magazines of various sorts pave the way for his future and make him succeed in his later and more important and responsible life.

MD. ABDUL QAYYUM KHAN 'BAQI'
M. A. (Osm)
Editor

interest he should have a religious air about him, for religion purifies the soul and elevates the mind to noble thoughts and noble delights. Lastly he should venerate his elders and his superiors and mankind in general. It is no fashion and policy to be stiff-necked and haugty.

III. PHYSICAL AND INTELLECTUAL EXERCISE.

It is extremely necessary for a student to be physically strong and healthy. An invalid is unfit for any serious work in life. Hence he should either have light indoor exercises or should indulge in outdoor games that fit his strength and constitution.

His intellectual exercise is of course his college study, but since it is only a hobby with many, we feel it necessary to mention that at least three hours hard labour, including the study of books and writing, should be the daily routine of a University candidate. Without that he is void of a living soul, that every man should have, and fails to enjoy the real vigour of life and youth.

IV. RIGHT THINKING AND CLEAR JUDGEMENT.

Another of the most important features of education is to cultivate rationality in man and to develop his common-sense to right and noble thinking. The student should be a representative of this feature. But it has been found with many, that just gaining a little education they become one-sided in their opinion, and being a proof against correction become almost a crack to the extreme. They never sympathise with others, and so are unable to see things in their proper lights. They create a darkness of their own and are pleased to reign like the one eyed Cyclopes in his dark and unwholesome cave. The student nay even the scholar should never be so. He should always welcome right correction and have an outlet to feel and admire the suggestions and opinions of others. It is the way to never-ending progress – Perfection being the peak of impossibility for the very nature of mankind.

V. SOCIETY!

As has just been said, to gain the peak of perfection is impossible, it is only reached. But it is reached by a conscious approach to the society of the

IV

THE STUDENT AS A PERFCT GENTLEMAN.

We do not want to be sentimental or idealistic in our views as perhaps we have sometimes been, nor do we intend to be dryly moralising. Putting forward discussions that are in keeping with the needs of society and the possibilities of human endeavour we are trying to bring out an standard of morality and culture which should bear practical importance, and should be known and adopted by every student of the university. Much has been discussed as to his literary activities, but since we believe education has no value without morality, we, perhaps with some simple detail and a little stress wish to express our views on the last point.

The first impression of a gentleman in its true sense is his dress and his appearance. Lords have their own appearance, so also the nobles and aristocrats. But the student of whatever rank he might be should never have such formalities, as they seen to have. His dress should be neat and clean on the one hand and simple on the other. As it is unnecessary to wear silk and satin in the factories, so also it is needless to put on high class livery in the college—since both are the fields of action, the difference being that the one demands manual labour and the other intellectual. One is at pleasure to present himself in the most beautiful livery outside, but it is better, as every great mind thinks that his dress in the college should be simple, for here it is that the genius of the mind is valued rather than the vain show of body. The student should be more particular on that score for a luxurious life divaricates his way to attaining his his true goal. Similarly the student should be free from a punctual usage of high class toilets and showry things of ornament, for such a course of life, being a more formal show of dandyism either disconnects him from his more important life of devotion to knowledge, or goes to make his life a burden of various vain ambitions and desires. He should be a man of letters rather a 'gentleman' of colours.

Next are his character and habits. It has been discussed already but we should like to point out three aspects in particular. Firstly that the student should be strictly modest and have a strong moral character. He should be void of every low and uncultured ideal. Secondly just for the sake of his own

according to the needs and demand of circumstances.

MANKIND IN GENERAL.

The student, being the true son of an academy is not only a show but an example. To say it plainly it is for him to impress the nobility of his character which he has gained through his university education. Also it is up to him to be an indirect means of instruction to others. Mankind in general is a dangerous factor of life. One remaining however aloof cannot extricate himself from public opinion for or against. So it becomes a part of one's duty to cultivate a noble feeling in the heart of every one, as far as possible otherwise he unconsiously falls a victim to general ill-favour and even slander. Of course one does not know when and where he has to encounter the public or the individual to whom he had previously been a perfect stranger. In the present era however, there is an ever ready society of purely conservatives and the orientalists who have an eagle watch over all modern tendencies, and having a groundless innate prejudice at heart are ever alert to pick up holes and render us, the "Western Lights" as they call us, to public slander. Contrary to the policy of being obstinate and headstrong, a student, who is ever an unfortunate victim of society in every possible affair, has to be very lineant. Just to impress his own worth and superiority, he has to be indirectly noble, polite and punctilious; such an attitude nips the pride and prejudice of society in the bud with wonderful success.

The brighter side of public opinion is really the touch-stone of a man's character. Hence the student should open his ears to public opinion and should ever aspire to win public honour, respect and fame. With his heart-appealing and noble love, veneration of mankind and strength of character he should make a way into the hearts of others, but he should never be self-flattering and over indulging. Fame in that, which is gained by open and fair competition, by personal labour and industry, by intellectual and natural effort, is superior to every other fame that is herditary, liable to chance or unfair competition. The student therefore, trying to win public honour, should like to attain the former, for that alone is truly human.

men of letters of a higher rank, but he should never indulge himself into anything lower as is the case with many. Uncultured society, company of narrow minded commoners dries up his softly budding youth and incurs an irrepairable loss to his morality, knowlege and intellectual developments.

While among his friends he should first of all be self respecting and self-conscious, or else he would become a mere toy in human hands and would dance with the whims and fancies of others. Next, although being free and open minded, he should never be loose, base and insalutary. He should avoid all kind of childish mischief and should never be careless and neglegent in behaviour like the common by-street non-entity. He should be polite and should honour the good and worthy, for that is the way to be like-wise treated with. He should avoid all coquetry, dandyism and pride in the vain and exuberant show of life. That is quite unbecoming for a man of letters. He should not be too solitary, pissmistic and self-concerned; it is a sort of eccentricity and is injuriuos to public feeling. On the other hand he should be amiably happy and smiling; and should be ever ready to sympathise with mankind in all their hopes and fears.. for it is said: ' Laugh and the world laughs with you: tweep and you weep alone. "

DOMESTIC LIFE

Since education and training are preparatory routes to a prospering life in future, the student has also to adopt himself to his domestic circle as nobly as possible. His first right is to respect and honour his parents, to obey them and to help them in every walk of life. As he advances in his years, and his parents stoop to the downward path. it is his duty to bring over his household affairs to his side without being over-indulgent or arrogant in tone and manner. He should lighten the burden of his benefactors and should prove himself a help, a guide and a support. It often happens, that a student's domestic circle is uneducated or rather less educated. So he has to encounter all the pangs of the difference of taste and opinion. On such occasions he should be broad-minded. and patient and should work with a policy of a silent reformer who is conciliatory and concomitant. He should have a distinguishing mark of greatness and sagacity in all his connections with his family and relations far and near. He should be the 'son of time' as they say in Urdu and should act

own progress and melioration. Most of the college students think that the professors are only professors within the lecture halls; by that they mean to say, that a flower is only a flower in the garden; evidently the idea is preposterous.

Character should be made second nature rather tahn a policy. It is better that a man should think and do, but it is much better that he should train himself to do naturally what he does after thinking. Moreover, when culture roots itself within the soul, it mainifests itself in its true colours everywhere the same. Thus the spirit of venerating the good and the noble (a part of good moral character) no matter in whatever surroundings and environment they may happen to exist, is cultivated from within. No student can claim to think that a professor, even though he on his own part is not kind towards him, should be honoured within the college hall only. Strong and noble character that is natural and not political is the mirror of every man's inner soul.

THE PRINCIPAL.

As the head of the Academy, the principal has more rights over the students than the professors. He is a man of wider authority and consequently a man of wider influence. His demands from the students therefore are greater, and it is for the student to give him whole-heartedly what he wants. The student is more responsible to the principal than to his professors, and it should be a part of the student's career to value and fulfill that responsiblity as a gentleman, although it happens to lie beyond the limits of his literary domain. The principal in short is an official plus the professor. and as such the student certainly owes him the surplus.

III.

THE STUDENT'S SOCIAL RIGHT AND FRIENDSHIP.

Nothing is practically so important to a university student as his social life and friendship. As he is young and energetic it is the period of transition for him, and it is natural to have ambitions and delights. But to make them noble, he should seek society that is beneficial to his own class mates, or people that have status equal to his own. Rather he should cultivate friendship with

both on the dirty atoms of the earth as well as the placid waters of the lake.

CHARACTER.

The deep relation of a student's character with his college studies is never realized by many. They esteem it as something private and personal. But it is a grievous error. Character is in fact the very soul of man, — the method of action in life; within that method of action lies his career as a student, and the more systematised it is, the more systematised its results will be.

Education in its real sense is the uniformity of thought and action. Noble thoughts, noble delights realised with noble action are the charms of true education. Hence it is positively necessary for the student to plant that conformity of thought and action within his heart and let it bloom into a bunch of sweet and blossoming flowers.

The foremost feature of a student's character should be his stern morality, culture and self respect. His outlook on life should be noble and unsarcastic, his dreams sweet, his ideals lofty, his mind pure, his thoughts expansive, his actions venerable and his speech choice and charming. He should have a power of attraction within him, and should display within himself marks of greatnes in future. He should venerate mankind and should be venerated in return. He should smile and laugh and should never mock or sneer, for it is well said: "laugh and the world laughs with you; weep and you weep alone. "

How impresssive it is, that with his thoughtful attitude, sincere outlook, simple and neat dress, plain living and nigh thinking as Wordsworth puts it, he should maintain the air of a scholar and his sincere devotion to knowledge.

TO THE PROFESSORS.

To studious and sincere students, the professors are as if demi-gods who go to make up his soul and mind. God creates them, but the teacher makes them worthy of that creation. Hence it is the duty of every student to venerate their personality, honour their feelings, thoughts and actions. That is an indirect method of working for one's own benefit. He should approach them with the spirit of a disciple and should try to follow their suggestions with devotion and delight. To have that, is to have a corrigible nature, which on the one hand makes the teacher amicable to him, and on the other hand opens a way for his

II

THE CHARACTER OF THE UNIVERSITY STUDENT.

THE UNIVERSITY.

To a student his University is an Alma Mater within whose loving arms he has been brought up from the cradle of ignorance to the altar of knowledge. She has been a torch to lead him from darkness to light and has endowed him with gifts that are to survive his age. She has opened his eyes to the charm of Heaven and Earth: She has united his mind to the Universal soul and to all the painted panorama of its beautiful creation.

How then is a student to respond these peerless and dignified obligations? For that, he should think and act accordingly. On the other hand, by overlooking its importance he only disregards his value or to be more frank, discloses the lowness of his own pitch.

Immediately after the student steps into the University he is bound to it for life. May he lodge on the snowy peaks of the Alps or roam in the wild deserts of Africa, his very presence, his voice his soul, his speech, his action and his word and deed will be the manifestations of his university: it is from the quality of his actions that the quality of the university will be judged.

So, he has to lead a modest life- a life full of gentle actions and noble delights. He is to distinguish himself from people who do not belong to the great House of knowledge—a House of knowledge where the rich and the poor, the master and the slave are all valued in respects of their merits rather than their positions in the world. The university banishes all baser elements of life, and teaches us to look upon and value a man's knowledge rather than his personality, to gaze at the lustre of the intellect that is heaven, rather than adore the corporal grandeur that is hell, so to say. He is to maintain the honour of his Alma Mater everywhere—in the cinema, the theatre, the feast and the festival, the road and the street, the party or privacy, the house, the bazaar, the family and among friends. He is to shine like the sun with equal lustre on every particle of dust, or like the moon, should stream cool beams of transparent light from the crystal sky,

thought and mind remains with him, even after he has long passsed away. As such it is an intellectual life of the individual and a constant source of knowledge for the community.

To the student however, it is the surest key to success in the examination and a time-sparing method of wonderful literary progress. It is the ladder of fame and honour—honour that opens to him a way to everlasting ease and comfort in life. If practiced with a persistent and central motive, it is also a means of acquiring much wealth. Earning by the pen, as History prove, is one of the highest and noblest of professions. So, we can declare perhaps with some emphasis once again that writing (particularly after reading) should be part and parcel of the student's literary career.

It should be practised in various ways. To begin with, the student should regularly prepare his class notes: that is one kind of writing; translations and contribution of small and instructive articles to a magazine, is another. So far as the last and the best method is concerned, the student should note the natural turn of his mind, and write upon a subject that appeals to him best. He should select one by which he feels inspired, about which he has some information at hand and is in a position to collect more from the study of books.

To quote a persian poet Sa'di–

Make thy ambition high– so that both Man and God
May value thee according to the pitch of thy flight

a student should ever soar like an eagle into higher regions.

Biographical sketches, literary criticism, or instructive articles upon subjects of modern science and philosophy, valuable abstracts from History, translations from foreign languages, are a few of the most suitable fields for students to work in. They also present to them a rough idea of what is meant by scholarly research. The rest goes with the studious and the deligent student.

We think we have been too dogmatic in the enunciation, yet the open-hearted reader, without picking up holes shall surely try to make out and feel what we mean.

'Research' is to dig up curiosities and valuables from the ruins of literature, also to accumulate the past and the present in order to create the future. As has been said, the Intermediate or even a B. A. candidate cannot properly handle the work of research unless he is head and shoulders above the common lot. which is very rarely the case .

Most of the students disregarding the above method of research, of course according to their aims and limits, try to write articles that are enforced and thrust upon, and so their outputs happen to be dull and ineffective. Often they try to write outside their own fields, for example, a student of the department of science tries to write an article on philosophy or psychology, before knowing even what its very outlines are. He may write a short story with some success, but had he written something on his own subject it would have been a greater success and so more imposing.

Nevertheless it is necessary that practice should be made in the very beginning. or else none feels any inclination towards writing, as often is the case, and so never gains a chance of fame and progress in future.

WRITING

Having done away with the method of reading, we shall now turn to Writing, another more useful and efficent duty of a student. Authors and essay writers, know it for a fact that Writing develops the literary faculties of a man, and enlights it like a house on fire. Reading is to feel, and writing is to express, and it is essentially human to act upon both. But unless one's feeling and expression are in consonance with the right and scientific point of view, rational, and so human, one is hardly able to be considered as a noble factor of human culture and civilization. So it is that here education becomes an indespensable necessity of life. Expression is of two kinds—oral and written. Oral expression although being the most powerful vehicle of inspiration has a draw-back of being unrecorded and so transitory in the limited sense. Writing, since it is the image of a man's

should never be the case. They should always outrun their limits and approach to higher fields of study - Art, Science and literature. How to do that has already been described.

A gradual practice of such out-door excursions in literature so to say shall open a way of a broader light and knowledge which shall burn within their hearts and shall seek an outlet to come out and shine in the world. To be more simple, reading that is extensive and serious shall, of its own accord stir the spirit of writing, and if that spirit is made to fly into proper heavens, it shall make one a remarkable scholar and author in the end.

The level and intensity of what we call 'scholarly and scientific research rise with the literary achievements and qualifications of a student, and it is not, easy therefore to lay down definite methods of works for their proper guidance. It has been noticed that an intellegent candidate of the intermediate class lays his hands upon work that is handled by B. A. or even student of a higher class. Yet, it should never be forgotten that work of any quality exists along with the serions study and work of the student.

Scholarly work is but the development of a definite scheme of general study and the practice of writing with a scientific method.

Essays are of various kinds, but those that come under the heading of "scientific" are those that convey material gathered from books directly relating to the subject, a treatment that is orderly and consistent, and an output that gives something new to the world though its parts have been gathered from the old stock. Work done in Sciences, such as Physics, Chemistry, Astronomy, Biology, Philosophy, Psy chology, Politics, History and so forth, also in Literature concerning Poetry, Prose, literary critcism comes directly under what we have called scientific work. Essays containing abstract and personal ideas such as impressions on the Taj Mahal, or an article on "Love" hardly convey the scientific sense though they are written by a scholar. In spite of dealing with abstract impressions, if a reference is made to the details of history and architecture of the Taj Mahal, or a psychological and physiolog ical touch is given to the origin and development of love and the aforesaid essays soon change into scientific ones.

The B. A. candidate has to fulfill a double function—he has to coach him self up both in his English and optional subject, and whether he intends to run up for higher course or not, he has to make himself thorough in his own domain. The two years of B. A. therefore are the most engaged periods of his life. He has never to be lazy, indifferent or easy going—or else although getting his degree he would still remain below the standard level of a graduate, as generally is the case.

Students preparing to take up higher course like M. A., M. Sc., Ph. D. etc have only to supplement their textual reading to their extensive general study and scientific research. For those periods are not to sow, but to reap—and it is essential in every way to engage them in "production" and "digestion", in equal proportion.

THE LIBRARY

The library should be the favourite haunt of a university candidate. He should have a special note book in the form of a catalogue. It should have ready references to as well as memos of the best and the most valuable works of prominent authors, which he has to read in earnest, and should also present a record of books gone through by him in due course. He should have ready recourse with all the best leading journals and magazines in the library, and should try to be in touch with the current news and movements of the age, Literature, Art and Science being given special preference to. He should reach himself to the books of reference, should copy down valueable notes either relating to his text books or general study. By the way he should also try to grasp the art and technique of writing, style, expression and arrangement of material in various subjects of thoughts.

SCHOLARLY AND SCIENTIFIC RESEARCH

A vast majority of the university students are under the impression that textual work and a limited adherence to the university course are the only lookouts for a university candidate. Sticking to it therefore, they only confine themselves to the study of the text books, the result being that they remain a mere book-worm, and so loose the development of their latent faculties. It

of their own class work. Unless they direct their special attention to it, there is hardly any chance of their getting through the university course with success.

General study not only helps them to comprehend and digest their textual work, but also tends them to give out something of their own. It imbibes originality, encourages the spirit of innovation, and trains the mind to grasp, to feel and to express.

The Intermediate student has to read fiction and translate both in English and in vernacular, that which appeals to his personal taste and judgement. Reading the novels of standard authors, translating, from Urdu into idiomatic English, some selected passages from authors like Hali, Shibli and Zakaullah, Suddarshan, Nayaz, Prem Chand and others, going through the articles on interesting subjects from literary magazines is practically the most efficient method of developing one's knowledge and abilities. The student should stick to reading with amazing punctuality, and he would in a short time feel the the wealth of his own knowledge. At last for about six months he should spend almost every leisure hour of his in perusing books, and should devote his whole-hearted attention to the accumulation of lessons, ideas, opinions, and suggestions from the great master-minds.

Entirely doing away with fiction in the Entrance class the B. A. candidate has now to direct his course towards standard works of modern authors like Henry James, Mary Corelle, Dostovesky, Tolstoy, George Meredith, Conon Doyle, Anatole France, Antone Chekov, Bernard Shaw, Le Quex, and the like, and should read literary criticism on poetry, drama, and literature in general. He has to open a general field of research in the works of foreign authors, to study with delight and comprehension what appeals to him in his optional subject—History, Economics, Philosophy, Psychology, Political Science and vernacular literature. I would also recommend the study of poetry from works of well-known poets*, especially for those who naturally possess a poetic turn of mind.

---

* Shakespeare, Dante, Goethe, Milton, Wordsworth, Shelley, Tennyson, Moore, Robert Bridges, Alfred Noyes, Tagore, etc for example.

To prepare systematic notes of one's private study is one of the most efficient method of preparation. Such notes are of immense value both to the student and his class-mates. They are a sort of scientific and thorough answers prepared before hand, and cover every possible question likely to be asked in the examination. They offer him practice of working, and for a sort of epitomy to be sweeped over just before entering the examination hall. Scientific notes prepared in higher classes are best guides to authorship or scholarly work of serious kind. They are the brilliant records of a student's university career and success.

Besides, the art of study should not be utilised as an ingenious strategy to get through the annual examination and acquire certificates only. On the other hand it should be made to make root within one's heart and soul profiting thereby one, slife lasting energies.

The subjects should be studied with sincerity and interest. They should be the delight of the soul, not a taxation of the mind. They should be digested with flavour rather than engulfed with compulsion.

It has been the policy of many to esteem the college hours as mere 'filling up' of the attendance and the college lectures and notes as a rough material to devour for a time and to be poured over the answer sheets in the examination hall. That is myopious indifference and the root of everlasting loss. It should never be adopted by the student, since on the one hand it is a disgrace to the Academy and on the other hand an irrepairable loss to himself, his family and his country. Most of the students realize the mistake after they enter into the keen competition of more responsible life in the world outside.

GENERAL STUDY

To be an intelligent candidate as well as a successful scholar in future it is indispenable indeed to extend one's intellectual faculties, and that can be hopefully accomplished by general study. Most of the students either evade it with a false pretension of having no lesiure or consider it a task, to be undesireably imposed upon. But it is a grievous mistake. General study is and should be an inseperable factor of their literary career and part and parcel

THE M. A. AND HIGHER DEGREES.

The degree of the Master of Arts is *ipso facto* the mirror of a student's budding genius—it is not a parade ground to drill his latent faculties and it should not be so. The zeal to attain it and the tact to get through it should be inborn and innate. Too often it is that the students do not perfectly realize the situation and forcing it upon themselves merely make it a thing of ostentation and display. The Entrance class is in fact the encouragement of knowledge, the B. A. its preparation, and the M. A. class a satisfactory part of its completion, in its conventional and limited sense.

The University M. As. and Ph. Ds. and others are not a mere addition to the literary list: they are creation; and it is their duty to invent not to add. Unless one feels himself imbibed with the spirit of the initiate, it is of no use for him to run up for higher qualifications.

PREPARATION FOR THE EXAMINATION

Study and preparation for the examination is an art—an art that requires earnestness, deep cencentration and whole hearted devotion. It should be made a subject of constant attention and punctual labour from the very beginning—well begun is half done. The student should be regular in his studies and should be patient to the last. It would gradually elevate his mind, lighten his burden and quicken his energies to work of a more serious kind. He should be systematic, and work upon lines that are generally called 'scientific'. The best method to prepare for the examination is to take one book after another and finish the course in individual order. All the subjects handled at a time disgust the mind and present unfruitful results. To be Jack of all but master of none is simply rediculous. Ample amount of time should be devoted to the study that is thorough and exhaustive : hasty preparation has no real value. The work should be started many months before the final examination and should be dealt with in good order. Most of the intellegent student gloat over their hasty preparation and ordinary success in the examination, but it is in fact a thing to weep over. Had they worked seriously, the results would have been more glorious and lasting. It is a loss that would be deeply felt by them in later life.

The student of B. A. has a significent value and twinkles like a star in the blue east. He has to perform a double function. One that he should, improve in his knowledge the English group to do serious literary work; secondly that he should coach himself up in his optionals to open a characteristic and distinguished field of research in the higher classes. He should never look to mere passing in the third division.

Again unless he has a good hand in the first group it is more advantageous that he should lend his special attention to the optional group; since it is the gate-way to his inner soul and originality in consequence. Also it paves the way for his M. A. and other degrees.

After being a full-blown graduate the student arrives at a intermediate stage between the high and the low, and unless he goes up for higher studies he remains in the beach like a boatman who had a few miles to sail on the ocean, whereas his comrades had gone far into the blue and had dived into deeper waters.

THE FOREMOST RESPONSIBILITY OF A UNIVERSITY GRADUATE

Since most of the graduates, without going up for higher studies often settle themselves into the world outside, and also still remain corregible in all walks of life both intellectual and social, we have ventured to insert the following para:

The foremost responsibility that a graduate is liable to is to maintain the standard and honour of the University through which he had taken his degree. But it has been rightly noticed that many of them turn a deaf ear to this great truth. Like the selfish and the indifferent they give up themselves to the mercy of Fate and the world, and lend a hand to the disgrace of both themselves and the academy. It is a most reproachable point indeed and it is a feature that should never pass over the mind of a graduate.

Again since he is one of the hopeful elements of national evolution he has responsibilities outside his literary domain, and it is up to him to be the "tomorrow" of his dear motherland where he is born and bred to manhood,

the great 'Treasure Island ' of knowledge—the library.

After the College hours he has to allot at least three hours to his studies at home. He should either recapitulate his lessons or should prepare new ones for the next day. He should also devote one complete hour for general reading : the time recommended by many is just before going to bed. Unless he habituates himself to that he has no chance to extend his knowledge and grow into manhood of scholarly fame.

A joint partnership should be made with an intelligent student of the class. He should be engaged to guide and help as a friend, care being taken not to encroach too much upon his privacy and convenience. Joint study should begin from the second term to at least one month before the final examination.

SELECTION OF THE OPTIONAL GROUP.

The student should carefully look upon the selection of his subject for the optional group. A prudent candidate would settle that point in his High school only and shall strive to cultivate his talents in that particular subject years before he enters into the University course. But since it is higher than the average capacity and also it is impossible for the latent faculties of a student to bloom in the school, it is preferable that the option should be thoughtfully made in the Enterance class and be maintained to the higher degrees.

Moreover, the subjects should be taken up in accordance with one's natural bent of mind. There are candidates who merely looking to their material emolument adopt them even at the expense of their natural tastes. It is an awful mistake. Eventually they come out of the College as mere trained labourers, not as inventive masters.

THE INTERMEDIATE AND B. A. STUDENTS.

The position of an intermediate student is preperatory and tentative. Compared with the great scholars he has no significent and individual value, yet he is one who can look forward to be a great scholar. Therefore it is for him to work as hard as possible, or else as an undergraduate he would only be a wreck on the great ocean of knowledge.

himself to run abreast in the great race of life. The University is not merely an academy: it is also an institution for acquiring moral training. To be a little metaphorical it is the birth place of men,—men full of blood, intellect and culture in them—men of small hands but big heads—nay even nations

THE FIRST DUTY OF THE UNIVERSITY STUDENT

The first and the foremost duty of the university students is firstly to feel the importance of his position and environment and then to enter into it with a definite resolve to work in earnest. He is to think himself as a devotee, a slave of the God of knowledge, and it is up to him to realise that his fidelity shall end in his own melioration.

UNIVERSITY STUDEIS IN GENERAL

Feeling himself imbibed with vigour and life in earnest, the student has to make a good start of his University career. He is to adopt punctuality in every department, and has to be perfectly regular in his attendance. He should fix an exact time to start for the College and for his return to home. Regularity of time and attendance goes to make him a systematised worker and keeps him in touch with his College studies. It saves him the trouble of what is called "making up" the lectures and attendance, which if left un-attended to falls him into a mess before the final examination.

Within the College hours, he has to attend to the lectures with perfect attention. He has to jot down systematic notes of the professor's lectures with a clean hand and mind; he has to digest the pros and cons of his class-work, and has to take in with relish what has been given out by his tutor in way of his intellectual development.

He has to spend the leisure hours and considerable part of his engaged periods in the College library. He should either attend to the books of reference or study in general — Newspapers, Literary magazines or books of scientific literature and criticsm The library is the key note to his success. He should rather not waste his time in idle talk or loose interlocation.

He has to keep a seperate copy book for each subject and has to fill it up with real ' gems ' either gathered from the wealth of his professors or from

THE UNIVERSITY CAREER

[This article has been inserted with the compulsion of some of my college associates who regarding its practical importance for some of our university students refused to listen to my excuse that since it lacks in width of vision and maturity of experience, it will be a sort of self-imposition to publish it in the magazine.

In this humble essay written in my fifth-year class. I, without aiming at comprehensiveness and in the spirit of a humble student, have tried to sum up a few of my poor college experiences and while expressing them in writing have looked towards their practical importance rather than to their original maturity or theoritical exaltation.

Editor]

I

Knowledge is premature experience.

Few students coming directly from the High school know the value of the university in which they are very shortly to enroll themselves. Many among them untill very late cannot even comprehend the importance of their position as a University student. Regretfully however, same is the case with the seniors. Therefore a faily good number of them cannot bloom to the spring of knowledge and culture.

THE IMPORTANCE OF UNIVERSITY EDUCATION

University education as most people think is not only confined to literary attainments but in fact is the threshold of the great life the student is likely to enter in a few years, hence it is a test for the talents and the training of one's faculties who has had a little chance of developing them in his youth, and undoutedly it is for every body to reap full advantage from it and thus enable

next moment she frowned—so fickle are they that inhabit the earth! and saying something to her maid, who brought a message began tearing away my limbs, which learned botanists called 'petals'. One by one this fair tyrant denuded me of these 'petals and marred my radiant beauty. One by one she threw the torn limbs into her mouth. I stared at her in frozen wonder. But she continued her destructive diversion. At lenght she held my body bare as it was and deprived it of the unity which had constituted its fascinating beauty. Casting one last glance at it she threw it away, and there I lay, injured and insulted, on the threshold of her courtyard.

The kidnapper who had brought this dignity and torture upon me came and stood beside me: I looked up at him: and he did not recognise me in that deflowered state. My heart was rent; my vanity was cut to the quick: and I should have uttered a loud vituperative epithet on him and his kind, had that royal messenger who had first come to visit me, not come swiftly. Taking my disfigured body in his arms, he sped to a realm where only formless fairies flitted about like radiant butterflies. As we travelled through space he consoled me. "Unity is life; life is beauty, beauty has a mission: you have fulfilled yours."

By

CRIL MODAK.

(Borrowed from the 'New Era' Madras)

had subdued people !

It was the last month of third year , the last week of that month, and the last day of that week, when a fair comely youth rushed hurriedly towards me, his eyes furtively spying things around and his manner on the whole that of ' a guilty thing surprised ' . As he stood in my presence I felt a foreboding pang in my heart, and alas ! before long this burglar had seized me by the trunk and had plucked me from my father's arm. I remember, as I was being carried away , my father shed many a tear-leaf. This member of that huge army of kidnappers, commonly though erroneously called 'lovers' , brought me into a palace courtyard, and securing me in his prison-like pocket ,scaled up a rope and jumped down. I know he jumped ,for I experienced a shock. I was then taken out of my prison, and found myself a humble offering to a fair creature who seemed to be a princess. She planted me in a twisted coil of very soft grass which to my utter astonishment was not green but black : There was a brief conversation between the kidnapper and my princess which made me blush fiery red with shyness; and I cannot reproduce it here. Perhaps it will suffice to say that it began, " Beloved, if you should explore the vast islands of my dreams -- " . When my kidnapper had finished his long oration, for he was certainly growing eloquent and his gestures were most graceful, I felt so pleased imagining it was addressed to me, that I jumped for joy and fell on the marble floor with a knock on my head. Neverthless it gave me exquisite pleasure to find myself lifted up instantly by my princess.

But my torture began, for the kidnapper had just gone. I was now in my fifth year and found myself on something made of a soft substance like cotton or fleece but upon my face lay a heavy weight hard and round. Need I mention my agony which continued for the full space of a tweleve month, when this hard weight compressed me ? I knew my joys had been nipped in the bud. The days passed slowly I lay under the same weight. It was on my sixth birthday that this cumbersome density, which is supposed to have contained 'brains,' was removed from my frail frame, and I was taken up by the princess whom I had learnt to love though in vain ; she sat in her orchard, where I could see some of my cousins smiling at me. She held me in her hand with but one finger and a thumb, and raised me to her lips. After all it seemed to me that my life was not purposeless as it had seemed. And yet the ver

eclipse was still extant, I was awakened by a wandering minstrel. " English bards called me Nightingale, Persian poets Bulbul, and Greeks styled me Attick Warbler, " he said to me : and I opened my dreamy eyes to find no body near by. I thought I was beholding a vision; but the notes of the minstrel were distinctly audible. I strained my eyes. Nothing was visible. Like a gray shawl the mist had wrapped the bare shoulders of my dear granny. So I closed my eyes and soon fell fast asleep. But not for long, for, in the middle of a beautiful dream I was awakened by a rough hand. I looked at the figure that stood and sternly looked down upon me. My father said, "Bow to him. He is the gardener ! " Those who have been disturbed in this manner will not fail to understand how wroth I was with this bearded biped. Yet, though my fascinating dream had been broken, implicit obedience is the first filial duty, or so we uneducated creatures fondly believe. I had to salute him. He stroked my head; blessed me; complimented my complexion; and departed. I was now quite two years old, and full, as ever young people are, of that vanity which makes praise so delicious to hear. There was an eagerness within me for more compliments. There was a sorrow that I could not see my own beauty which had inspired that old hard-faced gardener to spend a phrase of flattery.

I did not have to wait long to gratify this impatient desire. There came a young man, slim and short, and of dreamy eyes that were perhaps somewhat feeble, for they had transparent protectors strangely fixed to the bridge of his nose. He seemed a flutter with shy excitement. He was about to pass me by, and I was beginning to feel hurt that he had paid me no heed, when he stopped, stared in his peculiar manner at me, and then said audibly, " Pretty Bud, you are truely fit for ... ". I could not first comprehend such mystic words, but later decided that this creature, whose fingers seemed to be those of a scientist and whose eyes were those of a dreamer, who had assigned such a mysterious mission to me, belonged above all to that slender herd of superhuman animals collectively called ' poets'. My vanity however was not yet satisfied, though I was immensely pleased to find another visitor. This angel stood in front of me, took out something from a satchel, and, making a copy of me, she said, " That is how you look, sweet rose bud". I was delighted with my portrait and felt a thrill of self satisfaction. The rest of the five months of my third year were spent in the happy reverie of my personal charms and how they

ADVENTURES OF ROSE

It was a fine morning in the exuberance of spring when I was born, not of a mother, for we are a curious species, and the father bears children, who are in their turn all male. When I opened my eyes I saw, far away above my head, dazzling waves which I soon understood were really the folds of the purple robe of a monarch; but it was stained with patches of crimson blood bequeathed by the monarch's late duel with a certain monster called by mortals 'Night'. My father was fed by our grand - mother on the richest victuals which she could obtain. I learnt that our granny loved us very well, after the fashion of grannies and gave me special dainties which wise botanists term 'sap' but which seemed to me sweeter then ambrosia. Then came a royal messenger to instruct me in the duties of citizenship, and on being asked his name, told me that the Greeks called him Zephyr, the Persians Naseem, and the Aryans Vayu. With this first royal visit I was left to myself for the remaining days of my first year. One could hardly imagine my surprise when I found a total eclipse of the sun just about the time of my second birthday, and the whole of my second year was spent in utter darkness. Nay, delicate fairies came with gobular lamps to see me, this being their custom, as my father told me, that they freely pay visits but only under the cloak-twilight. I believe they are unhappily called 'glow-worms'. No sooner had a company of them — which a poet compares with 'lambent flame' — raised their lamps, which curiously enough they carry with their lower extremities, beheld me and departed, than I was given a few sips of Nectar, which the scriptures compare with God's mercy, and which assuredly quenched my thirst. This was the first time I was allowed to drink something.

After being hibernant for the remaining six months of my life as the so las

Both these dates are mentioned by Anbari (Tabaqatul-Udaba, 215), Ibn Khallikan (i. 153), and Yaqut (Mujam ii. 8), but in al-Nujum al-Zahira• (i, 686 the date is given as 231 A. H. , and in Khizanatul-Adab† (i, 172) as 232 A. H. In the Cairo MS. of the Commentary of al Mubarak b. al-Mubarak, it is related from Awn b. Muhammad al-Kindi that he said, "I read with Abu Tammam some of his poems in the year 227 A. H. and I heard him say "I was born in the year 190 A. H. , and added further "I was told by Mukhallad al Mawsili that Abu Tammam died in Mawsil) in the month of Muharram, 232 A. H". Another statement attributed to the son of Abu Tammam is also quoted, in which he says "my father was born in the year 188, and died in the year 231, A. H".‡

• by Jamal al-Din Yousuf. pub. Leiden.

† by Abdul-Qadir-al-Bhaghdadi pub. Cairo.

‡ See also Yaqut. ii, 8.

مغنى النهوة والسلام والكرم هذا فاوف لقاسه على علم

The following verses of this poem is cited by the author of al-Mathal-al Sair (p. 470, first line,-Cairo ed.) who lived in the latter half of the sixth Century of the Hijra

يامن رآى حربا يسرى الى حرم طوبى لمستلم يلقى لمستلم

with the statement (p. 469)

"فقلت لهم هذالبيت ماخوذ من شعر ابى تمام فى قوله ..... بعض الظرفاء فى حجها و ذلك بيت من جملة ابيات حسنة

Here allow me to discuss briefly the death of Abu Tammam, which is assigned to various years. Tabari (iii 1330) and Masudi (vii,151) give it as 228 A. H. which among other dates is also mentioned by Ibn Khallikan (i, 153). But this is improbable. The poet left Baghdad for Mawsil (Mosul), where he died less than two years after his arrival*, after he had presented to the Caliph Wathiq encomiums† on his accession to the Caliphate which took place in the month of Rabi-al Awwal 227 A. H. Besides, as was shown above, he composed a panegyric in praise of Wathiq when the latter was intending to go on a pilgrimage‡ in 231 A. H. For the same reason also, the date 229 A. H. mentioned by Ibn Khallikan (i, 153) seems to be incorrect. Brockelmann (Gesch. Arab. Litt. 1. 85). among other dates, gives the year 236 A. H., but this is impossible, for Muhammed b. Abdul Malik al Zayyat, who died in 233 A. H. wrote an elegy$ on the death of Abu Tammam. Moreover. had the latter been alive after the death of Wathiq. which occurred in the month of Dhul Hijju 232 A. H. . he would certainly have mourned his death in an elegy and presented to Mutamakkil. his successor. a laudatory poem on his accession to the Caliphate, as he had done when Wathiq become Caliph following on Mustasims' death§. It is therefore, practically certain that Abu Tammam died either at the end of 231 A. H. or early in 232 A. H.

---

* Ibn Khallikan i, 152.

† pp. 275, 328. Diwan, pub. Beyrout.

‡ Tabari iii, 1350.

$ Ibn Khallikan i, 153. Anbari 21 . al-Nujam-al-Zahira i, 687. pub. Leiden,

§ Diwan 275.

"that it is wrongly attributed to Abu Tammam ". To another encomium (47 verses) addressed to Hasan b. Wahb beginning:-

قف نؤبن كناس ذاك الغزال ان فيه لمسرحا للمقال

a similar note is prefixed in these MSS; but the Leiden and the British Museum MSS. include the poem in the text and a few of the verses are quoted in the published Diwan*. A complimentary poem (59 verses) in which the poet celebrates the fall of Amorium and the defeat of the Emperor Theophilus in 223. A. H. is cited in the MSS. at the Escorial, the India Office the British Museum and Leiden, It begins thus:

عمر لطغاة لدى الامام قليل و بلؤهم من راحيته طويل

Yet another poem † (38 verses) on a similar subject is found only in the (p. 13) quotes a hemistich and a verse of the poem with the remark

وقال فى قصيدة على الاعادى ميكال وجبريل فاقع الاعراب على الاعادى ذلك فيرجايز لبدا خبر وقال ستين الفا و سبعينا و مثلهما كتائب اخيل تحميها الاراجيل فنون النون من شبعين و هذ لايسوغه محدث –

the authenticity of the Qasida is assured. Here incidentally I should like to mention that a complete well written copy of at-Muwzana in the Khedival library, contains matter additional to that in the published edition of that work.

III I proceed to mention a most important Qasida which, if its authenticitiy is established to proves that Abu Tammam's death, by some authorities assigned to an earlier year did not really occur before 231 A, H. The Qasida (38 verses) in praise of the Caliph al-Wathiq son of Al Mutasim, when the former intended to set out on a pilgrimage in the year 231 A. H. ‡ is given in the text of the Ziadat at Leiden and begins:

---

* pp. 458 -59.

† It begins:

مخيلة الكفر عسورية انقعصت قسرا واجلى عنها العبد تو فيل

‡ Tabari iii, 1350.

more, a MS., unless proved to be correct, cannot be relied upon. In one of the MSS. I found a whole poem of Buhturi ascribed to Abu Tammam. The safest course, and that which I have endeavoured to follow is:

(1) To find out whether the poems are included in the anthologies, or among the poems of contemporary poets such as Buhturi * Dik - al - jinn †;

(2) to ascertain whether the MS. which contains a poem or poems is reliable;

(3) to search for verses of the poems quoted in various authoritative works. By following this method I hope that I have been able to establish the authenticity of many poems. I prepose to add a few examples;-

I In the Kitab-al-Wulat wal - Qudat ‡ (pp. 181 - 183 Kindi cites a few verses from a Qasida composed by Abu Tammam in praise of Abdul - Lah Ibn - Tahir when the latter defeated Ubayd b. al Sari in Egypt in the year 211 A. H. The first verses are:

لعمری لقد کانت بمصر وقیعة اقامت علی قصد الهدی کل مائل
علی الخلق الاقصی و ماکان حوله و ما قدیاه من فضاء و ساحل
لوین جموع ابن السری و خیله شما طیط تتری کالذعام الحوافل
فلما راوا أن لا محیص و انه کفاح الردی فی کل حق و باطل
تو خوا أسان الاریحی ابن طاهر فمن فارس یاتیه طوعا و راجل

I have found the whole Qasida $ in the India Office MS. (Ltoh. 806)

II A Qasida (53 verses) in praise of the Caliph al - Wathiq which begins

مهدی بر بعک منزلا محمودا جم الانیس خرودا و نهودا

is mentioned in the MSS. at Leiden (al-Ziadat) and the Escorial, in the latter with a note " Yousuf b. Sulaiman al-Alam (d. 476 A. H.) says.

---

* d. 284 A. H.

† d. 235 or 236 A. H.

‡ Gibb. Ser

$ There are 29 verses

181) written in 1127 A. H. This I have not as yet been able to consult. All the MSS. mentioned above are of the compendious Commentary by Tibrizi. I have not yet succeeded in finding a MS. of his exhaustive Commentary on the Diwan referred to by Hajji Khalifa *.

In the same Library I found three volumes of the Commentary (adab 571) written by al-Mubarak b. Ahamad b. al-mubarak, in which the author comments alternately on the poems of Abu Tammam and on those of al Mutanabbi, taking them in alphabetical order without regard to subject. He is probably the authorr eferred to by Hajji Khalifat as Abul-Barakat Ibn-al-Mustawfi Mubarak b. Ahmad al-Irbali, (died 637 A. H.), who wrote a Commentary on the Diwan in ten vloumes. These three volumes, bear no date, are fairly correct and contain the poems from the letter Alif to the letter Dal, the last being a satire on Ayyash b. Lahi' a, beginning: عياش يا ذا البخل والتصريد - رسالة التضريق , التنكيد

II. UNPUBLISHED POEMS.

While collating MSS. I found several poems ascribed to Abu Tammam. which have not hitherto been published. A collection of such poems called al Ziadat, transcribed in 1279 A. H., is in the Leiden Library. The volume appears to have at one time been in the possession of Mahmud pasha al-Barudii, the Egyptian scholar, whose name appears in several places in it. It includes about one hundred poems, of varying length, which are not mentioned in the India Office MS. The India Office MS. (Loth 806) contains nearly 130 poems, which are not to be fovnd in the Ziadat.

In establishing the authenticity of a poem too great weight should not be given to the style of composition. An obscure poet in writing poems which he wishes to pass off as those of a more famous contemporary naturally endeavours to follow the style of the latter. It is well known that Hammad al-Rawia and others have interpolated their verses with the Qasidas of Jahiliyya. Further-

* Hajji Khalifa iii, 254.
† Ibid iii, 255.
‡ MS. Arab, 1928.

لاعيش اويتحامى جسمك الوصب فتنجلى بك عن خلصائك الكرب

The second (Adab.M. 79) is without vocals and in many places without the names of the persons to whom the encomiums are addressed. It has 103 folios, is similar to the MSS. in the Escorial, and was written in 1056 A. H. The third (Adab. M. 25), partly vocalised, is incompalete, containing only encomiums المديح . It was written in 1242 A. H. but is not very correct and has 142 foiios. The fourth (Adad 621),written in 1287 A. H. is similar to that in the India Office Library and contains several unpublished peoms. The fifth (Adab (106 is vocalised and annoteted but is incomplete. It contains 299 pages, many of which appear to be latter additions, but the greater part of the MS is probably contemporary with the transcript of the Commentary of Tibrizi in the India Office Library (i - e 624 A. H.)

Turning to the MSS. of the Short Commentary of Tibrizi (d. 502 A. H.) on the Diwan of Abu Tammam, two of these are in the Leiden Library. MS. Arab. 2037, in Maghribi handwritting, is the earlier. It is incomplete and the latter page are of a much latter date then the earliar. The other MS. Arad. 403) is complete but is full of errors. Although without date it was written in comparatively recent times.

The India Office MS. of the Commentary (1144) transcribed in 624 A. H. is more correct than the latter Leiden MS. (403), but the latter contains more explanatory notes than the former. Another not very correct MS. (pp. 393) dated 1312 A. H. is in the Khedival library, which possesses also Volume III of the Commentary (Adab 573) , without date, but both ancient and accurate. It contains 242 pages and begins thus :

قد شرّد الليل هذا الصبح عن افقه و سوّغ الدهر ماقد كان من شرقه

and ends

قال يعزّى محمد بن سعيد بابنه ....

احمد بن سعيد ادخو الاسى فيها ورا الحوّ يوم ظمائه

In the old catalogue of the Library the volume is erroneously ascribed to al -Suli. the Library of the Calcutta Madrasa also possessess a MS.* (folios

* No. XCI, see the catalogue of the Arabic and Persian MSS. in the Library of the Calcutta Madrasa.

Abu Ali-Ismail b. al-Qasim al-Baghdadi Al Qali (d. 356. A. H.)

The MSS, in the Escorial are both the oldest and also the most correct, and a note in the earliest of these states that it was copied from a MS. transcribed from Abu Tammam's autograph originals. In the same Ms. the following passage is written at the end of the volume.

كمل جميع شعر ابى تمام حبيب بن اوس الطائى (من) رواية ابى على اسمعيل بن القاسم البغدادى و ذلك فى الثامن والعشرين من جمادى الآخرة سنة ست و خمسين و خمسمائة والحمد لله على ذلك كثيرا كتبه لنفسه بخط يده على بن محمد بن عيسى تغمدالله به الغفران من كتاب الشيخ الاجل الاستاذ ابو القاسم ابراهيم بن محمد بن ذكريا الزهرى المعروف بابن الاعرابى (توفى فى احدى و اربعين و اربعمائة) المنقوب بخط يده المنقول من القرطيس الذى اعتمليها ابو على اسمعيل بن القاسم البغدادى و ذكر انها بخط يد ابى تمام حبيب بن اوس الطائى.

Two MSS. of the Diwan are in the British Museum. The first Add. 7537 Rich), without date, is the earlier but is incomplete. It contains only the poems of al-Madih. It has vocals and notes, but the latter part is the more recent date than the earlier. The other (Add. 7538 Rich.) is a comparatively modern copy, written in 1048 A. H. without vocals or notes. It is complete and contains many poems which have not been published. The Berlin MS, (bibl. Springer 1135) is complete, vocalised and annotated, but without date, The beginning of this MS. down to folio 47b is of a much latter period than the remainder, it is similar to the older MS. (Add. 7537 Rich) of the British Museum. The Leiden MS. Arab MS. 899) is similiar to the copy (Add. 7538 in the British Museum and contains many unpublished poems. The India Office MS. (Loth 806) is full of errors and without vocals or notes, but it contains a a great number of unpublished poems. It was written in 1088 A. H. The Bodleian (MS. Marsh 593), without date or notes, is somewhat incorrect. The MS, in the Paris library (Arab. MS. 3035) is without notes or vocals, and contains numerous mistakes. It was written in Nastaliq-handwriting in 1234 A. H. There are five MSS. in the Khedival Library at Cairo. The first (Adab 834) is incomplete but is vocalised and the poems are arranged alphabetically It was written by al- Muzaffar b. Tamim with the left hand in 606 A. H. It is similar to the MS. in the Berlin library, but has only 153 folios, and begins;

A corrected edition of the text of the poems appeared, therefore, to be called for. After collating such MSS. of the Diwan as are extent in European libraries as well as those at Cairo, I have prepared a revised text, which with the addition of explanatory notes, will, I hope, be published shortly. In the course of my researches, I have discovered many Qasidas of which the authenticity has been established, which have not hitherto appeared in print, and the edition I hvae prepaired will be divided into two parts, Part 1 being a revised text of the Diwan, Part 2 the Ziadat.

I propose now to describe briefly the MSS. I have consulted and to give some account of the hitherto unpublished Qasidas.

1. THE MSS. OF THE DIWAN OF ABU TAMMAM.

Up to the present time I have read the MSS. of the Diwan in the Bodleian, the British Museum, the India Office, the Khedival library, Lieden, the Escorial, Paris and Berlin. I have not so for been able to consult the MSS. of the Diwan in the Asiatic Museum at Petrograde, or in the library of the Asiatic Society of Bengal, while other MSS. are probably to be found in other libraries or in private ownership. There are also many MSS. of the short commentary of Tibrizi on the Diwan in the Leiden, India Office, and the Khedival libraries. The three earliest MSS. of the Diwan are in the Escorial Library. The first (Cod. 415),* vocalised but without explanatary notes, was written in 556 A.H. The second (Cod. 291),† vocalised and annotated, was written in 584 A. H. and has in the margins many extracts from the book Dhikra-Habib by al-Maarri. The third (Cod 290), without notes and partly vocalised, was written in 605A.H. All these MSS are in the Maghribi hand-writing. The poems are into as they are in all latter MSS. arranged either alphabetically or by subject. Each of the MSS. begins with the following verse:

عسى وطن يدنوبهم وانعلما وان تعقب الايام فيهم فربما

and ends with a satire of which the first line is

لا سقيت اطلالك الى اثره ولا نقضت عشرتك العاثره

They contain in all only 157 poems, less than one half the number of poems mentioned by al-Suli (d. 335 A. .H), and they are based on the authority of

* Folios 135

† Folios 125

the massacre of the followers of Mazdak by Anushirwan he inserts يوم المصد فيه with ف without explaining what it means*.

(3) On page 322 (7) أسمت is given in place of انسمت by which the meaning is entirely changed.

(4) The name ابن دؤاد is repeatedly given in the headings† as ابن دؤد though from the rhymes‡ it is quite evident that the name should be دؤاد

(5) In his note he explains § صافوى the river Sangarios, as the name of person in the verse $

جهمية الا و صاف الا انهم قد لقبوها جوهر الا اذياء

جهمية الا و صاف is explained as meaning 'dark of attributes, though the word clearly refers to the doctrine of the jahmites concerning the Divine attributes. Masudi (VII 166) says that 'al Suli (d. 335 A. H.) in his biography of Abu Tammam quotes the verse الخ جهمية الا و صاف in praise of wine as an example of the poet's scholarship.

(6) In one of the poems he inserts the two following ‖ verses which are not by Abu Tammam but by Buhturi¦:

يُخفى الزجاجة لونها فكأنّها في الكفّ قائمةٌ بغير اناء

ولها نسيم كالرياض تنفست في اوجه الارواح بالانداء (والانداء)

while sometimes without any grounds he suggests a change in the heading of the name of the person to whom the encomium is addressed as for example on page III he suggests that the Qasida composed in praise of al Mamun should more appropriately be addressed to the Caliph al-Mutasim.

---

* See Diwan 326 8, note), edited by Khayyat.

† Diwan, 1, 75 etc.

‡ Diwan, 79 (6) 83 (7).

§ Diwan, 219 (9, note).

$ Diwan, 3 (12, note).

‖ Diwan, 3-4

¦ Diwan, of Buhturi 1, 4 (2-3).

A SHORT DESCRIPTION OF THE MSS. OF THE DIWAN OF ABU TAMMAM

AND A BRIEF CRITICAL ENQUIRY INTO THE AUTHENTICITY OF HIS UNPUBLISHED POEMS.

BY

Dr. A. HAQ

Prof. of Arabic,

Osmania University College.

Hyderabad, Deccan.

Read at the Seventeenth International Congress of Orientalists

Held at Oxford August 1928

THE Diwan of Abu Tammam, the great Abbasid poet was frist published at Cairo in 1292 A. H. In more recent times two editions have been issued at Beyrout, one in 1889 A. D. edited by Shahin-al-Atiya with notes and partial vocalisation, the other in 1905 A. D. by Muhiyy'-l-Din-al-Khayyat, also with notes and partial vocalisation. In the later of these two editions which omits a few of the satires on the ground of impropriety, some of the errors of the earlier edition have been corrected but, though to some extent an improvement, the latter edition still contains a large number of mistakes some of which detract largely from the value of the work while the editor omits to add explanatory notes to many of the more difficult verses and on others offers suggestions which are generally useless, and frequently even misleading as may be seen from the appended examples:-

(1) On page 326 (8) he gives the word خزاباذ the name of an ancestor* of Afshin as خزاباذ, and is at a loss to understand the meaning of the verse.

(2) On page 323 (1) instead of يوم المصدقية or يوم المزدكية which refers to

* See Tabari ii 1613.

article many of them mainly looking upon the hight of their university-class or the publication of their second-rate work in prose and poetry in a surreptitious book-form (which perhaps imparts to them and their companians the idea of their being an author!) they consider themselves fit for the work of editorship which in fact is a fallacious idea. Exaggeration of second-rate work, self-flattery and self-confidence in being a great literary figure is a common feature of a great part of the literary world of India. We often extremely regret at the appalling fact that bad and incorrect poetry is abundantly produced and proudly published in various magazines with even such glaring titles as "Khuda-e-sakhun", "Lisan-ul-qaum", 'Mujtahid-ush-shu'ara" and so forth, given to the authors from 'unknown academies', also ordinay works of fiction and literature are given the importance of unique or highly academical productions forming the hall-marks of genius. Every-where we find short-story writers dramatists, poets, critics, and research workers with all sorts of lavish titles given to them by poor advocates, Almost every essay every poem, story or drama, every simple book is applauded in the superlative degree. But, through a fairly stable policy of our magazine we are trying to dispel such an atmosphere in Hyderabad where we are glad to find it is not so dark as in Northern India, and for that we want editors who should be the advocates of such literary dignity and insight.

In the end therefore we hope that the future editors of the magazine taking a fair advantage of some of our changes in type and press, and our efforts to maintain its policy, standard, and prestige shall not only follow in our steps but also shall conducively try to make improvemets which would push the magazine into a grander future and ever-increasing fame advantageous to both themselves and the University to which they belong.

flourishing in the markets of literature, the flatterings and commendations showered with exaggeration on second-rate writers, the self-appludaing tone of the editorials like theatrical advertisements, lack of weighty material, loose and ordinary disser tations, incorrect and common-place poetry and all sorts of general disorder forming a major part of our Indian magazines (Urdu in particular), degrade their literary value, and so hinder them from reaching the hands and hearts of emminent men-of-letters seriously devoted to Art and Letters. We think our readers will shares our sentiments in noting, that despite a vast productuion of various magazines in India there have always been wanting journals of high and fine literary standards, forming mediums of instruction as well as literaray publications and fairly satisfying the needs of learned men —authors and contributors in particular, Also they do not adequately represent the various aspects of Arts and Sciences. We are glad to note that as far as our policy is concerned, we have tried, in the spirit of students, to represent academic literature produced from our University and have as far possible endeavoured to avoid all such common-places features as we have declared common to many Indian journals.

Just to inform our college friends we would like to say that such a position of our magazine demands from our editors (1) sincerety of purpose (2) honesty, keeness and unselfiishness of work (3) strict guardianship of its prestige and policy (4) vastness and depth of literary insight and knowledge. Without these we do not feel assured of our magazine holding its name and prestige in future.

That our magazine has a high standard as declared, by our college friends, is a fact, and such a standard has been mostly entertaining selected articles only from able graduates, hard working students of M. A., M. Sc. and other classes & deligent fourth-year students, which sometimes are considered as memorable works of literature. But to the majority of our college-students this feature has always been a discouraging factor. Firstly little acquainted with the method of research, and being weak in writing solid essays coming up to the standard of their own classes, many of them never attended to the benefit of writing, within their course of the year, at least one well-worked article for the magazine, which would have not only helped the cause of the journal but also would have given them practice to answer their examination papers in an able and satifactory manner. So without first attempting to become a writer of even one single

we can declare that, despite the regrettable and to a great extent erronous and general ill-feeling prevailing in Hyderabad against the English of the Osmania University students which some have secretly cherished, and some have been honest enough to declare it open, none perhaps except the highly prejudiced could deny the fact that the same university college, with its poor knowledge of English, has been running a paper in that language, which with regard to its general standard stands aloof in almost the whole group of journals produced from other Indian universities (which are very few) and to the materials contained, has produced some of the best original and reaserch articles fairly competing with those published in great and leading English magazines of India. This has never been valued and even reflected upon. We still find it necessary to defend our cause of English. Considering the Urdu language as the medium and the first language of our university and the English as the second, we are in a position to think, and think rightly, that with our definite resolve to improve and disseminate our mother tongue, we have nothing more to do than to read and write it correctly according to our immediate necessities, and which we think we satisfactorily do. We do not aspire or rather we do refute the idea to become a perfect Anglo-Indian, with a blind sacrifice of originality, patriotism and culture, and fortunately however, we are conscious of an evident but fairly neglected fact that despite becoming an eminent scholar of English, despite writing up-to-date and idiomatic English with perfect felicity, the very first sentence and idea of the Anglo-Indian writers speak of their being singularly foreign to the style and thought of an Englishman — nay they lack the charm, naturality and the homely phraseology of the original. Had they been fully conscious of it, and attempted to write in their own mother-tongue, they would have certainly relieved themselves of such an inevitable or rather unsurmountable short-coming. Secondly we regret to find that a slow and budding spirit of originality imbibed through the policy of instruction in ones mother tongne adopted by our University, and which being a satisfactory attainment manifested through various literary activities of our university students has been neglected and overlooked.

To revert to our subject, the Osmania Magazine, fortunately having a purely literary motive which very few journals of India have, is safe on its economics side, a feature which often remains a threatning menace to most of the literary magazines of India. The business-like publication depending upon literary trade and its

other parts of India an editor is often esteemed as a personality and specially at places where there is a high awakening and love of knowledge ; also being up-held by influential literary figures, he has great chances of competition and progress in the world of letters. But the circumstances at Hyderabad appear to be exactly the contrary, and perhaps nothing can be more discouraging for an honorary-working editor than a deliberate misunderstanding and devaluation of his efforts specially by those of whom he is a representative.

So much for the general environment of the magazine and now to the magazine itself. Being keenly interested in its stormy present as well as its future, we are induced to say something about its publicaton. It is, as all of us know, a bilingual paper. with a sane and set policy faithfully followed from the beginning to the present day, and without any ecnomical or any other personal motive, is purely devoted to Arts and Sciences. We consider this to be a sort of characterestic feature and think it essentially right to maintain it as far as possible. It is this special feature that urgues a necessity for a careful selection of the editors -- editors who comprehending the nature and quality of their work should firstly be fit and competent enough for editorship and secondly should be keen, honest, and deligent in their work. A few days back one of our College students interested in the magazine seriously argued with us for printing the manager's name on the title page, although we had convinced him of the fact that our Board had passed it after careful consideration, and that as a rule, the title page being the forehead of a journal should, due to its literary but not business-like feature, only carry the name of the editors; but he seemed to have never been satisfied. So we were amused to find out some of the future improvements that were likely to begin from the very first page of the Osmania Magazine!

We have experienced that a close relation of the English and the Urdu sections affecting each other both in literary and practical proceedings, creates a sort of insalutary competition, of course first started by those who are prejudiced and have a little underhand policy, (which as a rule should never be had), and such a competition cannot but mar the general harmony. The English section often remains handicapped specially when it has only one editor whereas the Urdu section has a majority of two. We are not in a position to recognize the elemination of sub-editors. Among several encumbrances raised by it three are the most important (1) The inablity to get trained hands which are indis-

other parts of India an editor is often esteemed as a personality and specially at places where there is a high awakening and love of knowledge ; also being up-held by influential literary figures, he has great chances of competition and progress in the world of letters. But the circumstances at Hyderabad appear to be exactly the contrary, and perhaps nothing can be more discouraging for an honorary-working editor than a deliberate misunderstanding and devaluation of his efforts specially by those of whom he is a representative.

So much for the general environment of the magazine and now to the magazine itself. Being keenly interested in its stormy present as well as its future, we are induced to say something about its publicaton. it is, as all of us know, a bilingual paper with a sane and set policy faithfully followed from the beginning to the present day, and without any ecnomical or any other personal motive, is purely devoted to Arts and Sciences. We consider this to be a sort of characteristic feature and think it essentially right to maintain it as far as possible. It is this special feature that urgues a necessity for a careful selection of the editors — editors who comprehending the nature and quality of their work should firstly be fit and competent enough for editorship and secondly should be keen, honest, and deligent in their work. A few days back one of our College students interested in the magazine seriously argued with us for printing the manager's name on the title page, although we had convinced him of the fact that our Board had passed it after careful consideration, and that as a rule, the title page being the forehead of a journal should, due to its literary but not business-like feature, only carry the name of the editors; but he seemed to have never been satisfied. So we were amused to find out some of the future improvements that were likely to begin from the very first page of the Osmania Magazine!

We have experienced that a close relation of the English and the Urdu sections affecting each other both in literary and practical proceedings, creates a sort of insalutary competition, of course first started by those who are prejudiced and have a little underhand policy, (which as a rule should never be had), and such a competition cannot but mar the general harmony. The English section often remains handicapped specially when it has only one editor whereas the Urdu section has a majority of two. We are not in a position to recognize the elemination of sub-editors. Among several encumbrances raised by it three are the most important (1) The inablity to get trained hands which are indis-

ment of its own, has formed itself into a seperate and a higher body hich cannot naturally remain dependent to a body inferior to it. This special feature demands a revision of the regulations relating to the inter-relations of the magazine and the Union, which as a rule cannot remain rigid for all times.

Another arguement is more practical in nature, and that is the right of selecting the editors—nay even the manager. It can be undeniably declared that the Union cannnot fully comprehend the practical nature and work of an editor or the manager more than the Advisory Board, since the latter is directly in touch and acquainted with all their essential activitives. Moreover the Board cannot be distrusted or comparatively held inferior to the Union in recommending or selecting the editors, conducive to the interest of the magazine. It is obviously an absurd idea. Since the said Board, without invading the rights of the editors also offer their valueable help which indirectly goes to enhance its merits, and sanction the sole liberty of editing the paper to the Editorial Staff, we have no ground to say that the paper does not belong to the students. For this it is not entirely necessary, as the Union erronously thinks, that the editors should be selected by a representative body of the students only. The magazine is a part of educative training, and to deny the sincere help so generouly offered to us by our superiors is what we should call sheer indiscretion. However, we are led to state that the magazine and its staff should not be prepared to comply with the above suggestion and the College students, considering the immense benefit derived by it should not hasten towards cherishing causeless suspicion for or against the journal which is serving as their medium of instruction and is a representative and a developer of their literary attainments.

Now we turn to a few other features of the magazine work. It has been a matter of serious regret for us to note that the editors, often being selected students of the University, and the services put forward by them to run a paper worthily held in public opinon have never been fully recognised within the College precincts (we here leave to discuss the features of general recognition in and outside Hyderabad), and so the magazine has never been understood other than a field of secluded authority, or a paper of a "high standard" made so only for the manifestation of the editor's self-made attainments. Few things can be more blind. Despite the generality of such a mentality there have been serious efforts to emphasise it the more. We have reason to believe that in

Both the English and the Urdu Sections had to struggle very hard for a conducive settlement of the press. The English section was being printed at the Chandrakanth press, Gowliguda, and was being well printed indeed, but we are sorry to say, that since the publication of the first issue it tried to put very unpleasant impediments in our way, which compelled us to withdraw all our well-standing relations with it and look out for another convenient one. We regret that a good press, with it's beautiful German type, clean printing and a satisfactory equipment, which if run by a more deligent and enlightened staff would be the best press for the printing of such literary magazines as ours, and books on science and literature under production day by day, has so relentlessly broken away from us. However, we had to print the already late issue of our magazine Vol: III, No. II in the Bulletin Press Secundrabad at the expense of much physical, and intellectual labour as well as money. There was also a slight injury to its reputation, the last being the sole result of the inevitable haste in editing and printing the paper. At present we have arranged to print this at the Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, and we hope that we shall be able to have facility of its publication to time and to standard in future — future wherein we shall very probably be one of the unrelated onlookers.

Now, to the unpleasent tension of the magazine with the College Union. Refraining ourselves from entering into details unfit for publication, we are here inclined to discuss some of its general features.

We should be glad to declare that this has been done with a view to clarify some of the underlying misunderstandings which have affected the magazine in general. The main arguement upon which the Union seems to base its contention is probably that since the magazine has been started by the Union it should be "directly under the Union's control". Out of the many ways in which this can be argued, we are induced to say in one way at least, that such a direct control does never mean an encroachment upon the rights of the Editorial staff or the Advisory-Board, although the formation of both of them, constituting a body evidently superior and practically more useful and more recognised than the Union itself, has been the result of its past endeavours. Moreover the magazine, out of its nature of literary work based upon more acknowledged grounds, out of the able control of an eminent Advisory Board, superior to the Cabinet of the Union, has outrun its limits and having created a serious eslablish-

EDITORIAL

In the editorial of our magazine Vol: III, No. I, we had spoken of the new-year editorials always begining with hopes and fears. The present one being probably the last of our regime, is full of fears just as the first one was void of hopes. All of us know that hopes are seldom realised but fears never end. So it was with us during our regime this year.

We had started to edit this paper in a serious state of turbulence — a sort of chaos that had almost endangered the future publication of this magazine. Considering the nature of that chaos, and our efforts to overcome it, we are in a position to declare that instead of editing the paper — the true field of our activity — we had to work for entirely off-hand matters — matters relating to the existance of the magazine rather than to the life and improvement of its soul and self. One experienced in such affairs can probably realize that our embarrassment was more encumbrous than even the initial effort to start this paper, for the former pertained towards sustaining a worthy life and the honour sequenting it which is comparatively a more difficult task, while the latter was merely to bring life into existance. It is a queer sort of arguement; however, we side our own logic because we feel the entanglement and nature of the circumstances of that logic to be more weighty and serious.

Hopes are generally the outcome of peace and prosperity, and their realization, a consequence of odds in favour, but we never had this within our regime, so we could speak of having no hopes at all. Among many of such hope-killing vicissitudes so to say, two are the most important and need an explicit mentioning. (1) The unforeseen difficulties of the press (2) The unpleasant conflict of our Editorial Board with the College Union. But for the importance of that struggle affecting the present and the future of our magazine, we could have never mentioned the latter.

11. Three Short Essays
(A). A Manx Poet 241
LELAND. J. BERRY

(B) Maqbara of Rabe'a Daurani 249
SYED NURUL MOHTEDA, II year

(C) Contemplation is the poetry of Life 253
M. ZAHIRUDDIN AHMED

12. Some Characterestics of Modern Literature 256
ALFRED NOYES

13. Zahir-e-Faryab 277
JA'FER HUSAIN

14. Bidar the Historic City 287
Md. ZAHIRUDDIN, IV year.

15. History week in Hyberabad 312
... ...

16. The Muses Corner 316
... ...

CONTENTS

—*——*—

Vol: III. — Nos: 3&4.

PAGE NO.

1. Editorial 141
   Editor.

2. The Diwan of Abu Tammam 149
   Dr. ABDUL HAQ. Prof. of Arabic Os. Un. College

3. Adventures of Rose 159
   CYRIL MODAK

4. The University Career 163
   M. A. QAYYUM KHAN (M. A.) Editor

5. Shakespear's Twentieth Century Criticism ... ...
   ITRAT HUSAIN ZUBAIRI (Old Boy)

6. Gandoling on the Tigris 188
   S. AHMADULLA KHAN, III year.

7. India and the Imperial Preference 198
   A. ABDUL AZIZ. M. A. 'Alig'. (Old Boy)

8. The Jhatka 207
   B. N. JOSHI (OLD BOY)

9. Convocation Address 212
   NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR

10. Tulsidas 226
    B. N. CHOBE IV year